ہم فکری سے ہم راہی تک
افکار : سید جہانزیب عابدی
جلد ششم

اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّد وعَجِّل فَرَجَهُم

انتساب

اس روشنی کے نام جو ہمارے تاریک ترین اوقات میں رہنمائی کرتی ہے،

امام زمانہؑ کے لیے، انسانوں کے نجات دہندہ، خدا کی نشانی حضرت بقیۃ اللہ،

اور اپنے والدین کے لیے، جو میرے وجود کی بنیاد ہیں، ظاہری اور فکری،

سید سرکار حیدر عابدی (مرحوم) اور سیدہ رفعت عابدی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہا)

آپ کی محبت اور حکمت میرے رہنما ستارے رہے ہیں اور

ان سرپرستوں اور روحانی مربیوں کے نام جنہوں نے میر ا راستہ روشن کیا، منزل کو واضح کیا۔۔۔

آیت اللہ سید حسین مرتضیٰ نقوی (حفظ اللہ تعالیٰ عنہ) اور ان کے اہل خانہ، اور

حجۃ الاسلام والمسلمین سید غلام عباس رضوی (حسین آغا) حفظ اللہ تعالیٰ عنہ

نیز آیت اللہ شیخ شبیر حسن میثمی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید ظفر مہدی نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین سید علی سلمان نقوی، حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ نور عالم، دامت توفیقاتہم

آپ حضرات کی تعلیمات نے زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے اور عقل و دانش سے فائدہ اٹھانے کے طریق واضح کیے،

میری پیاری بیوی سیدہ مہوش زہرہ، جن کی زحمتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کیلئے ایک مقالہ لکھنا پڑے،

اور میرے نوجوان بیٹے،

سید محمد حسین مہدی، مستقبل کی روشن کرنوں میں سے ایک کرن،
آپ سب کی غیر متزلزل حمایت اور پشت پناہی میرے سفر کو تیز کرتی ہے۔
میرے پورے خاندان کے لیے، لامتناہی طاقت اور محبت کا ذریعہ،
برادران حجۃ الاسلام سید شعیب عابدی، عدیل عابدی، مصطفیٰ عابدی،
بہنیں اسرا اور فرحین، اور میرے پیارے سسرالی، ماں اور باپ اور بہنیں،
اے خدا تو میرے وجود کی جڑ ہے، زندگی کے طوفانوں میں مجھے مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے،
میرے ساتھ چلنے والے دوستوں اور خیر خواہوں کے نام،
آپ کی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میرے لیے باعث برکت ہے۔
عاجزی کے ساتھ، میں "ہم فکری سے ہم راہی تک" کتاب آپ سب کے نام کرتا ہوں۔
یہ کتاب یہ علمی و فکری لگن آپ میں سے ہر ایک کے لیے میری شکر گزاری اور پیار کا ایک چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ آپ سب میرے آسمان میں بالائی برج ہیں، زندگی کے سفر میں میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ آپ کی محبت، حکمت اور تعاون اس کتاب کے صفحات میں بنُے ہوئے ہیں اور میں اس کام کی تشکیل میں آپ کے کردار کے لیے ہمیشہ مقروض ہوں۔
دل کی گہرائیوں سے شکریہ اور اٹوٹ محبت کے ساتھ!

سید جہانزیب عابدی

فہرست

کچھ کتاب کے بارے میں

الحمد للہ، جو ہمیں عقل اور فہم کے اس راستے پر لے کر آیا ہے، جو ہمیں اسلامی اصولوں اور معاشرتی اصولوں کی روشنی میں زندگی کی راہنمائی کرتے ہیں۔ اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کا مقصد، ہمارے دین کے ثبوتی دلائل کو فراہم کرنا ہے۔

یہ کتاب پندرہ، بیس سال کی فکری محنت اور مشاہدے اور اصلاح کے عمل کا نتیجہ ہے۔ یہ مضامین زندگی کے متفرق زندہ موضوعات پر مشتمل ہیں جو اس عرصے میں زیر قلم آئے، یہ ایک خود اونچ پنچ کا سفر ہے، جس میں میری زندگی کے مختلف مراحل کا تجربہ شامل ہے، جس نے میری فہم اور تجدید کو اضافی روشنی دی ہے۔

اس کتاب میں اسلامی اصولوں کو بنیاد بنا کر ایک خالص فکری کاوش پیش کی گئی ہے۔ اس سے اختلاف کا حق اختلاف کی اہمیت اور احترام کے باعث روا ہے ہر ایک کے پاس خود کے خیالات اور رائے کا حق ہوتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو پیش کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں قرآن، حدیث، تاریخ، علمیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات، ابلاغیات، اور دیگر سماجی علوم کی موٹی موٹی باتوں کو متعدد مواقع پر پیش کیا گیا ہے، تاکہ ہم اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھ سکیں اور ان کو اپنی زندگی میں عمل میں لا سکیں۔
یہ کتاب خصوصی طور پر نوجوانوں کیلئے ہے، تاکہ وہ اس میں سے کام کی باتیں انتخاب کریں اور اپنے فکری جولان کو بڑھا سکیں۔ اس کتاب کی تیاری کے اسباب نے میری زندگی کو تبدیل کیا ہے، اور میری امید ہے کہ یہ اپنی مخصوص اہمیت کے ساتھ آپ کی زندگی کو بھی تبدیل کرے گی۔

کتاب میں جس جگہ مضامین دوسرے لکھاریوں سے لے کر اضافہ جات کیے ہیں یا ترجمہ کیے ہیں وہ مضمون میں عنوان کے ساتھ مشخص کر دیئے گئے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کی امید کے ساتھ، میں آپ کو اسلامی اصولوں پر مبنی زندگی کے فکری اور علمی مسائل کو حل کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ اس کتاب کو پڑھ کر، آپ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کا راستہ تلاش کر سکیں گے اور اپنے اصولوں کو مضبوط کرنے میں کافی کامیاب رہیں گے۔ ان شاء اللہ

عابدی

zaib.abidi.pk@gmail.com

ابراھیمؑ و اسماعیلؑ, علیؑ و حُسینؑ

محرم کی عزاداری اور ذوالحجہ کے ایامِ حج و قربانی اور روز غدیر محض مذہبی رسومات نہیں بلکہ تاریخِ اسلام میں یہ تینوں ایام اسلامی سیاست، اجتماعی شعور، اور حکومت الٰہی کے قیام کے اہم ترین شعائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تینوں مظاہر میں ایک ایسی معنوی گہرائی اور انقلابی روح کارفرما ہے جو امتِ مسلمہ کو سست روی، غلامی، اور باطل قوتوں کے غلبے سے نکال کر اللہ کی حاکمیت اور عدلِ الٰہی کے قیام کی طرف دعوت دیتی ہے۔

ذوالحجہ میں حج ایک ایسا عظیم اجتماع ہے جو ہر سال دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو وحدت، شعور، اور اطاعتِ الٰہی کے پیغام پر اکٹھا کرتا ہے۔ حج دراصل اسلام کے سیاسی و اجتماعی پہلو کو مجسم کرتا ہے جہاں رنگ، نسل، زبان، اور جغرافیہ کی تفریق مٹ جاتی ہے اور سب ایک ملت واحدہ کی صورت میں خدائے واحد کے سامنے سراپا بندگی بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ طوافِ کعبہ صرف ایک روحانی عمل نہیں بلکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام دائروں کو اللہ کی مرکزیت کے گرد گھمائے۔ سعی بین صفاو مروہ صبر و جستجو اور قربانی حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے جذبہ تسلیم و رضا کا اظہار ہے، جو کسی فردی عبادت تک محدود نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کا درس دیتی ہے، چاہے وہ مال کی ہو، جان کی ہو یا اقتدار و مفاد کی۔ حج کی رسومات بظاہر ظاہری اعمال پر

مشتمل نظر آتی ہیں، مگر ان کے اندر ایک عمیق روحانی، فکری اور انقلابی پیغام پوشیدہ ہے۔ احرام باندھنا دنیاوی وابستگیوں، طبقاتی فرق، اور ظاہری امتیازات سے نکل کر خالص عبدِ خدا بننے کا اعلان ہے۔ یہ اعلان ہے کہ بندہ اب صرف اللہ کا ہے، نہ کسی قوم، نہ کسی نسل، نہ کسی اقتدار کا نمائندہ۔ عرفات میں وقوف اللہ کی بارگاہ میں کامل عاجزی، اعترافِ بندگی، اور امت کے اجتماعی شعور کی تجدید ہے۔ مزدلفہ میں جمع ہونا خدا کی یاد میں ایک رات گزارنا، درحقیقت اس بات کا اظہار ہے کہ سچے مومن کی راتیں بھی اللہ کے ذکر سے خالی نہیں ہوتیں۔ منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارنا، باطل قوتوں اور نفسِ امارہ کے خلاف عملی بغاوت کا اظہار ہے۔ قربانی دینا محض جانور ذبح کرنا نہیں بلکہ اس بات کی علامت ہے کہ بندہ خدا کے حکم کے لیے اپنی جان، مال، خواہشات، اور سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ ہے۔ طوافِ کعبہ مرکزیتِ توحید کا عملی اعلان ہے کہ ہماری زندگی کا ہر دائرہ اللہ کے گرد گھومے گا۔ صفاو مروہ کی سعی ایک ماں کے صبر، امید، اور جستجو کی یادگار ہے، جو امت کو سکھاتی ہے کہ خدا کی راہ میں کبھی مایوس نہ ہو۔ ان تمام رسومات میں اللہ کی حاکمیت، انسان کی بندگی، اور امت کی وحدت کا گہرا پیغام پوشیدہ ہے جو اگر شعور کے ساتھ ادا کیا جائے تو حج ایک زندہ، متحرک اور انقلابی عبادت بن جاتی ہے۔

اسی طرح محرم بالخصوص عاشورہ کا دن، جسے عام طور پر سوگ و گریہ کے ایّام کے طور پر سمجھا جاتا ہے، درحقیقت ظلم کے خلاف قیام، حق کے لیے قربانی، اور باطل حکومت کے انکار کا دن ہے۔ امام حسین علیہ السلام کا قیام کربلا کسی شخصی اقتدار یا خاندان کے مفاد کے

لیے نہیں تھا بلکہ یہ ایک سیاسی اور الٰہی جدوجہد تھی تا کہ دینِ محمدیؐ کو تحریف، ملوکیت، اور جاہلیت ثانیہ سے بچایا جا سکے۔ امام حسینؑ نے جس قربانی کا مظاہرہ کیا وہ محض شہادت نہیں بلکہ ایک مکمل نظریہ اور پروگرام ہے، جو امام علیؑ کے سیاسی فلسفے اور حکومتِ عدل کے خواب کی عملی تکمیل کی راہ دکھاتا ہے۔

کربلا کی جنگ، ایک ایسی سیاسی بغاوت تھی جو وقت کے فاسق، جابر اور طاغوتی نظام کے خلاف ایک الٰہی حکومت کے قیام کی بنیاد رکھ رہی تھی۔ امام حسینؑ نے مدینہ سے نکلنے سے لے کر کربلا کے میدان تک مسلسل یہی پیغام دیا کہ ان کا قیام فقط اصلاحِ امت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اور اللہ و رسولؐ کی اصل سنت کو زندہ کرنے کے لیے ہے۔ یہ تمام نعرے اور مقاصد کسی روحانی مشق یا اخلاقی تحریک تک محدود نہیں بلکہ عملی سیاست، حکومت، اور نظامِ عدل کے قیام کا علَم بلند کرنے کی علامتیں ہیں۔ عزاداری کی رسومات جیسے ماتم، نوحہ، جلوس، تعزیہ، اور مجالس محض جذباتی اظہارِ غم نہیں بلکہ ایک زندہ سیاسی شعور کی علامتیں ہیں۔ مجلس میں امام حسینؑ کے قیام کا تذکرہ امت کو ظلم کے خلاف بیدار کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ نوحہ اور ماتم، مظلوم کے ساتھ عملی ہمدردی کا اعلان اور ظالم کے خلاف اعلانِ براءت ہوتے ہیں۔ جلوس سڑکوں پر نکل کر یہ پیغام دیتا ہے کہ حسینؑ کا مشن محصور نہیں بلکہ عوامی اور علنی تھا، جو باطل حکومت کو للکارنے کا ایک مسلسل عمل ہے۔ تعزیہ یا علم، اہلِ بیتؑ کی قیادت اور عدل پر مبنی نظام کی نمائندگی کرتے ہیں، جنہیں ہاتھوں میں اٹھا کر عزادار گویا اس نظام کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ تمام رسومات دراصل اس نظریے کا

اظہار ہیں کہ اگر کہیں بھی باطل نظام مسلط ہو جائے تو حسینی پیروکار خاموش نہیں بیٹھیں گے بلکہ ہر دور میں یزیدِ وقت کے خلاف قیام کریں گے، چاہے اس کے لیے جان، مال یا وقت کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ عزاداری اس طرح ایک دائمی سیاسی احتجاج، شعور کی بیداری، اور اسلامی حکومت کے اصولوں کی یاد دہانی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

لہٰذا اگر ایک طرف حج کا اجتماع امت کو اللہ کی حاکمیت اور امت واحدہ کی اجتماعی طاقت کی یاد دہانی کراتا ہے تو دوسری طرف محرم کا پیغام اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ اگر امت میں عدلِ الٰہی مفقود ہو جائے، اگر حکمرانی اللہ کے بجائے طاغوت کے ہاتھوں میں آ جائے، تو پھر ہر مؤمن پر واجب ہے کہ وہ امام حسینؑ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس باطل نظام کے خلاف قیام کرے، چاہے اس کے لیے قربانی کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔

دونوں شعائر دراصل ایک ہی مقصد کے دو مظاہر ہیں۔ ایک امت کی ترتیب اور اجتماعیت کی صورت میں حکمتِ الٰہی کا اظہار ہے، اور دوسرا اس اجتماعیت کی روح میں اگر فساد داخل ہو جائے تو اس کی تطہیر کے لیے انقلابی اقدام کا پیغام۔ حج امت کی وحدت کو منظم کرتا ہے اور محرم اس وحدت کو حق کے راستے پر باقی رکھنے کے لیے بیداری کی چنگاری روشن کرتا ہے۔ حج سے ہم اسلامی حکومت کی بنیادیں سیکھتے ہیں اور محرم سے ہم اسے بچانے اور قربانی دینے کا ہنر۔

یہ دونوں دینی شعائر اگر صرف رسومات کی صورت میں انجام دیے جائیں اور ان کے انقلابی اور سیاسی مضامین سے غفلت برتی جائے تو امت فقط ظاہر پرست، بے شعور اور بے مقصد ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن اگر ان شعائر کو قرآن، سنت اور سیرتِ معصومینؑ کی روشنی میں سمجھا جائے تو یہ شعورِ دینی، غیرتِ ایمانی، اور قیامِ عدل کی ایسی تحریک بن سکتے ہیں جو امت کو ظالموں کے پنجوں سے نکال کر خالصتاً اللہ کی حکومت کے زیرِ سایہ لے آئے۔

پس، محرم کی عزاداری اور ذوالحجہ کی قربانی اگر ایک شعوری، ایمانی اور سیاسی نقطۂ نظر سے ادا کی جائیں تو یہ امت مسلمہ کو نہ صرف اس کی اصل شناخت دلاتی ہیں بلکہ اسے اس کی عالمی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں کہ وہ ظالموں کے خلاف قیام کرے، دین کے نام پر بنائے گئے طاغوتی نظاموں کو رد کرے، اور زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنے کے لیے ہر ممکن قربانی دے۔ یہی دراصل حج ابراہیمیؑ اور حسینیت کا مشترکہ پیغام ہے: "اللہ کے لیے جیو، اللہ کے لیے مرو، اور اللہ کی حکومت کے قیام کے لیے قربانی سے نہ گھبراؤ۔"

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حُسینؑ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

قربانیِ اسماعیلؑ اور قربانیِ حسینؑ دو عظیم الٰہی مظاہر ہیں جن میں ایک توحید کی راہ میں باپ اور بیٹے کی تسلیم و رضا کا نمونہ ہے اور دوسرا باطل کے خلاف کامل صداقت، عزیمت اور فدیہ اسلام کی بلند ترین مثال۔ ان دونوں قربانیوں کے درمیان جو تاریخی اور فکری پُل ہے، وہ غدیر کی تاریخ اور اس کی حکمت سے جڑتا ہے۔ قربانیِ اسماعیلؑ اطاعتِ محض کا اعلان تھی،

جس نے بتایا کہ اللہ کی راہ میں رشتہ، خون، خواہش اور جذبات سب قربان کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن اللہ نے اس قربانی کو ایک سنتِ جاریہ میں تبدیل کر کے حج کا حصہ بنادیا تا کہ امت ہر سال اس اطاعت و تسلیم کا سبق یاد کرے۔

اسی طرح امام حسینؑ کی قربانی، اسماعیلؑ کی روحانی وارثت کا اوجِ کمال تھی، جس نے ظلم کے خلاف قربانی کی معراج دکھائی۔ مگر ان دونوں کے درمیان غدیر کا واقعہ ایک ایسا نظریاتی سنگِ میل ہے جو اس قربانی کو راستہ، منزل اور قیادت عطا کرتا ہے۔ غدیر میں نبی اکرمؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب امت کو قیادت کے باب میں گمراہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ جس طرح دینِ خدا کا نزول وحی کے ذریعے ہوا، اسی طرح اس دین کی حفاظت اور عملی تطبیق بھی اللہ کے منتخب ولی کے ذریعے ممکن ہے۔ غدیر کا اعلان صرف ایک روحانی مقامِ ولایت کا تعارف نہیں بلکہ حکومتِ الٰہی کے تسلسل اور نظامِ امامت کی بنیاد ہے۔

اگر قربانیِ اسماعیلؑ اطاعت کا سبق دیتی ہے اور قربانیِ حسینؑ ظلم کے خلاف قیام کا، تو غدیر ان دونوں کو ایک نظریہ اور نظام میں مربوط کرتی ہے۔ غدیر بتاتی ہے کہ دین صرف عبادات یا قربانیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے، جس کی قیادت الٰہی نمائندوں کے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے۔ اسی قیادت کے انکار نے کربلا برپا کی، اور اسی قیادت کے ساتھ وفاداری نے حسینؑ کو وارثِ ابراہیمؑ بنایا۔

غدیر کی حکمت یہ ہے کہ امت اپنی منزلِ قربانی، اپنی جنگِ حق و باطل، اور اپنی اجتماعی نجات کے سفر میں اکیلی نہ ہو، بلکہ وہ ایک الٰہی امام کی سرپرستی میں اس راہ پر گامزن ہو۔ اس لیے اسماعیلؑ کی قربانی کے بعد امامت ابراہیمؑ کو عطا ہوئی، اور حسینؑ کی قربانی بھی دراصل اسی سلسلۂ امامت کا بقا اور دفاع تھا، جس کی بنیاد غدیر میں رکھی گئی تھی۔ یوں غدیر، قربانی کے دونوں کناروں کو ایک الٰہی نظام میں باندھ دیتی ہے تاکہ قربانی محض جذبات نہ بنے، بلکہ ایک بصیرت مند جدوجہد میں ڈھل جائے۔

آپ کا ووٹ کس کیلئے؟ حق یا باطل؟!!

یہ بات بظاہر درست معلوم ہوتی ہے کہ آج کی دنیا پر امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اسرائیل جیسے ممالک کا غلبہ ہے۔ ان کی فوجی طاقت، معاشی اثرورسوخ، میڈیا پر کنٹرول، اور بین الاقوامی اداروں میں ان کی حیثیت اتنی مضبوط ہے کہ عام فہم میں یہی تصور پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی اصل طاقت یہی ممالک ہیں۔ لیکن جب انسان گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے، تاریخ، معیشت، عالمی مالیاتی نظام، خفیہ تنظیموں، میڈیا نیٹ ورکس، اور مخصوص خاندانی اقتدار کی گتھیوں کو کھول کر دیکھتا ہے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان طاقتور ممالک کے پس پردہ بھی ایک اور طاقت موجود ہے جو اصل فیصلے کرتی ہے، پالیسیاں طے کرتی ہے، اور حتیٰ کہ حکومتیں بھی گراتی اور بناتی ہے۔

یہ طاقت درحقیقت ایک ایسا پیچیدہ عالمی نظام ہے جس کی جڑیں بین الاقوامی مالیاتی اداروں، خفیہ لابیوں، صہیونی خاندانوں اور صدیوں پرانے ایجنڈے میں پیوست ہیں۔ دنیا کے بڑے مالیاتی بینک، جیسے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف، اور مرکزی بینکنگ نظام (جیسے فیڈرل ریزرو) درحقیقت ان چند خاندانوں کے زیر اثر ہیں جنہوں نے سودی نظام کو دنیا پر مسلط کر کے اسے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں "روتھ چائلڈ"، "راک فیلر"، اور "واربرگ" جیسے خاندان ہیں جن کی دولت، اثرورسوخ، اور سیاسی رسائی کا اندازہ عام آدمی

لگا ہی نہیں سکتا۔ یہ خاندان صرف سرمایہ دار نہیں بلکہ عالمی نظریاتی تحریکوں، خفیہ تنظیموں (جیسے فری میسنری اور الیومیناتی)، اور میڈیا نیٹ ورکس کے مالک اور معمار ہیں۔

امریکہ جیسی سپر پاور بھی ان خاندانوں کے بنائے ہوئے معاشی، عسکری اور نظریاتی ڈھانچے کے اندر کام کرتی ہے۔ امریکی صدر ہو یا برطانوی وزیر اعظم، وہ در حقیقت انہی لابیوں کے طے کردہ ایجنڈے کے تحت کام کرتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ، پینٹاگون، سی آئی اے، ایم آئی سکس، موساد، یہ سب ادارے ظاہراً قومی مفاد کے محافظ ہیں، لیکن دراصل ان کا تعلق ایک ایسے عالمی نیٹ ورک سے ہے جو دنیا کو ایک مخصوص سمت میں لے جا رہا ہے، جس کا مقصد ایک نیا عالمی نظام قائم کرنا ہے جس میں مذہب، قومی خودمختاری، روایتی اقدار، اور عوامی مرضی کی کوئی حیثیت نہ ہو۔ اس نظام کا مرکز صرف دولت، طاقت اور کنٹرول ہے، اور اس کنٹرول کے ذریعے پوری انسانیت کو ایک فکری غلامی میں مبتلا کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ ممالک جو ان طاقتوں کے نظام سے بغاوت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یا تو انہیں دہشت گرد قرار دے دیا جاتا ہے، یا ان میں خانہ جنگی، بغاوت، یا اقتصادی تباہی کے منصوبے نافذ کر دیے جاتے ہیں۔ افغانستان، عراق، لیبیا، شام، ایران، اور وینزویلا جیسے ممالک کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے خلاف جو کارروائیاں کی گئیں وہ بظاہر جمہوریت، انسانی حقوق یا عالمی امن کے نام پر تھیں، لیکن دراصل وہ سب اقدامات اس عالمی نظام کو قائم رکھنے کے لیے تھے جس کے ذریعے یہ خفیہ طاقتیں دنیا پر حکمرانی کر رہی ہیں۔

ان خفیہ قوتوں کا سب سے مؤثر ہتھیار "میڈیا" ہے، جس کے ذریعے وہ حقیقت کو چھپا کر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ عوام کی سوچ، طرزِ زندگی، عقائد، حتیٰ کہ اُن کے خواب بھی انہی میڈیا مافیاز کے کنٹرول میں ہیں۔ ہالی وُڈ، نیٹ فلکس، سی این این، بی بی سی، اور دیگر بڑے چینلز و پلیٹ فارمز انہی قوتوں کے زیر اثر ہیں۔ ان کا مقصد صرف تفریح یا معلومات دینا نہیں بلکہ ذہن سازی کرنا اور دنیا کو ایک مخصوص نظریے کے مطابق ڈھالنا ہے، تاکہ عوام کبھی اصل دشمن کو پہچان ہی نہ سکیں۔

یہ خفیہ طاقتیں مذہب، تہذیب، ثقافت اور روحانیت کو ختم کرکے ایک ایسی "عالمی شناخت" قائم کرنا چاہتی ہیں جو صرف صارفیت، لذت پرستی، اور غلامی پر مبنی ہو۔ ان کے نزدیک خدا کی بندگی نہیں بلکہ سرمایہ کی پوجا اہم ہے۔ ان کا سب سے بڑا ہدف اسلام، خصوصاً حقیقی محمدی اسلام ہے، کیونکہ یہی ایک نظریہ ہے جو ان کی فکری و تہذیبی آمریت کے خلاف مزاحمت کی قوت رکھتا ہے۔ اس لیے وہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑتے ہیں، مسلمانوں کو منتشر کرتے ہیں، اور اسلامی تعلیمات کو یا تو مسخ کرتے ہیں یا مذاق بناتے ہیں۔

لہٰذا جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ امریکہ یا یورپ دنیا پر حکومت کر رہے ہیں، تو دراصل ہم ایک سطحی فہم میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ممالک خود بھی ایک ایسے عالمی منصوبے کے مہرے ہیں جس کی حکمتِ عملی ان چند خفیہ طاقتوں کے ہاتھ میں ہے جو دنیا کو انسانیت سے خالی، مادہ پرستی سے بھری، اور روحانی طور پر مردہ بنانے کے منصوبے پر عمل کر رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں صرف وہی قوت کھڑی ہو سکتی ہے جو خدا پر یقین رکھتی ہو،

جس کا مرکز عدل، معرفت اور اخلاق ہو، اور جس کی قیادت کسی ایسے امام کے ہاتھ میں ہو جو ظاہری اور باطنی بصیرت کا حامل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ "انتظار" اور "ظہور" جیسے تصورات، استعمار اور صہیونیت کے لیے سب سے بڑی فکری رکاوٹ ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک دن ایسی قیادت ضرور ظاہر ہو گی جو ان کے اس فریبِ عالمی نظام کو نیست و نابود کر دے گی۔

صہیونی طاقت اپنی بین الاقوامی حکمتِ عملی کو انتہائی منظم، خفیہ، اور تدریجی انداز میں بروئے کار لاتی ہے۔ یہ کوئی سطحی یا وقتی منصوبہ نہیں بلکہ ایک صدیوں پر محیط ایک گہرا نظریاتی اور عملی نیٹ ورک ہے جس کا مقصد عالمی سطح پر اثر و رسوخ قائم کرنا، مالیاتی، سیاسی، ثقافتی، اور نظریاتی میدانوں میں بالادستی حاصل کرنا، اور بالآخر دنیا کو ایک ایسے عالمی نظام کی طرف دھکیلنا ہے جس میں طاقت، دولت، اور فیصلہ سازی صرف مخصوص ہاتھوں میں مرتکز ہو۔

اس حکمتِ عملی کا پہلا ستون مالیاتی نظام ہے۔ روتھ چائلڈ اور دیگر طاقتور صہیونی خاندانوں نے بینکنگ سسٹم پر قابض ہو کر عالمی معیشت کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ عالمی بینک، آئی ایم ایف، فیڈرل ریزرو جیسے ادارے دراصل انہی طاقتوں کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ یہ ادارے بظاہر ممالک کو ترقی اور مالی امداد فراہم کرتے ہیں، لیکن اصل میں یہ انہیں سودی غلامی، شرائط، اور قرضوں کے جال میں جکڑ کر ان کی خود مختاری چھین لیتے ہیں۔ جب کوئی ملک ان کے نظام سے ہٹنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے یا تو "ناکام ریاست" بنا دیا جاتا ہے یا اس کے خلاف پابندیاں، بغاوتیں یا عسکری کارروائیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

دوسرا ستون سیاسی نظام ہے۔ صہیونی لابیوں نے امریکہ اور یورپ کی سیاست میں اس حد تک گھس پیٹھ کر لی ہے کہ پارلیمان سے لے کر ایوانِ صدارت تک فیصلے انہی کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ "AIPAC" جیسی تنظیمیں امریکی پالیسی سازی پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ صدارتی امیدواروں کو کامیابی کے لیے ان لابیوں کی حمایت درکار ہوتی ہے، اور اگر کوئی امیدوار یا سیاستدان ان کے خلاف بولنے کی جرات کرے تو یا تو اسے منظر سے ہٹادیا جاتا ہے، بدنام کیا جاتا ہے یا میڈیا کے ذریعے ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے وہ اسرائیل کی حفاظت، مشرقِ وسطیٰ میں اپنے مفادات، اور مسلم ممالک کی تقسیم جیسے ایجنڈے آگے بڑھاتے ہیں۔

تیسرا اہم شعبہ میڈیا اور اطلاعات ہے۔ صہیونی طاقتیں دنیا کے بڑے میڈیا نیٹ ورکس، فلمی اداروں، خبروں کی ایجنسیوں اور سوشل میڈیا پلیٹ فارمز پر اثر رکھتے ہیں۔ سی این این، بی بی سی، نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ جیسے ادارے انہی کے بیانیے کو دنیا کے سامنے پھیلاتے ہیں۔ یہ میڈیا نہ صرف عوام کی سوچ تشکیل دیتا ہے بلکہ سچ اور جھوٹ کی تمیز کو بھی مٹا دیتا ہے۔ اس کے ذریعے مسلمانوں کو دہشت گرد، مزاحمت کو بغاوت، اور ظلم کو انصاف بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ہالی وُڈ اور نیٹ فلکس جیسے پلیٹ فارم بھی اسی فکری یلغار کا حصہ ہیں، جہاں اسلامی اقدار، مشرقی روایات، اور خاندانی نظام کو مذاق بنا کر پیش کیا جاتا ہے تاکہ نوجوان نسل فکری طور پر مغلوب ہو جائے۔

چوتھا ذریعہ تعلیم اور فکری ادارے ہیں۔ صہیونی قوتوں نے عالمی جامعات، تھنک ٹینکس، اور علمی مراکز پر بھی اپنی گرفت مضبوط کر لی ہے۔ ہارورڈ، ییل، آکسفورڈ جیسے اداروں سے وہ دانشور اور رہنما تیار کیے جاتے ہیں جو آگے چل کر عالمی اداروں، اقوام متحدہ، یا قومی حکومتوں کا حصہ بنتے ہیں۔ ان اداروں کے ذریعے عالمی بیانیہ مرتب کیا جاتا ہے، نئی نسل کی ذہن سازی کی جاتی ہے، اور ایسی زبان اور اصطلاحات متعارف کروائی جاتی ہیں جو صہیونی نظام کو ایک فطری اور ناگزیر حقیقت کے طور پر پیش کریں۔

پانچواں اور سب سے خفیہ پہلو خفیہ تنظیموں، لابیوں، اور غیر سرکاری نیٹ ورکس کا ہے جیسے فری میسنری، الیومیناتی، اور دیگر پوشیدہ حلقے۔ یہ تنظیمیں بظاہر علمی، فلاحی یا روحانی تحریکوں کے طور پر سامنے آتی ہیں، مگر درحقیقت ان کا کام مخصوص افراد کو بھرتی کرنا، انہیں مخصوص نظریے کے تحت تربیت دینا، اور پھر انہیں حساس عہدوں پر پہنچانا ہوتا ہے۔ ان کے اندرونی مراسم، علامات، اور قواعد وضوابط صدیوں پرانے صہیونی متون اور عقائد پر مبنی ہوتے ہیں جن کا مقصد دنیا کو ایک ایسے "نئے عالمی نظام" میں لانا ہے جو دجالی فکر کی جھلک رکھتا ہے۔

یہ سب عناصر مل کر ایک ایسا عالمی جال بناتے ہیں جس میں اکثر ریاستیں، ادارے، اور اقوام محض مہرے بن جاتی ہیں۔ انہیں آزادی، ترقی، حقوق، اور امن کے نام پر وہ سب کچھ قبول کروایا جاتا ہے جو حقیقت میں فکری اور نظریاتی غلامی ہے۔ یہ نظام اپنی حقیقت کو چھپانے

کے لیے ہمیشہ انسانیت، ترقی، اور آزادی جیسے نعروں کو استعمال کرتا ہے، جبکہ اس کے اصل مقاصد سرمایہ داری کا تحفظ، اسرائیل کا دفاع، اور عالمی روحانی بیداری کا خاتمہ ہیں۔

لہٰذا صہیونی طاقتیں بین الاقوامی سطح پر اپنے معاملات کو اس قدر باریکی، تسلسل، اور پیشگی منصوبہ بندی سے چلاتی ہیں کہ بظاہر یہ سب کچھ قدرتی اور خود رَو محسوس ہوتا ہے، حالانکہ اس کے پیچھے صدیوں پرانی چالاکی، فکری تسلط، اور دجل کا وہ نظام ہے جو اب تقریباً دنیا کے ہر شعبے میں سرایت کر چکا ہے۔ ان کا سب سے بڑا ہدف یہ ہے کہ کوئی بھی امت یا قوم ان کی حقیقت کو پہچان نہ سکے، اور اگر پہچان لے، تو وہ کبھی متحد نہ ہو۔

تاریخی تناظر میں دیکھیں تو صہیونیت اپنے فسادی کردار کے ساتھ بہت سے واقعات میں ملوث رہی ہے جیسے سکہ ریناسنس، یا تجدیدِ علوم، کا آغاز یورپ میں 14ویں سے 17ویں صدی کے درمیان ہوا۔ اسے سائنسی، فلسفیانہ اور فنی نشاۃ ثانیہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ تحریک کلیسائی اجارہ داری کے خلاف ایک ذہنی بغاوت بھی تھی، جس نے فرد کی آزادی، علم کی ترویج اور تجرباتی سائنس کو فروغ دیا۔ بعض نظریات کے مطابق اس دور میں یہودی دانشوروں، خصوصاً قبالائی مفکرین کا گہرا اثر تھا۔ خاص طور پر ہسپانیہ سے نکالے گئے یہودیوں نے اٹلی میں آکر طب، فلسفہ اور سائنس کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کچھ مؤرخین کا ماننا ہے کہ یہ مفکرین ہیومنزم اور سیکولر سوچ کے فروغ کے ذریعے عیسائی کلیسا کی گرفت کم کرنے اور ایک نئے عالمی نظام کی بنیاد رکھنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

انقلابِ فرانس 1789 میں وقوع پذیر ہوا، جسے عام طور پر بادشاہت، کلیسا اور اشرافیہ کے خلاف عوامی بغاوت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس میں مساوات، آزادی اور اخوت کے نعرے بلند کیے گئے۔ لیکن بعض محققین اور نظریاتی اسکالرز کا کہنا ہے کہ اس انقلاب کو Freemasons اور Illuminati جیسی خفیہ تنظیموں نے منظم کیا، جن میں صہیونی عقائد کے حامل افراد شامل تھے۔ ان کے مطابق اس انقلاب کا اصل مقصد یورپ کی روایتی بادشاہتوں کو گرا کر مذہب و ریاست کو علیحدہ کرنا، سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دینا، اور تعلیم و سیاست پر بالواسطہ قبضہ حاصل کرنا تھا۔

صنعتی انقلاب جو 1760 سے 1840 کے درمیان برپا ہوا، دراصل ایک سائنسی اور تکنیکی پیش رفت تھی جس نے پیداوار، تجارت اور روزمرہ زندگی میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ صہیونی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس انقلاب نے سرمایہ دارانہ نظام کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں بینکنگ، مالیاتی ادارے اور انٹرنیشنل مارکیٹس قائم ہوئیں۔ ان اداروں پر بعد میں ایسے یہودی بینکار خاندانوں کا کنٹرول قائم ہوا، جن میں Rothschild خاندان سب سے نمایاں ہے۔ ان خاندانوں نے صنعتی انقلاب کے ثمرات سے زبردست مالی قوت حاصل کی، جسے وہ عالمی سیاست پر اثرانداز ہونے کے لیے استعمال کرتے رہے۔

پہلی جنگِ عظیم 1914 سے 1918 تک جاری رہی، جس میں یورپی طاقتیں آپس میں برسرپیکار ہوئیں۔ اس جنگ کے دوران 1917 میں برطانوی حکومت نے بالفور اعلامیہ جاری کیا، جس میں فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کی حمایت کی گئی۔ بہت سے مبصرین کا

خیال ہے کہ اس اعلامیے کے پسِ پردہ یہودی لابی کی سفارتی کوششیں تھیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ برطانیہ نے یہودیوں کی مالی و سفارتی حمایت حاصل کرنے کے بدلے اس اعلامیہ پر رضامندی ظاہر کی۔ اس حوالے سے Rothschild خاندان کی مالی معاونت کو بھی ایک اہم عامل سمجھا جاتا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم 1939 سے 1945 کے درمیان ہوئی، جسے فاشزم کے خلاف ایک عالمی جنگ قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن بعض نظریات کے مطابق اس جنگ کے بعد ہونے والے ہولوکاسٹ نے عالمی سطح پر یہودیوں کے لیے ایک علیحدہ ریاست کے قیام کی راہ ہموار کی۔ 1948 میں اسرائیل کے قیام کو بعض مبصرین ایک "منصوبہ بند نتیجہ" سمجھتے ہیں، جس کے لیے ہولوکاسٹ کو ایک سیاسی ایجنڈے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس تناظر میں میڈیا، بینکنگ اور سفارت کاری میں یہودی اثر و رسوخ کو کلیدی اہمیت دی جاتی ہے، جس کے ذریعے عالمی رائے عامہ کو متأثر کیا گیا۔

اگرچہ صہیونی طاقتیں دنیا کے بیشتر شعبوں اور حکومتوں پر اثر انداز ہو چکی ہیں، لیکن اب بھی کچھ ایسے شعبے، افراد اور ممالک باقی ہیں جو یا تو مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں نہیں آئے یا مسلسل مزاحمت کی حالت میں ہیں۔ یہ مزاحمت ہر جگہ یکساں نہیں، بلکہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے — کہیں فکری سطح پر، کہیں عسکری، کہیں سیاسی، اور کہیں روحانی۔

سب سے اہم مزاحمت اسلامی دنیا کے اندر موجود نظریاتی حلقوں سے آتی ہے، خاص طور پر وہ افراد اور گروہ جو قرآن و سنت کے گہرے فہم، روحانی شعور، اور استعمار مخالف فکر کے حامل ہیں۔ یہ علماء، فلاسفہ، اور مجاہدین صہیونی نظام کو پہچان چکے ہیں اور اس کے خلاف فکری بیداری پیدا کر رہے ہیں۔ ایران ایک ایسا ملک ہے جو صہیونی عالمی نظام کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے، اور اس کا پورا انقلابی ڈھانچہ اسی تصور پر قائم ہے کہ دنیا پر ایک باطل نظام مسلط ہے جس سے آزادی صرف خدا پر کامل ایمان اور ظہورِ حق کی راہ سے ممکن ہے۔ حزب اللہ جیسی تنظیمیں، اگرچہ جغرافیائی طور پر چھوٹی ہیں، مگر وہ فکری طور پر اس نظام کے خلاف سب سے زیادہ بیدار اور منظم مزاحمت پیش کرتی ہیں۔

اسی طرح بعض روسی اور چینی حلقے، خاص طور پر وہ جو مغربی مالیاتی نظام اور نیو ورلڈ آرڈر کے خلاف قومی خودمختاری کو اہمیت دیتے ہیں، وہ بھی اس تسلط کو چیلنج کر رہے ہیں۔ چین، اگرچہ خود بھی ایک طاقتور اور بعض اوقات ظالم حکومت کے طور پر جانا جاتا ہے، مگر وہ صہیونی سرمایہ دارانہ نظام کا مکمل حصہ نہیں بنا—بلکہ وہ ایک متبادل اقتصادی اور سیاسی بلاک کھڑا کرنے کی کوشش کر رہا ہے، جیسے کہ BRICS ۔ روس، خاص طور پر ولادیمیر پوتن کے دور میں، بارہا مغرب کی اخلاقی و ثقافتی یلغار پر تنقید کر چکا ہے، اور مغربی لبرل نظام سے اپنی شناخت کو الگ رکھنا چاہتا ہے۔

مغرب کے اندر بھی چند جری صحافی، محقق، اور مفکر موجود ہیں جو حقیقت کو سمجھ چکے ہیں اور اپنے محدود وسائل کے باوجود سچ بولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جولیان آسانج، ایڈورڈ

اسنودن جیسے افراد یا پروفیسر نورمن فنکلسٹائن جیسے یہودی نقاد، صہیونیت کی حقیقت اور اسرائیلی مظالم پر روشنی ڈالتے رہے ہیں۔ لیکن ان افراد کو یا تو خاموش کر دیا جاتا ہے، یا جلاوطنی و قید کی زندگی دی جاتی ہے۔

انٹرنیٹ اور متبادل میڈیا بھی ایک ایسا میدان ہے جو ابھی پوری طرح ان کے کنٹرول میں نہیں آیا، اگرچہ وہ اسے قابو پانے کے لیے سرگرم ہیں۔ سوشل میڈیا پر کچھ آزاد آوازیں اب بھی باقی ہیں جو لوگوں کو بیدار کرتی ہیں، حقائق کو سامنے لاتی ہیں، اور دنیا کے حقیقی نقشے کو واضح کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب "فیک نیوز"، "ریڈیکلائزیشن" اور "معلوماتی دہشتگردی" جیسے نئے الزامات کے ذریعے ان آوازوں کو بھی قابو کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

روحانی طور پر بھی، کچھ صوفی، عرفاء، اور اہلِ باطن ایسے ہیں جن کی نگاہ دجالی نظام کی حقیقت پر ہے، اور وہ دنیا کو بیدار کرنے میں لگے ہوئے ہیں ــــ نہ نعرے بازی کے ذریعے، نہ سیاسی مطالبات کے ذریعے، بلکہ باطن کی تطہیر، علم کی روشنی، اور یقین کے ساتھ۔ ان کی تعداد شاید کم ہے، مگر ان کی تاثیر ان لوگوں سے زیادہ ہے جو صرف شور و غوغا کرتے ہیں۔

دنیا مکمل طور پر ان کے کنٹرول میں نہیں آئی۔ مزاحمت موجود ہے ــــ کبھی خاموش، کبھی علانیہ، کبھی فکری، کبھی سیاسی، کبھی روحانی۔ یہی مزاحمت اس بات کی علامت ہے کہ نظامِ

باطل مکمل فتح حاصل نہیں کر سکا۔ مگر اس مزاحمت کو زندہ رکھنے کے لیے شعور، اتحاد، اور قربانی ضروری ہے، اور یہی وہ کام ہے جس سے صہیونی طاقتیں سب سے زیادہ خائف ہیں۔

اس صہیونی طاقت کی مخالفت محض کسی قوم، نسل یا مذہب کی بنیاد پر نہیں کی جاتی بلکہ اس نظریے، طریقہ کار اور عالمی اثرورسوخ کی بنیاد پر کی جاتی ہے جو انسانیت، روحانیت، حریت، اور عدل کے بنیادی اصولوں سے ٹکراتا ہے۔ یہ طاقت اپنی ظاہری ترقی، سائنسی غلبے، اور سفارتی چالاکی کے پیچھے ایک ایسانظام لے کر آئی ہے جو انسان کو خالص مادی سوچ میں جکڑ کر رکھ دیتا ہے، آزادی کی جگہ غلامی، سچ کی جگہ فریب، اور خدا پر توکل کی جگہ سرمایہ وطاقت پر انحصار سکھاتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو پوری انسانیت کو ایک مصنوعی، خودغرض، اور روحانی طور پر بے جان مخلوق میں تبدیل کر رہا ہے۔ اس طاقت کی مخالفت اس لیے ضروری ہے کہ اگر اس کے خلاف آواز نہ اٹھائی گئی تو انسان صرف ظاہری طور پر نہیں بلکہ باطنی طور پر بھی مسخ ہو جائے گا، یہاں تک کہ وہ اپنے رب کو بھول جائے گا، اپنی فطرت کو کھو دے گا، اور ایک ایسی دنیا میں زندہ رہے گا جہاں "انسان" کی تعریف صرف مشین، عدد، اور صارف تک محدود ہو گی۔

ان کے مقابلے کے لیے سب سے پہلے نفسیاتی سطح پر بغاوت ضروری ہے، یعنی انسان کو اپنے ذہن سے یہ غلامی نکالنی ہو گی کہ وہ مغرب یا صہیونی نظام کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ نظام سب سے پہلے انسان کے ذہن پر قبضہ کرتا ہے، اسے حقیر، کمزور، اور ناکام محسوس کرواتا ہے تاکہ وہ مزاحمت کے قابل ہی نہ رہے۔ اس کے مقابلے میں جن کے پاس سچا عقیدہ،

مضبوط ایمان، اور روحانی یقین ہو، وہی اس غلامی کو توڑ سکتے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلا ہتھیار ایمان، یقین، اور شعور ہے۔ جب انسان اس باطل نظام کو پہچان لیتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس کا خالق اس سے بڑا ہے، تو پھر خوف ٹوٹ جاتا ہے۔ یہی نفسیاتی آزادی ہر مادی جدوجہد کی بنیاد بنتی ہے۔

مادّی وسائل کی بات کی جائے تو ظاہر ہے کہ صہیونی طاقت دنیا کے بیشتر مالیاتی، عسکری، اور سائنسی وسائل پر قابض ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مزاحمت ناکام ہے۔ مزاحمت کی کامیابی کا انحصار وسائل سے زیادہ حکمت، اتحاد، استقامت، اور نظریاتی پختگی پر ہوتا ہے۔ اسلامی دنیا کے کچھ حصوں، جیسے ایران، بعض مزاحمتی تنظیموں، اور بعض عوامی تحریکوں کے پاس یہ مادّی و عسکری طاقت محدود ہونے کے باوجود ایسی اخلاقی و روحانی توانائی ہے جو دشمن کے دل میں خوف پیدا کرتی ہے۔ ان کے پاس وہ جذبہ ہے جو کسی بڑی فوج سے زیادہ مہلک ہوتا ہے — یعنی شہادت، قربانی، اور باطل کے سامنے نہ جھکنے کا عزم۔

لائحہ عمل کی بات کی جائے تو سب سے پہلے فکری و تعلیمی محاذ پر ایک نئی بیداری کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایسے تعلیمی نظام، ذرائع ابلاغ، اور ادارے بنانے ہوں گے جو صہیونی بیانیے کے متبادل ہوں۔ ہمیں اپنے بچوں کو وہ تاریخ، وہ زبان، اور وہ نظریہ دینا ہو گا جو انہیں دنیا کی حقیقت، باطل کے فریب، اور حق کی پہچان دے سکے۔ اسی طرح ہمیں روحانی سطح پر بھی دوبارہ اللہ سے تعلق مضبوط کرنا ہو گا، تاکہ ہمارے فیصلے صرف معاشی، سیاسی یا وقتی نہ ہوں، بلکہ ان کی بنیاد رضائے الٰہی اور ابدی کامیابی ہو۔ ہمیں اپنی ثقافت، اقدار، اور معاشرتی نظام

کو بھی ان کے اثر سے پاک کرنا ہو گا، تا کہ ہم خود کو آزاد قوم کی حیثیت سے شناخت دے سکیں، نہ کہ مغرب کے دستر خوان پر پلنے والی قوم کی طرح۔

سیاسی طور پر بھی ضروری ہے کہ مسلم دنیا کے وہ ممالک یا جماعتیں جو اب بھی اس نظام کی حقیقت کو جانتی ہیں، وہ آپس میں تعاون، اتحاد اور مشورے کی بنیاد پر ایک بلاک تشکیل دیں۔ یہ اتحاد صرف دفاعی یا اقتصادی نہ ہو، بلکہ نظریاتی اور تہذیبی سطح پر ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر فرد، ہر گھر، ہر ادارہ یہ فیصلہ کرے کہ وہ اس دجالی نظام کا حصہ نہیں بنے گا —وہ جھوٹے بیانیوں کو نہیں مانے گا، وہ اپنی زندگی کا مقصد صرف دنیاوی کامیابی نہیں بلکہ حق کے قیام اور باطل کی شکست کو بنائے گا۔

یہ ایک طویل، مشکل، اور صبر آزما جدوجہد ہے، مگر جس طرح اندھیرے میں ایک چھوٹا چراغ پورے ماحول کو بدل سکتا ہے، ویسے ہی بیدار دل، زندہ ضمیر، اور حق پر یقین رکھنے والے لوگ اس نظامِ باطل کے خلاف حقیقی مزاحمت کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ اور یہی وہ اصل لڑائی ہے جو حق و باطل کے درمیان روزِ ازل سے جاری ہے —اور قیامت تک جاری رہے گی۔

عالمی صہیونیت کے خلاف ایک مؤثر اور دیرپا مزاحمت تب ہی قائم ہو سکتی ہے جب دنیا کی تمام اقوام، مذاہب، ثقافتیں، اور طبقات اپنے اختلافات سے بالاتر ہو کر ایک مشترکہ انسانی، اخلاقی اور روحانی بنیاد پر متحد ہوں۔ صہیونیت نے دنیا میں جو سب سے کامیاب حربہ استعمال

کیا ہے، وہ فرقہ واریت، قوم پرستی، اور لسانی و مذہبی منافرت کا ہتھیار ہے۔ اس نے قوموں کو ایک دوسرے سے برسرِپیکار کر کے، مذاہب کو آپس میں ٹکرا کر، اور نظریات کو آپس میں الجھا کر اس عالمی نظام کو تقویت بخشی ہے جس کے مرکز میں طاقت، لالچ، مادّیت، اور روحانیت سے بغاوت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صہیونیت کے خلاف سب سے پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم تفرقے کو رد کر کے اتحاد اور رواداری کی طرف قدم بڑھائیں۔

یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ اختلاف رائے فطری ہے، لیکن جب اختلاف کو اس حد تک بڑھا دیا جائے کہ وہ نفرت، دشمنی، اور تکفیر میں بدل جائے، تو یہ وہی دجالی سازش ہے جس کے تحت انسانوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنایا جاتا ہے۔ دنیا کے اکثر مذاہب — اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت — سب بنیادی اخلاقیات میں یکساں ہیں۔ سب سچائی، عدل، رحمت، خیر اور امن کی بات کرتے ہیں۔ لیکن صہیونیت نے ان مذاہب کے ماننے والوں کو ان کے ظاہر میں الجھا کر ان کی اصل روح سے دور کر دیا ہے۔ اسلام کو فرقوں میں بانٹا گیا، عیسائیت کو سیکولرزم میں ڈھالا گیا، اور دیگر مذاہب کو یا تو مافوق الفطرت داستانوں میں قید کر دیا گیا یا مکمل طور پر بے عمل روحانیت میں گم کر دیا گیا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ کوئی بھی قوم یا ملت ایسی فکری، نظریاتی یا روحانی قوت پیدا نہ کر سکے جو صہیونی نظام کو للکار سکے۔

اس کے خلاف مزاحمت صرف تب ہو سکتی ہے جب مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندو، بدھ مت، سکھ — سب اپنے اختلافات کو ایک طرف رکھ کر اس ایک مشترکہ دشمن کو پہچانیں

جو سب کو ایک عالمی غلامی کی طرف لے جا رہا ہے۔ ایک ایسا نظام جو نسل، رنگ، زبان، عقیدہ اور نظریے کے تمام اختلافات کو صرف اس وقت قابلِ قبول سمجھتا ہے جب وہ نظام کے مفاد میں ہوں، ورنہ انہیں جڑ سے ختم کر دیتا ہے۔ صہیونی نظام کسی ایک مذہب یا قوم کا نمائندہ نہیں بلکہ ایک دجالی فکر ہے جس کا مرکز خود پرستی، مادی برتری، اور خدائی اختیارات کا دعویٰ ہے۔ اس فکر کے مقابلے میں ہمیں ایک ایسی عالمی فکری مزاحمت کی ضرورت ہے جو ہر قوم اور ہر مذہب کو عزت، وقار، اور مساوات کے ساتھ اس کارزار میں شریک کرے۔

مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی فرقہ واریت کو ترک کریں۔ شیعہ و سنی، دیوبندی و بریلوی، صوفی و سلفی — یہ سب دراصل اسلام کے مختلف مظاہر ہیں، نہ کہ متضاد سچائیاں۔ صہیونی طاقت نے ان میں آگ لگائی، اور مسلمان اس میں جلتے رہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ امتِ مسلمہ اس آگ کو بجھائے، باہمی احترام، علمی مکالمے، اور فکری رواداری کے ساتھ ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرے۔ اسی طرح باقی ادیان و اقوام کو بھی یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ دنیا کا ہر انسان عزت و حرمت کے قابل ہے، اور صہیونی نظام کی مخالفت کسی نسل یا قوم کی مخالفت نہیں بلکہ ایک عالمی باطل فکر کی مخالفت ہے جو سب کو غلام بنانا چاہتی ہے۔

زبان، قوم، نسل اور ثقافت کو بھی تفرقے کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دنیا کو نسلی برتری، لسانی غرور، اور قومی مفادات کے نام پر تقسیم کر دیا گیا ہے، جبکہ صہیونیت خود ان

تمام حد بندیوں سے بلند ہو کر اپنی عالمی حکومت کا خواب پورا کر رہی ہے۔ ہمیں ان تمام مصنوعی سرحدوں کو ذہنی طور پر توڑنا ہو گا اور انسانیت کے ایک عالمی تصور پر ایمان لانا ہو گا —ایک ایسی انسانیت جو عدل، رحمت، اخوت اور قربانی کے اصولوں پر کھڑی ہو۔ اقوامِ عالم کو اس بات پر آمادہ ہونا ہو گا کہ ان کا اصل دشمن وہ نہیں جو ان کی زبان یا رنگ سے مختلف ہے، بلکہ وہ ہے جو ان کے تمام وسائل، ان کے خیالات، اور ان کی نسلوں پر قبضہ کر رہا ہے۔

عالمی اتحاد کا تصور تبھی ممکن ہے جب ہر طبقہ، ہر دین، ہر قوم، اور ہر تہذیب اس بات پر متفق ہو کہ دنیا ایک باطل قوت کے شکنجے میں ہے، اور اس سے نجات صرف اسی وقت ممکن ہے جب سب اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر ایک نئی عالمی بیداری، فکری انقلابیّت، اور اخلاقی اتحاد کی بنیاد رکھی جائے۔ یہ اتحاد کسی عالمی حکومت یا کسی طاقتور بلاک کے طور پر نہیں بلکہ ایک عالمی ضمیر کی صورت میں ہونا چاہیے —ایک ایسا ضمیر جو جھوٹ کو سچ، ظلم کو عدل، اور باطل کو حق کے نام پر بیچنے والوں کو پہچان سکے۔

یہی وہ اتحاد ہے جو صہیونی نظام سے سب سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جب انسان فرقوں، قوموں، اور ذاتوں سے بلند ہو کر صرف حق اور باطل کی بنیاد پر سوچنے لگتا ہے، تو وہ ناقابلِ شکست ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نہ فوج، نہ دولت، نہ میڈیا، نہ فتنہ —کچھ بھی اس مزاحمت کو روک نہیں سکتا۔ اور یہی وہ وقت ہو گا جب عالمی صہیونیت کا بناوٹی جال ٹوٹے گا اور انسانیت اپنی اصل فطرت کی طرف واپس لوٹے گی۔

آج مذہب سے زیادہ دین کی ضرورت ہے

جب ہم کہتے ہیں کہ "تبدیلی کے لیے سچائی، عدل اور توحید کو صرف مذہبی عقیدے کی حد تک نہیں بلکہ نظام کے متبادل کے طور پر پیش کرنا چاہیے"، تو ہم دراصل ایک ایسی فکری تبدیلی کی بات کر رہے ہوتے ہیں جو محض روحانی یا عباداتی دائرے میں محدود نہ ہو بلکہ انسانی زندگی کے تمام اجتماعی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لے لے۔ توحید، عدل اور سچائی جیسے الفاظ ہمارے دینی متون میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، مگر ان کا مفہوم اگر صرف نماز، روزے، اور انفرادی نجات تک محدود کر دیا جائے، تو وہ اپنا اصل تمدنی وزن کھو دیتے ہیں۔ یہی وہ المیہ ہے جو آج کی مسلم دنیا کو درپیش ہے، کہ ہمارا دین ہمارے دلوں میں تو زندہ ہے، لیکن ہماری حکومتوں، منڈیوں، میڈیا، عدالتوں اور تعلیمی نظام میں مغرب کی لادین فکر کا غلبہ ہے۔

توحید محض اللہ کے ایک ہونے کا اقرار نہیں، بلکہ ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ حیات ہے جو انسان کو ہر غیر الٰہی طاقت کے سامنے جھکنے سے روکتا ہے۔ توحید کے عملی تقاضے یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کسی بھی ایسی طاقت کو حاکم، فیصلہ ساز یا قانون ساز نہ مانے جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو۔ یہی تصور جب نظام میں ڈھلتا ہے تو امامت و خلافت، اسلامی عدلیہ، غیر سودی معیشت، اور انسانی مساوات پر مبنی سیاست کا ظہور ہوتا ہے۔ توحید کا

مطلب صرف شرک سے اجتناب نہیں بلکہ ہر اس نظام سے انکار ہے جو انسانوں کو ان کے خالق سے کاٹ کر کسی مصنوعی مرکزِ طاقت کی اطاعت میں دے دے۔

عدل کا تصور بھی محض عدالتوں اور قوانین تک محدود نہیں۔ عدل ایک ایسا ہمہ گیر اصول ہے جو معاشی تقسیم، سماجی تعلقات، طبقاتی فرق، وسائل کی ملکیت، بین الاقوامی تعلقات اور حتیٰ کہ علم و اطلاعات کی ترسیل تک کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ اگر عدل کو نظام کے بنیادی ستون کے طور پر پیش کیا جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ سودی نظام، اجارہ داری، استحصالی معاہدات، کرپٹ عدالتیں، جانبدار میڈیا، اور طبقاتی تعلیمی ڈھانچے کا مکمل خاتمہ۔ عدل کو عبادات کے ساتھ جوڑ کر محدود کرنے سے ہم اس کے انقلابی پہلو سے محروم ہو جاتے ہیں، اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں دین کی روحانی طاقت کو تہذیبی انقلاب کی بنیاد بنانے کی ضرورت ہے۔

سچائی، جسے ہم صداقت یا حق کہتے ہیں، صرف سچ بولنے یا جھوٹ سے اجتناب تک محدود نہیں رہ سکتی۔ جب ایک قوم اجتماعی طور پر "حق" کے اصول پر کھڑی ہوتی ہے تو وہ تاریخ، تعلیم، قانون، معیشت، اور ثقافت میں ہر اس چیز کو رد کرتی ہے جو جھوٹ، پروپیگنڈے، فریب، اور مغالطے پر مبنی ہو۔ موجودہ عالمی نظام کا سب سے مضبوط ستون جھوٹ ہے: میڈیا کی جھوٹی خبریں، تاریخ کی مسخ شدہ تفاسیر، سرمایہ داری کے جھوٹے وعدے، اور جمہوریت کے نام پر آمریت۔ اگر سچائی کو نظام کا اصول بنایا جائے تو پوری تہذیب کی عمارت از سرِ نو تعمیر کرنا ہو گی۔ یہ سچائی محض اخلاقی اصول نہیں بلکہ تمدنی معیارات کی بنیاد ہے۔

یہ سب باتیں تب تک بے معنی ہیں جب تک توحید، عدل اور حق کو صرف مذہبی شعائر اور انفرادی اعمال تک محدود رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی استعمار نے اسلام کے سیاسی و

معاشی مضمرات کو محدود کرنے کے لیے دینی فکر کو مسجد، مدرسے، اور ذاتی اخلاقیات تک محدود کرنے کی پالیسی اپنائی۔ اسلامی تعلیمات کو ایسا بنا دیا گیا گویا وہ صرف مرنے کے بعد کام آئیں گی، جب کہ اسلام کی اصل روح تو زندہ انسانوں کے لیے زندہ دنیا میں زندہ نظام پیش کرتی ہے۔ لہٰذا تبدیلی اسی وقت ممکن ہے جب ہم سچائی، عدل اور توحید کو محض عبادات، نصیحتوں یا انفرادی طہارت کے الفاظ نہ سمجھیں بلکہ انہیں اس عالمی نظام کے متبادل کے طور پر پیش کریں جو انسانیت کو ظلم، استحصال، جھوٹ، اور روحانی غلامی میں مبتلا کر چکا ہے۔

عقائد اور نظام کے درمیان ایک گہرا، فطری اور ناگزیر ربط ہوتا ہے۔ عقیدہ کسی فرد یا قوم کا داخلی یقین ہوتا ہے، جو اس کے عمل، رویے، ترجیحات اور بالآخر اس کے اجتماعی ڈھانچے کو متعین کرتا ہے۔ یہ ربط اتنا بنیادی اور ساختی ہے کہ کسی بھی نظام کو اس کے پیچھے موجود عقیدے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ میں جب بھی کوئی تہذیب ابھری ہے، وہ کسی نہ کسی عقیدے یا فکری بنیاد پر ہی اٹھی ہے، خواہ وہ عقیدہ خدا پر ہو یا مادہ پرستی پر، روحانی اصولوں پر ہو یا طاقت کی برتری پر۔ نظام اس عقیدے کا ظاہری اور عملی اظہار ہوتا ہے۔ عقیدہ دل و دماغ کو تشکیل دیتا ہے، جب کہ نظام معیشت، سیاست، قانون، تعلیم، تمدن اور ثقافت کو اس عقیدے کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

مثال کے طور پر، جب عقیدہ توحید ہوتا ہے، یعنی اس بات پر یقین کہ صرف ایک خدا ہے جو سب کا خالق، مالک اور حاکم ہے، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ قانون سازی، حکومت، رزق کی تقسیم، عدل و انصاف اور انسانی شرافت کے تمام معاملات اسی ایک خدا کی مرضی کے تابع ہوں۔ یہی توحید جب نظام کی صورت اختیار کرتی ہے تو ایک ایسا سیاسی و سماجی نظم

بنتا ہے جس میں انسان کسی دوسرے انسان کی غلامی نہیں کرتا، طاقتور کی خوشنودی معیارِ حق نہیں بنتی، اور اقتدار امانت بن جاتا ہے نہ کہ وراثت یا غلبے کا حق۔ اس عقیدے نے رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں قائم کردہ معاشرے میں پہلی بار ایک ایسا نظام تشکیل دیا جہاں حاکم بھی اللہ کے قانون کا تابع تھا، اور عدل و مساوات کو ایک ایسے معیار پر رکھا گیا جو اس سے پہلے دنیا نے نہیں دیکھا تھا۔

اسی طرح اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان فقط ایک ارتقائی حیوان ہے جس کا مقصد صرف لذت، فائدہ اور بقا ہے، تو اس عقیدے سے جنم لینے والا نظام سرمایہ داری بنے گا۔ اس نظام میں انسان کو صرف ایک صارف اور محنت کرنے ولی مشین سمجھا جاتا ہے، اس کی قیمت اس کی پیداوار یت سے لگائی جاتی ہے، اور دولت، طاقت اور میڈیا کو سچائی اور اخلاقیات پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ نظام خواہ کتنا ہی ترقی یافتہ دکھائی دے، مگر اس کی بنیاد میں انسان کی روحانیت، اخلاق، اخوت اور مقصدیت کی نفی موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مغربی تہذیب میں اخلاقی بحران، خاندانی زوال، تنہائی، خودکشی اور روحانی خلا بڑھتا جا رہا ہے، کیونکہ اس کا عقیدہ اور نظام دونوں انسان کو اس کی اصل حقیقت سے کاٹ چکے ہیں۔

عقیدہ اگر آخرت کا ہو، تو نظام اس دنیا میں انصاف کا ہو گا کیونکہ عقیدہ بتاتا ہے کہ انسان مرنے کے بعد بھی جوابدہ ہے، اور وہ صرف دنیا میں کامیابی کے لیے نہیں بلکہ دائمی انجام کے لیے بھی جیتا ہے۔ یہ عقیدہ ایک ایسا نظام پیدا کرتا ہے جس میں رشوت، دھوکہ، ظلم اور استحصال صرف قانون شکنی نہیں بلکہ خدا کی نافرمانی بن جاتے ہیں۔ لیکن اگر عقیدہ صرف اس دنیا کی محدودیت پر ہو، تو قانون صرف وہی کچھ روکے گا جس سے اجتماعی نقصان ہو، اور وہ بھی تب جب طاقتور کی مصلحت میں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سیکولر معاشروں میں قتل،

چوری یا دھوکہ تو جرم ہے لیکن فحاشی، شراب، جھوٹ، سود اور سرمایہ اندوزی جیسے گناہوں کو قانونی تحفظ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ان کا تصورِ جرم اس عقیدے سے جنم نہیں لیتا جس میں خدا کو بالادست مانا جاتا ہے۔

اسی طرح جب عقیدہ انسان کی خلافت کا ہو، کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے، تو تعلیم، سیاست، معیشت اور معاشرت سب کچھ اس نظریے کے گرد گھومتا ہے کہ انسان کو بااختیار بھی بنانا ہے اور بااخلاق بھی۔ لیکن اگر عقیدہ یہ ہو کہ انسان ایک حادثاتی وجود ہے، تو اسے صرف فائدہ مند بنانے کے لیے تیار کیا جاتا ہے، نہ کہ بامقصد۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم محض مہارت کا نام بن جاتی ہے، اخلاق صرف سوشل کنڈکٹ کا مسئلہ بن جاتا ہے، اور سیاست مفادات کا کھیل بن جاتی ہے۔

چنانچہ عقیدہ اور نظام کا تعلق جسم اور روح کی مانند ہے۔ عقیدہ روح ہے جو نظام کے جسم میں حرکت، حرارت اور سمت پیدا کرتا ہے۔ اگر عقیدہ زندہ اور سچا ہو مگر نظام اس سے ہم آہنگ نہ ہو، تو قوم نفاق، تضاد اور فکری انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور اگر نظام مضبوط ہو مگر عقیدہ کھوکھلا یا موروثی ہو، تو وہ نظام جلد یا بدیر اندر سے گل سڑ جاتا ہے، کیونکہ وہ روح کے بغیر صرف ایک ڈھانچا رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ مسلم دنیا کا سب سے بڑا بحران عقیدہ اور نظام کے درمیان موجود خلیج ہے۔ جب تک ہم اپنے عقائد کو صرف مسلکی، روحانی یا تعزیہ داری سطح پر رکھیں گے اور نظام کو مغرب کے لادین فریم میں چلائیں گے، ہم نہ دین کی عزت بچا سکیں گے نہ دنیا میں باوقار مقام پا سکیں گے۔ حقیقی تبدیلی اسی وقت آئے گی جب ہم اپنے عقائد کو زندہ، باشعور اور فعال بنا کر ان کی بنیاد پر ایک مکمل انسانی، فطری اور عادلانہ نظام کھڑا کریں گے۔ یہی دین کا اصل تقاضا اور تاریخ کا منتظر موڑ ہے۔

جب سچائی، عدل اور توحید کو نظام کے اصول کے طور پر پیش کیا جائے گا تو اس کا مطلب صرف مذہب کا غلبہ نہیں، بلکہ ایک ایسی دنیا کی تشکیل ہے جہاں دولت طاقتوروں کی میراث نہ ہو، جہاں قانون مصلحت پر مبنی نہ ہو، جہاں علم فروخت نہ کیا جائے، جہاں فرد صرف صارف (consumer) نہ ہو بلکہ خلیفۃ اللہ ہو۔ یہ وہی دنیا ہے جس کا خواب انبیاء نے دیکھا تھا اور جس کے لیے امام حسینؑ نے اپنا خون دیا تھا۔ اب یہ فیصلہ امت اور تمام مظلوم اقوام کو کرنا ہے کہ کیا وہ ان اصولوں کو فقط عبادات تک محدود رکھیں گے، یا انہیں دنیا کے نظام کا مرکز و محور بنا کر دنیا کی تاریخ کا رُخ موڑ دیں گے۔

مذہب اور دین کے درمیان فرق کو جب عقیدے اور نظام کے تناظر میں دیکھا جائے تو ایک گہرا تمدنی شعور سامنے آتا ہے۔ مذہب عموماً انفرادی عقیدے، رسوم و رواج، عبادات اور اخلاقی تعلیمات کے ایک مجموعے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ انسان اور خدا کے درمیان ایک روحانی رشتہ قائم کرتا ہے، لیکن اکثر اسے ذاتی، نجی اور غیر سیاسی دائرہ کار تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، "دین" نہ صرف عقیدہ اور عبادت کو شامل کرتا ہے بلکہ اس کی توسیع زندگی کے تمام اجتماعی معاملات تک ہوتی ہے۔ دین ایک ایسا تصور ہے جو صرف روح کی پاکیزگی تک محدود نہیں بلکہ معیشت، سیاست، عدل، تعلیم، قانون، جنگ و امن، اور حتیٰ کہ بین الاقوامی تعلقات تک کو اپنے اصولوں کے تحت منظم کرتا ہے۔ دین، دراصل، عقیدے کو نظام کی صورت میں ڈھالتا ہے۔

اسلام، جب خود کو "دین" کے طور پر متعارف کرواتا ہے، تو اس کا مطلب محض ایک مذہبی تجربہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہوتا ہے۔ اس دین کی اساس توحید ہے، اس کی روح عدل ہے، اور اس کا ہدف انسان کی فلاح و نجات۔ جب اسلام کو صرف "مذہب" کے خانے

میں قید کر دیا جاتا ہے تو وہ صرف چند عبادات اور انفرادی اخلاقیات تک محدود ہو جاتا ہے، اور پھر اس کے نظامی پہلو، یعنی سیاسی عدل، معاشی مساوات، اجتماعی قیادت، عالمی انصاف اور تمدنی اقدار پسِ پشت چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مغرب نے اسلام کو "مذہب" کے طور پر قبول کر لیا مگر "دین" کے طور پر چیلنج سمجھا، کیونکہ دین ایک ایسا وجود ہے جو اپنی فکری، قانونی اور عملی صورت میں کسی اور نظام کے ساتھ مصالحہ نہیں کرتا۔

لہٰذا اگر ہم عقیدے کو صرف مذہبی وابستگی اور نظام کو صرف سیکولر نظم سمجھیں تو ہم دین کی جامعیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دین ان دونوں کے درمیان ایک پل بناتا ہے، جس میں عقیدہ قلب کو سنوارتا ہے اور نظام معاشرے کو۔ دین صرف مسجد کی چٹائی یا عبادت گاہ کی دیواروں تک محدود نہیں، بلکہ وہ قانون ساز ادارے، مالیاتی نظام، عدلیہ، میڈیا، تعلیم اور معیشت کو بھی اپنے نور سے منور کرتا ہے۔ یہی وہ شعور ہے جس کے بغیر نہ تو ہم دین کو سمجھ سکتے ہیں، نہ نظام کو بدل سکتے ہیں، اور نہ انسان کو آزاد کر سکتے ہیں۔

پس، اگر انسانیت کو فکری غلامی، معاشی جبر اور روحانی خلا سے نجات دینی ہے تو مذہب کو دین کے درجے تک لانا ہو گا، اور عقیدے کو نظام کی صورت میں نافذ کرنا ہو گا۔ یہی وہ اختتام نہیں بلکہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے ایک نئی دنیا کی تعمیر ممکن ہے — ایک ایسی دنیا جو سچائی، عدل اور توحید پر قائم ہو، اور جہاں انسان صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہو، کسی طاقت، نظام یا تہذیب کے سامنے نہیں۔

آزاد خیالی (فری تھنکنگ) کا مغالطہ

فری تھنکنگ ایک ایسا تصور ہے جس کے بارے میں سننے میں یہ گمان ہوتا ہے کہ انسان تمام رکاوٹوں، دباؤ، عقائد اور معاشرتی بندشوں سے آزاد ہو کر سوچتا ہے، یعنی ایک ایسی فکر جو کسی مذہب، روایت، اتھارٹی یا روایتی علم سے بندھی نہ ہو۔ لیکن کیا ایسی "آزاد" سوچ ممکن ہے؟ یہ سوال خود اپنی نوعیت میں فری تھنکنگ کے تصور کو ایک امتحان میں ڈال دیتا ہے، کیونکہ انسان کا ذہن مکمل طور پر "خالی" یا "نیوٹرل" ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی نہ کسی سیاق، ماحول، تجربے، وراثت یا نفسیاتی ساخت میں بسا ہوتا ہے۔

نفسیاتی سطح پر فری تھنکر کو ایک ایسا فرد تصور کیا جاتا ہے جو رسمی تعلیم، مذہبی تعلیمات یا ثقافتی بندشوں سے ہٹ کر سوچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ انسانی ذہن ایک "ٹیبولا رازا" (خالی سلیٹ) نہیں ہوتا۔ وہ بچپن سے ہی لاشعوری طور پر اپنے والدین، معاشرے، تعلیم، مذہب، میڈیا، اور تجربات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک شخص جب دعویٰ کرتا ہے کہ وہ "فری تھنکر" ہے، تو درحقیقت وہ ایک مخصوص تناظر سے آزاد ہو کر کسی دوسرے تناظر میں داخل ہو چکا ہوتا ہے، جسے وہ "غیر متعصب" سمجھتا ہے، مگر وہ بھی تعصب ہی کی ایک شکل ہوتی ہے، البتہ شاید زیادہ شعوری یا جدید لبادے میں۔ مثال کے طور پر ایک شخص مذہبی عقائد سے بیزار ہو کر سائنس یا سیکولرازم کی جانب مائل ہوتا ہے،

تو وہ مذہب سے آزادی حاصل کر کے سائنس کے فریم میں داخل ہو چکا ہوتا ہے، جو بذاتِ خود ایک نظامِ فکر ہے جس میں مخصوص اعتقادات اور حدود پائی جاتی ہیں۔

نفسیاتی طور پر فری تھنکر عموماً وہ افراد ہوتے ہیں جن میں authority سے بغاوت (rebellion against authority)، تجسس(intellectual curiosity) ، خودمختاری (autonomy) اور بعض اوقات narcissism یا superiority complex کی جھلک ہوتی ہے۔ یہ لوگ کسی بھی اجتماعی یا موروثی عقیدے کو ماننے سے پہلے اسے عقل، تجربہ یا سائنسی معیار پر پرکھنا چاہتے ہیں، مگر اسی عمل میں وہ کبھی کبھار اپنی انا کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ وہ خود کو ان افراد سے برتر سمجھنے لگتے ہیں جو روایت یا مذہب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک نئے طرح کے نفسیاتی تعصب یا cognitive bias کا شکار ہو جاتے ہیں جسے "rational superiority complex" کہا جا سکتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بات ان کی عقل کو سمجھ نہیں آتی، وہ جھوٹ یا غیر علمی ہے۔ حالانکہ انسانی عقل بذاتِ خود محدود ہے، اور یہ محدود عقل فری تھنکنگ کے دعوے کو مشکوک بناتی ہے۔

اب اگر ہم نیچر، یعنی فطرت کے تناظر میں فری تھنکنگ کو دیکھیں، تو ایک اہم حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ نیچر بذاتِ خود ایک قانون، توازن اور جبر کی مثال ہے۔ کائنات میں کوئی بھی شے بغیر حدود، قوانین یا اصولوں کے نہیں چلتی۔ ایک درخت کو زمین، پانی، ہوا اور سورج کی روشنی کی ضرورت ہے۔ پرندے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر مخصوص موسم میں

ہجرت کرتے ہیں۔ زلزلے، ہوائیں، بارشیں، سب ایک الٰہی ترتیب اور ضابطے کے تابع ہیں۔ اسی طرح انسانی فطرت بھی کچھ لازمیاتی (deterministic) اصولوں سے جڑی ہے۔ اسے بقا، تعلق، محبت، تحفظ اور معنویت کی طلب ہے۔ اگر کوئی شخص ان فطری جذبات سے مکمل آزاد ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ انسان نہیں، ایک غیر حقیقی تصور ہے۔

اسی فطری اصول کی روشنی میں، فری تھنکنگ بذاتِ خود فطرت سے بغاوت کا دعویٰ بن جاتی ہے۔ کیونکہ فطرت کی ساخت ہی ایسی ہے جو انسان کو ایک حیاتیاتی، جذباتی اور روحانی نظام کا حصہ بناتی ہے۔ انسان جب فری تھنکنگ کے نام پر کسی ایسے خیال کو اپناتا ہے جو فطرت کے اس نظام سے ہم آہنگ نہیں، تو وہ داخلی تضاد اور الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کا دل کچھ کہتا ہے، عقل کچھ اور اور معاشرہ کسی اور سمت اشارہ کرتا ہے۔ نتیجہ ایک نفسیاتی انتشار اور ہویّت (identity) کا بحران بن جاتا ہے۔ فری تھنکر اکثر existential anxiety اور inner emptiness کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ وہ روایت سے الگ ہو کر جس آزادی کا تجربہ کرتے ہیں، وہ ایک سنسان صحرا کی مانند ہوتی ہے جہاں سمت کا تعین دشوار ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فری تھنکنگ ایک دلکش مگر نفسیاتی، فطری اور علمی اعتبار سے غیر حقیقی تصور ہے۔ انسان نہ مکمل طور پر آزاد ہے اور نہ مکمل طور پر مجبور۔ وہ مختلف حوالوں، تجربات اور فطری میلانات کے درمیان ایک توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ "فری تھنکنگ" کے نام پر فطرت، حقیقت یا شعور سے بغاوت کرتا ہے، تو وہ درحقیقت ایک نئی قید میں داخل ہو جاتا ہے — ایسی قید جو خود ساختہ اور زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ

مکمل آزادی صرف خدا کے لئے ہے، انسان کے لیے نہیں۔ انسان کی اصل آزادی اُس کے اپنی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے میں ہے، نہ کہ اُس سے بغاوت میں۔

اسلامی ایران کی ترقی کے اسباب اور غریب ممالک کیلئے نمونہ

ایران کی موجودہ اقتصادی اور سماجی صورتحال، خصوصاً مغربی دنیا کی شدید اقتصادی پابندیوں کے باوجود، ایک پیچیدہ مگر قابلِ غور ماڈل پیش کرتی ہے۔ دنیا بھر میں جب کسی ملک پر ایسی سخت پابندیاں عائد کی جاتی ہیں جن کی زد میں اس کی کرنسی، بینکاری نظام، درآمد وبرآمد، اور عالمی منڈی سے روابط آتے ہیں، تو عموماً ایسے ملک کے عوام کو بدترین معاشی مشکلات، قحط، بے روزگاری اور فاقہ کشی کا سامنا ہوتا ہے۔ لیکن ایران کے بارے میں عمومی مشاہدہ یہ ہے کہ نہ صرف وہاں کا انفراسٹرکچر فعال اور ترقی یافتہ ہے، بلکہ روزمرہ زندگی میں فقر، فاقہ اور بے ترتیبی وہ انداز نہیں رکھتی جو عالمی تجزیات کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس تضاد کی بنیاد سمجھنے کے لیے ایران کے اندرونی معاشی، نظریاتی، انتظامی اور ثقافتی نظام کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایران کی معیشت میں خود کفالت کا نظریہ ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ انقلابِ اسلامی (1979) کے بعد سے ہی ایران نے مغرب پر انحصار ترک کرنے اور اپنے اندرونی وسائل کو ترقی دینے کی حکمت عملی اختیار کی۔ "اقتصادِ مقاومتی" یعنی Resilient Economy کا ماڈل دراصل اسی فلسفے کا تسلسل ہے۔ یہ ماڈل نہ صرف مقامی پیداوار کو فروغ دیتا ہے بلکہ معیشت کو غیر ملکی دباؤ سے محفوظ رکھنے کے طریقے بھی سکھاتا ہے۔ ایران نے زراعت،

بنیادی صنعتوں، معدنیات، تیل و گیس کی پیداوار اور دیگر کلیدی شعبوں میں اپنی تکنیکی اور انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر انحصار کو کم سے کم کر دیا ہے۔

ایران ایک وسیع قدرتی وسائل سے مالا مال ملک ہے۔ تیل، گیس، سونا، تانبہ، لوہا، یورینیم اور دیگر قیمتی معدنیات کی بدولت ایران کے پاس نہ صرف مالیاتی طاقت موجود ہے بلکہ برآمدی طاقت بھی حاصل ہے، اگرچہ یہ عالمی پابندیوں کی وجہ سے محدود ہو چکی ہے۔ لیکن ایران نے ان برآمدات کو علاقائی سطح پر چین، بھارت، ترکی، روس، عراق اور دیگر ہمسایہ ممالک کے ساتھ متبادل اقتصادی راستوں کے ذریعے جاری رکھا ہے۔ حتیٰ کہ غیر روایتی طریقوں، جیسے بارٹر ٹریڈ، مقامی کرنسیوں میں لین دین، اور درمیانی ملکوں کے ذریعے تجارت نے ایران کی معیشت کو مکمل مفلوج ہونے سے بچائے رکھا۔

ایک اور اہم پہلو ایران کے اندرونی نظامِ حکومت اور عوامی طرزِ زندگی سے متعلق ہے۔ ایران میں ریاست کی سطح پر جو خدمات عوام کو مہیا کی جاتی ہیں، وہ بہت حد تک سبسڈی پر مبنی ہیں۔ تعلیم، صحت، بجلی، گیس، پانی، حتیٰ کہ آٹا، چینی، ایندھن اور دیگر بنیادی ضروریات پر حکومت کی جانب سے سبسڈی دی جاتی ہے۔ ایران کی حکومت نے معیشت میں سرکاری مداخلت کو سماجی فلاح و بہبود کے لیے ایک اوزار کے طور پر استعمال کیا ہے، نہ کہ صرف منافع کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے سخت معاشی حالات میں بھی عوامی ضروریات کو ترجیح دی۔

اس کے ساتھ ہی، ایرانی قوم کی اجتماعی ثقافت اور مذہبی نظریات نے ایک خاص طرز کی مزاحمتی ذہنیت پیدا کی ہے۔ ایران میں قوم پرستی اور مذہبی ولولہ اس قدر گہرا ہے کہ عوام سختیوں کو برداشت کرنے کو فخر سمجھتے ہیں۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ وہ ایک عظیم مقصد کے لیے، ایک عالمی استکباری نظام کے خلاف نبرد آزما ہیں، اور اس راہ میں تکلیف برداشت کرنا ایک قربانی ہے۔ اسی ذہنیت نے ایک ایسی اجتماعی نظم پیدا کی ہے جس میں فقر و فاقہ کو چھپایا نہیں گیا، بلکہ اس کا سامنا کرتے ہوئے ایک باوقار زندگی کی طرف قدم بڑھایا گیا ہے۔

ایران میں فلاحی اداروں، خیراتی تنظیموں اور مذہبی بنیادوں پر قائم کمیونٹی نیٹ ورکس کی بہتات بھی اس سماجی ہم آہنگی کو ممکن بناتی ہے۔ امامیہ کمیٹیاں، مسجدی نیٹ ورک، بسیج فورسز اور دیگر تنظیمیں روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل، تعلیم، خوراک، رہائش اور روزگار کے انتظام میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ سب حکومتی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہیں، اور بسا اوقات وہاں بھی پہنچتے ہیں جہاں حکومتی ہاتھ نہیں پہنچتا۔

یہ تمام عوامل ایران کے اس منفرد ماڈل کو تشکیل دیتے ہیں جو مغربی سرمایہ دارانہ ماڈل سے مختلف ہے۔ ایران نے آئی ایم ایف، ورلڈ بینک، ڈبلیو ٹی او یا نیو لبرل اکنامک آرڈر جیسے اداروں یا اصولوں کی پیروی نہیں کی، بلکہ ایک ایسی معیشت کو پروان چڑھایا جو نظریاتی بنیاد پر قائم ہے، جس کی جڑیں مقامی وسائل، قومی وقار، اور خود کفالت پر ہیں۔

نتیجتاً، ایران میں کرنسی کی قدر گرنے، مہنگائی کی بلند شرح، اور بین الاقوامی تجارت میں مشکلات کے باوجود ایک ایسا معاشرہ قائم ہے جہاں عوام کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی ہیں، انفراسٹرکچر فعال ہے، اور غربت کا وہ نمایاں منظر نہیں دکھائی دیتا جو عام طور پر ایسے ممالک میں دیکھنے کو ملتا ہے جو عالمی نظام سے باہر ہوں۔ یہ ماڈل اگرچہ ہر ملک کے لیے قابلِ تقلید نہیں، مگر اس نے یہ ضرور ثابت کر دیا ہے کہ عالمی معاشی نظام سے الگ بھی ایک خود مختار، فعال اور باعزت قومی زندگی ممکن ہے — اگر اس کے پیچھے نظریہ، نظم اور قربانی کا جذبہ ہو۔

ایران کی معیشت میں ایک اور غیر معمولی پہلو اس کی کرنسی کی صورتحال ہے۔ ریال، جو ایرانی کرنسی ہے، عالمی منڈی میں شدید زوال کا شکار رہی ہے۔ ڈالر کے مقابلے میں اس کی قدر میں مسلسل کمی واقع ہوئی ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات افراطِ زر نے غیر معمولی حدیں عبور کیں۔ لیکن اس کے باوجود ایران میں روزمرہ کی زندگی کسی ایسے بحران سے دوچار نہیں دکھائی دیتی جو عموماً کرنسی کے انہدام کے بعد نمودار ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب ایران کے داخلی مالیاتی اور اقتصادی نظام کی ساخت، حکومتی پالیسیوں، اور عوامی رویّے میں پوشیدہ ہے۔

پہلی بات جو سمجھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایران کی معیشت "ڈالرائزڈ" نہیں ہے، یعنی وہاں کی معیشت عام طور پر ڈالر پر نہیں چلتی۔ عوامی لین دین، تنخواہیں، اشیائے ضرورت کی خرید و فروخت، تمام کچھ مقامی کرنسی یعنی ریال یا تومان میں ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے

کہ اگرچہ بین الاقوامی سطح پر ریال کی قدر گرتی ہے، لیکن داخلی نظام میں اس کا فوری اور شدید اثر ہر جگہ نہیں پہنچتا۔ جب کسی ملک کی معیشت جزوی یا مکمل طور پر ڈالر پر انحصار کرتی ہے تو کرنسی کی قدر میں معمولی سی تبدیلی بھی عام آدمی کی جیب پر براہ راست اثر ڈالتی ہے، جیسا کہ پاکستان، لبنان یا بعض افریقی ممالک میں دیکھا گیا ہے۔ ایران نے اس انحصار کو کم سے کم رکھا ہے، یہاں تک کہ بعض عالمی مالیاتی نظاموں سے خود کو عملاً علیحدہ کر لیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ایرانی حکومت نے کرنسی کے بحران سے بچاؤ کے لیے ایک متوازی زرِمبادلہ کا نظام قائم کیا ہے۔ ایک طرف باضابطہ بینکنگ چینلز کے ذریعے حکومت اپنی کرنسی کو ایک مخصوص حد میں رکھتی ہے، اور دوسری طرف غیر رسمی منڈیوں میں کرنسی کی قیمت اپنی جگہ پر چلتی ہے۔ اس سے اگرچہ ایک نوع کی تضاد پیدا ہوتی ہے، لیکن اس تضاد کو حکومت نے سماجی سطح پر اثر انداز ہونے سے روکے رکھا ہے۔ اس حکمتِ عملی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ضروری اشیاء، جن کی قیمتیں حکومت مقرر کرتی ہے یا جن پر سبسڈی دیتی ہے، وہ افراطِ زر کی لپیٹ میں نہیں آئیں، یا آئیں بھی تو ایک محدود حد تک۔ چنانچہ ایک عام ایرانی شہری کی روزمرہ کی خریداری اور بنیادی اخراجات براہِ راست عالمی کرنسی منڈی کی اُتار چڑھاؤ سے متاثر نہیں ہوتے۔

ایران کی حکومت نے کرنسی کی گرتی ہوئی قدر کا حل صرف شرحِ تبادلہ کو سنبھالنے میں نہیں تلاش کیا بلکہ اس کے لیے معیشت کے اندرونی ڈھانچے کو مستحکم بنانے کی کوشش کی۔ مثلاً مقامی پیداوار کو فروغ دے کر درآمدات پر انحصار کم کیا، تاکہ بیرونی کرنسی کی طلب کم

سے کم ہو۔ جہاں تک ممکن ہو، ایران نے اپنی ضروریات کی اشیاء کو مقامی سطح پر تیار کرنے کو ترجیح دی، خواہ وہ ادویات ہوں، گاڑیاں، الیکٹرانکس، یا زراعت۔ اس خود کفالت نے بیرونی کرنسی پر انحصار کو محدود کر دیا، اور اس کے نتیجے میں داخلی کرنسی کی زوال پذیری کے اثرات بھی محدود ہو گئے۔

اس کے ساتھ ہی، ایرانی قوم نے کرنسی کے بحران کو ایک قومی آزمائش کے طور پر قبول کیا۔ جہاں دوسری اقوام مہنگائی اور کرنسی کے مسائل کو صرف حکومت کی ناکامی تصور کرتی ہیں، وہاں ایران میں اس کو عالمی سامراجی قوتوں کی سازش سمجھا جاتا ہے۔ عوامی ذہن میں یہ بات جاگزیں ہے کہ کرنسی کی قدر میں کمی ان کی کسی اندرونی کوتاہی کا نتیجہ نہیں بلکہ مغرب کی طرف سے عائد کی جانے والی ایک اقتصادی جنگ کا حصہ ہے۔ اس سوچ نے عوام کو ذہنی طور پر تیار رکھا ہے کہ وہ وقتی مہنگائی یا کرنسی کے اتار چڑھاؤ کو ایک اجتماعی قربانی کے طور پر برداشت کریں۔

ایران نے کرنسی کے بحران سے نمٹنے کے لیے سونے، زمین اور دیگر غیر نقد اثاثوں کو ایک متبادل مالی تحفظ کے طور پر فروغ دیا ہے۔ عوام کی بچتوں کو ان اشکال میں محفوظ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے اپنے سرمایہ کو صرف بینک نوٹوں یا غیر مستحکم ریال میں رکھنے کے بجائے دیگر محفوظ اور قیمتی شکلوں میں محفوظ رکھا۔ اس سے بھی معیشت میں استحکام پیدا ہوا، کیونکہ panic selling اور کرنسی کی بڑے پیمانے پر تبدیلی کی لہر پیدا نہیں ہوئی۔

بین الاقوامی سطح پر ایران نے کرنسی کے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے دوطرفہ معاہدات، بارٹر سسٹم، مقامی کرنسیوں میں لین دین، اور کرپٹو کرنسی جیسے متبادل ذرائع پر تجربات شروع کیے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کو مکمل کامیابی نہیں ملی، لیکن ان سب نے مجموعی طور پر ایک ایسا ماحولیاتی نظام پیدا کیا ہے جس نے کرنسی کے بحران کو "قومی بحران" بننے سے روک دیا۔

یوں، ایران کا کرنسی ماڈل ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جب کسی ملک کا مالیاتی، تجارتی اور ثقافتی نظام ایک نظریاتی بنیاد پر استوار ہو، جب معیشت صرف منافع یا شرحِ نمو کے گرد نہ گھومتی ہو بلکہ خود کفالت، مزاحمت اور عدل کے اصولوں پر کھڑی ہو، تو پھر کرنسی کے زوال کی شدت بھی معاشرے کو گرا نہیں سکتی۔ یہ ماڈل اس بات کی دلیل ہے کہ کرنسی کی قدر محض عددی یا مالیاتی حقیقت نہیں بلکہ ایک قومی ارادہ، مزاحمتی شعور، اور انتظامی حکمت کا مظہر بھی ہو سکتی ہے۔

تیسری دنیا کی معیشت کا جائزہ لیں تو اس اصول کو ماننا ہو گا کہ عوامی فلاح کا تصور صرف معاشی آسودگی یا بنیادی سہولیات کی دستیابی تک محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ہمہ گیر نظامِ حیات سے جُڑا ہوا تصور ہے جس میں انسانی وقار، معاشرتی انصاف، مساوی مواقع، اور روحانی سکون سب شامل ہوتے ہیں۔ جب ہم یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا ایران جیسے ماڈل سے عوامی فلاح حاصل ہو سکتی ہے تو ہمیں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایران نے محض ایک

معاشی ماڈل نہیں اپنایا بلکہ ایک فکری، تہذیبی، اور انقلابی راستہ اختیار کیا ہے جس کی جڑیں اسلامی تعلیمات اور نظریاتی خود انحصاری میں پیوست ہیں۔

ایران نے عالمی سرمایہ دارانہ اور صہیونی کنٹرول والے نظام سے الگ ہو کر جو ماڈل اپنایا، وہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں معیشت کو عوام کی خدمت کے ایک وسیلے کے طور پر دیکھا گیا نہ کہ صرف منافع کے ایک آلہ کے طور پر۔ جب کوئی ریاست اپنی معیشت کو ایسی بنیاد پر کھڑا کرتی ہے جہاں دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں نہ ہو بلکہ اسے تقسیم کیا جائے، جہاں تعلیم، صحت، پانی، بجلی، گیس جیسی بنیادی سہولیات پر منافع کے بجائے خدمت کا اصول لاگو ہو، وہاں عوامی فلاح کا بیج بونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایران میں کئی عشروں سے غربت کی سطح کو قابو میں رکھا گیا ہے، اور بنیادی خدمات حتیٰ المقدور سہ مبسہ مڈی اور آسان دسترسی کے ذریعے عوام کو مہیا کی گئی ہیں۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ محدود وسائل اور عالمی دباؤ کے باوجود ایک ملک اگر چاہے تو ایک ایسا نظام قائم کر سکتا ہے جس میں عوام کا درد مرکزی حیثیت رکھتا ہو۔

ایران کے اس ماڈل کا ایک نمایاں پہلو خود کفالت ہے، جس کا مطلب ہے کہ ریاست اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خارجی قوتوں کی محتاج نہ ہو۔ جب کوئی ملک اپنی خوراک، توانائی، ادویات، تعلیم اور تحقیق جیسے اہم شعبوں میں خود مختار ہوتا ہے تو اس کے اثرات سیدھے عوام تک پہنچتے ہیں۔ نہ صرف قیمتیں مستحکم رہتی ہیں بلکہ عالمی منڈی کی بے رحمی اور مفاد پرستی سے بھی عوام محفوظ رہتے ہیں۔ ایران نے اس خود انحصاری کو نہ صرف اپنی

معیشت میں نافذ کیا بلکہ اس کے پیچھے ایک نظریاتی فہم بھی مہیا کیا، جو عوام میں مزاحمتی ذہنیت پیدا کرتا ہے۔ ایسی ذہنیت جس میں تکلیف کو قربانی سمجھا جاتا ہے، جس میں قناعت اور غیرت کی قدریں سرمایہ داری کی حرص اور نمود و نمائش پر غالب آتی ہیں۔

عوامی فلاح کے ایک اور اہم ستون کی حیثیت ایران میں سماجی تنظیموں، فلاحی اداروں اور مذہبی نیٹ ورک کو حاصل ہے۔ حکومت اکیلی تمام مسائل کا حل پیش نہیں کرتی بلکہ معاشرے کی سطح پر تنظیمی ڈھانچے کو فعال بنایا گیا ہے۔ بسیج، کمیٹیاں، مسجدی نیٹ ورک، اوقاف، اور اہلِ خیر حضرات کی مدد سے ایک ایسا سماجی تعاون وجود میں آیا ہے جو فقر، بیماری، بیروزگاری یا دیگر بحرانوں میں عوام کو سہارا دیتا ہے۔ اس طرح عوامی فلاح صرف حکومت کی طرف سے مسلط کردہ نہیں بلکہ معاشرے کے اندر سے اٹھنے والی ایک طاقت بنتی ہے۔ یہی چیز سرمایہ دار معاشروں میں مفقود ہے، جہاں ہر فرد کو نظام کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

ایران کے ماڈل سے ہمیں یہ بھی سیکھنے کو ملتا ہے کہ عوامی فلاح کا حصول صرف مالیاتی پالیسیوں سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے ایک مضبوط ثقافتی اور اعتقادی اساس بھی ضروری ہے۔ ایران میں اہل بیتؑ کی تعلیمات، قرآنی اصول، اور اسلامی انقلاب کی روح کو نہ صرف حکومت بلکہ عوامی شعور میں بھی جگہ دی گئی ہے۔ یہی شعور عوام کو مشکل حالات میں بھی ایک مقصد کے ساتھ جینے کی طاقت دیتا ہے۔ جہاں مغربی دنیا میں فلاح کا مطلب

صرف دولت کی بہتات اور ذاتی آسائش ہے، وہاں ایران جیسے نظام میں فلاح کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو باعزت زندگی، بنیادی ضروریات، اور ایک اعلیٰ مقصد میسر ہو۔

یقیناً اس ماڈل میں کمزوریاں بھی ہیں، خامیاں بھی اور چیلنجز بھی۔ مہنگائی، بیروزگاری، یا حکومتی بدانتظامی جیسے مسائل سے ایران بھی مکمل محفوظ نہیں ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ان مسائل کا حل اس فکری دائرے کے اندر تلاش کیا جاتا ہے جو عوامی فلاح کو مرکزی حیثیت دیتا ہے، نہ کہ وہ عالمی ماڈل جہاں سرمایہ، سود اور کرپشن کی بالادستی ہو۔

اگر اسلامی ممالک واقعی ایران جیسے ماڈل کو اپنائیں تو وہ نہ صرف عالمی معاشی غلامی سے نکل سکتے ہیں بلکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں جہاں دولت اور اختیار چند خاندانوں یا ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ عوام کے نفع کے لیے کام کر رہا ہو۔ ایسے نظام میں نہ صرف روٹی، کپڑا، مکان مہیا ہو سکتا ہے بلکہ عزت، غیرت، اور شعور بھی پروان چڑھتا ہے۔ عوامی فلاح کا یہی وہ جامع تصور ہے جس کی تلاش میں دنیا سرگرداں ہے، اور جو اسلامی اصولوں میں نہایت فطری انداز سے موجود ہے، بشرطیکہ اسے عملی طور پر نافذ کرنے کی جرأت کی جائے۔

آج کی دنیا میں بیشتر اسلامی ممالک ایک ایسے عالمی اقتصادی نظام کا حصہ بن چکے ہیں جو نہ صرف سرمایہ دارانہ اصولوں پر قائم ہے بلکہ اپنی گہرائی میں صہیونی مفادات کے زیرِ اثر بھی ہے۔ یہ نظام مرکزی طور پر امریکی ڈالر کی بالادستی، سودی مالیاتی اداروں، عالمی بینک، آئی

ایم ایف، اور ان جیسے اداروں کے جال پر قائم ہے۔ ان اداروں کے ذریعے صرف مالیاتی کنٹرول نہیں ہوتا، بلکہ سیاسی اور ثقافتی غلامی کی بنیادیں بھی مضبوط کی جاتی ہیں۔ اسلامی ممالک، جو اپنی تہذیب، مذہب اور فطری وسائل کے اعتبار سے خود کفیل ہوسکتے ہیں، اس نظام میں اس طرح الجھ چکے ہیں کہ انہیں اپنا حقیقی راستہ کھوجنے میں شدید دشواری پیش آتی ہے۔ اگر یہ ممالک واقعی اس صہیونی-سرمایہ دارانہ نظام سے علیحدگی اور آزادی چاہتے ہیں تو انہیں ایک ہمہ جہت، تدریجی مگر نظریاتی طور پر مضبوط منصوبہ بندی اپنانی ہوگی۔

سب سے پہلا مرحلہ ذہنی و فکری آزادی کا ہے۔ جب تک کسی قوم کی قیادت اور عوام اپنے ذہن میں یہ تصور نہ پیدا کریں کہ موجودہ اقتصادی نظام ایک زنجیر ہے، اور اس سے نجات ممکن اور ضروری ہے، تب تک کسی بھی عملی قدم کی بنیاد مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اسلامی معاشروں میں قرآنی و نبوی تعلیمات کی روشنی میں ایک "عدالت محور" معیشت کی ضرورت کو اجاگر کرنا ہوگا جو سود سے پاک، ذخیرہ اندوزی سے آزاد، اور دولت کی عادلانہ تقسیم پر قائم ہو۔ اس کے لیے تعلیم کے میدان سے آغاز ضروری ہے تاکہ نئی نسل سرمایہ دارانہ فکر کو تقدس کا درجہ دینے کے بجائے اسے ایک استعماری حربہ سمجھے۔

اس کے بعد معاشی خود کفالت کی طرف سفر کا آغاز ہوتا ہے۔ اسلامی ممالک کو اپنے وسائل کو پہچاننا، ان پر انحصار بڑھانا، اور پیداواری نظام کو مقامی ضروریات کے مطابق استوار کرنا ہوگا۔ موجودہ درآمدی نظام، جہاں ہر شے مغرب سے آتی ہے اور اس کے بدلے ملک کی کرنسی اور خود مختاری نکل جاتی ہے، اسے ختم کرکے مقامی صنعت، زراعت، دواسازی اور

ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ایک نئی معیشت تعمیر کرنا ہوگی۔ یہ کام یکدم نہیں ہوگا، لیکن اگر نیت خالص اور منصوبہ بندی عملی ہو تو پانچ تا دس سال میں نمایاں نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

تیسرا اہم مرحلہ مالیاتی نظام کی اصلاح ہے۔ سود پر قائم بینکاری نظام نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ عالمی اقتصادی غلامی کا سب سے مضبوط ہتھیار بھی ہے۔ اسلامی ممالک کو چاہیے کہ وہ سود سے پاک مالیاتی ادارے قائم کریں، زکوٰۃ، خمس، وقف، اور قرضِ حسن جیسے قرآنی اصولوں پر مبنی معیشت کو فروغ دیں، اور ایسے ماڈل اپنائیں جو عوامی فلاح پر مبنی ہوں نہ کہ منافع پر۔ ایران اور بعض دیگر ممالک نے اس راہ میں ابتدائی کوششیں کی ہیں، لیکن ایک جامع، ریاستی سطح کی تحریک کی ضرورت ہے تاکہ ایک نیا مالیاتی ڈھانچہ کھڑا کیا جا سکے۔

اس کے ساتھ ہی کرنسی کے مسئلے پر توجہ دینا ناگزیر ہے۔ ڈالر پر انحصار اسلامی ممالک کو عالمی معیشت کی غلامی میں جکڑنے کا سب سے طاقتور ذریعہ ہے۔ اس انحصار کو ختم کرنے کے لیے بین الاقوامی تجارت میں مقامی کرنسیوں کا استعمال، دوطرفہ یا علاقائی کرنسی بلاکس کی تشکیل، اور بارٹر سسٹم جیسے متبادل ذرائع کو اپنانا ہوگا۔ اس حوالے سے مسلم ممالک کا ایک مالیاتی بلاک، مشترکہ اسلامی کرنسی، یا ڈیجیٹل کرنسی پر مبنی متبادل نظام بھی قابلِ غور ہے، بشرطیکہ وہ سود، استحصال اور قیاس پر مبنی نہ ہو بلکہ شریعت کی بنیادوں پر استوار ہو۔

اسلامی ممالک کو اپنے باہمی اقتصادی روابط کو بھی از سرِ نو ترتیب دینا ہوگا۔ آج یہ ممالک ایک دوسرے کے ساتھ تجارت سے زیادہ مغربی طاقتوں کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ جب

تک مسلم دنیا ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرے گی، جب تک ہم ایران، ترکی، انڈونیشیا، پاکستان، سعودی عرب، مصر، الجزائر، اور دیگر ممالک کے درمیان مالیاتی اور تجارتی اتحاد نہیں بنائیں گے، تب تک ہم مغرب کے معاشی شکنجے سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ یہ اتحاد صرف مفادات کی بنیاد پر نہیں بلکہ امتِ واحدہ کے تصور اور باہمی خود انحصاری پر مبنی ہونا چاہیے۔

اس پورے عمل میں سب سے زیادہ اہم عنصر قیادت کا ہے۔ جب تک اسلامی دنیا میں وہ قیادت پیدا نہیں ہوتی جو نبی اکرم ﷺ، امام علیؑ، یا امام خمینیؒ جیسا عزم، فہم اور روحانی شعور رکھتی ہو، یہ تبدیلی ناممکن رہے گی۔ موجودہ قیادتیں یا تو مغرب کے سامنے جھکی ہوئی ہیں یا اندرونی کرپشن اور مفادات میں الجھی ہوئی ہیں۔ ایک نئے فکری انقلاب کی ضرورت ہے جو عوام کو بیدار کرے، نظریاتی بنیاد پر سیاسی تبدیلی لائے، اور معیشت کو دوبارہ دین کے تابع کرے، نہ کہ دین کو معیشت کا تابع بنا دے۔

اس جدوجہد کا راستہ آسان نہیں ہے۔ مغرب اور اس کے آلہ کار ممالک، ادارے، میڈیا، اور حتیٰ کہ بعض داخلی طبقات اس تبدیلی کی شدید مزاحمت کریں گے۔ لیکن اگر اسلامی ممالک نے اس صہیونی اقتصادی نظام سے نجات حاصل کر لی، تو نہ صرف وہ معاشی آزادی حاصل کریں گے، بلکہ عالمی سطح پر ایک نیا، متوازن، اور انسانی اصولوں پر مبنی اقتصادی نظام متعارف کرا سکیں گے۔ یہ صرف ایک سیاسی یا اقتصادی جنگ نہیں بلکہ تہذیبی اور روحانی بقاء کی جنگ ہے، جس میں کامیابی امت کی آزادی اور ذلت کے درمیان فرق متعین کرے گی۔

اقوام کا عروج وزوال

قوموں کے عروج وزوال کی داستان محض تاریخ کا قصہ نہیں بلکہ انسانی شعور، اقدار، ایمان، سیاست اور تمدن کی مسلسل آزمائش کا نام ہے۔ کوئی قوم کیسے اٹھتی ہے، کیسے گرتی ہے، اور کس بنیاد پر اس کے عروج وزوال کا فیصلہ کیا جاتا ہے، یہ سوالات صرف مورخ کے لیے اہم نہیں بلکہ ہر باشعور فرد، ہر ذمہ دار رہنما اور ہر دیندار انسان کے لیے بنیادی نوعیت رکھتے ہیں۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے دنیاوی اور اخروی دونوں زاویہ ہائے نگاہ سے تجزیہ ضروری ہے، کیونکہ ایک محض ظاہر کو دیکھتا ہے، دوسرا باطن تک رسائی چاہتا ہے۔

دنیاوی نقطہ نظر سے جب ہم کسی قوم کی ترقی یا تنزلی کی پیمائش کرتے ہیں تو ہم عموماً اقتصادی ترقی، عسکری طاقت، تعلیمی معیار، ٹیکنالوجیکل ایجادات، جغرافیائی پھیلاؤ اور سیاسی اثر و رسوخ کو بنیاد بناتے ہیں۔ اس پیمانے پر دیکھا جائے تو رومی سلطنت، مغلوں کی بادشاہی، برطانیہ کی نوآبادیاتی سلطنت، یا موجودہ چین و امریکہ کی طاقتور حیثیتیں سبھی "ترقی یافتہ" قومیں کہلاتی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا عروج صرف دولت، طاقت اور حکومت کے وسیع دائرہ اختیار سے جڑا ہوا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو فرعون، نمرود اور قارون کو تاریخ عظمت کا تاج پہناتی، حالانکہ ان کے بارے میں قرآن نے انہیں ہلاکت و ذلت کی علامت بنا کر پیش کیا ہے۔

اخروی اور الٰہی نقطہ نظر سے قوموں کے عروج وزوال کا معیار کچھ اور ہوتا ہے۔ یہاں اصل پیمانہ صرف ظاہری فتوحات نہیں بلکہ حق و باطل کے ساتھ قوم کا رشتہ ہوتا ہے۔ قوم اگر عدل قائم کرتی ہے، مظلوم کی حمایت کرتی ہے، اپنے نفس کی اصلاح کرتی ہے، اہلِ حق کی پیروی کرتی ہے، علم کو فروغ دیتی ہے، اخلاقیات کو بنیاد بناتی ہے، تو خواہ وہ دنیاوی لحاظ سے کمزور ہو، وہ خدا کے نزدیک عروج پر ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی قوم طاقت میں ہے مگر ظلم پر مبنی ہے، خواہشات کی غلام ہے، سچ سے دور اور فساد کی دلدل میں ہے تو وہ درحقیقت زوال کے آخری دہانے پر کھڑی ہے، چاہے وقتی طور پر دنیا اسے کامیاب سمجھے۔

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ قوموں کا زوال کب اور کیوں آتا ہے۔ جب وہ خدا کو بھولتی ہیں، جب ان کے اندر طبقاتی نظام اس حد تک گہرا ہو جاتا ہے کہ کمزور کچلے جاتے ہیں اور اشرافیہ عیاشی میں ڈوب جاتی ہے، جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظام مفلوج ہو جاتا ہے، جب اہل علم و اہل بصیرت کی آوازیں دبائی جاتی ہیں اور خوشامد پسند لوگ حکمران بن جاتے ہیں تو زوال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کی داستان ہو یا عاد و ثمود کی، ہر جگہ یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

اگر کسی قوم کے عروج کو صرف ٹیکنالوجی یا معیشت سے ناپا جائے تو پھر آج کی مہذب سمجھی جانے والی اقوام کو اعلیٰ ترین مقام پر ہونا چاہیے، مگر وہی اقوام اگر ظلم میں مبتلا ہیں، استعمار کو فروغ دے رہی ہیں، انسانی ضمیر کو خرید رہی ہیں، جنگوں سے فائدہ اٹھا رہی ہیں اور اخلاقی طور پر کھوکھلی ہو چکی ہیں تو وہ دراصل زوال میں ہیں، گو ان کے پاس عارضی اقتدار ہو۔

برعکس اس کے اگر کوئی قوم ظاہری لحاظ سے کمزور ہے مگر وہ ظلم کے خلاف اٹھتی ہے، حق پر ڈٹ جاتی ہے، کمزوروں کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے، اور اخلاق وروحانیت میں بلندی پر ہے تو وہ در حقیقت فلاح و کامیابی کی راہ پر ہے، اگرچہ دنیا اسے شکست خوردہ کہے۔

پس قوموں کے عروج وزوال کا اصل معیار یہ ہونا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ کیسی ہے، اپنے پیغمبروں اور اولیاء کے راستے پر ہے یا نہیں، وہ عدل و انصاف کو اپنی بنیاد بناتی ہے یا نہیں، وہ علم و دانش اور اخلاق کو اپنا زیور بناتی ہے یا صرف طاقت، دولت اور عیاشی کی پرستش کرتی ہے۔ عروج وہی ہے جو خدا کے ہاں مقبول ہو، جو انسان کو اس کی معراج تک لے جائے۔ باقی جو کچھ بھی ہے، وہ دھوکہ ہے، فریب ہے، اور عارضی روشنی ہے جو جلد ہی تاریکی میں بدل جاتی ہے۔

تاریخ ہمیں بار بار بتاتی ہے کہ وہی قومیں باقی رہتی ہیں جو اصولوں پر کھڑی ہوتی ہیں، جن کا ضمیر زندہ ہوتا ہے، اور جو عارضی مفادات کے بجائے دائمی حقائق کے ساتھ جُڑ جاتی ہیں۔ وہی قومیں وقتی زوال کے بعد بھی دوبارہ اٹھتی ہیں، کیونکہ ان کے اندر روحانی قوت اور نظریاتی استقلال ہوتا ہے۔ جبکہ وہ قومیں جو صرف دنیا کے پیمانے سے "کامیاب" ہوتی ہیں، جیسے ہی دنیا نے رُخ موڑا، وہ ریزہ ریزہ ہو گئیں۔ اس لیے معیار ہمیشہ ایسا ہونا چاہیے جو وقتی نہیں بلکہ ابدی حقیقتوں کو پیشِ نظر رکھے، اور وہی دینی، اخروی اور الٰہی نقطہ نظر ہے۔

اقوام کے عروج وزوال کی داستان دراصل انسانوں کی فکری، اخلاقی، روحانی اور تمدنی زندگی کی گہرائیوں میں چھپے ان اسباب کی تصویر ہے جو کسی قوم کو سربلندی عطا کرتے ہیں یا پستی کے گڑھے میں دھکیل دیتے ہیں۔ یہ محض خارجی عوامل یا قدرتی حوادث کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک مسلسل عمل ہوتا ہے جو قوم کے اندرونی رجحانات، اجتماعی شعور، نظامِ اقدار اور قیادت کی سمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اگر قوم کی بنیادیں فکری پختگی، عدل و انصاف، اخلاقی اصولوں، اجتماعی ہمدردی، علم و شعور اور خدا سے وابستگی پر استوار ہوں، تو وہ دیرپا عروج کی طرف بڑھتی ہے۔ لیکن جب یہی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں، تو زوال کا آغاز ہو جاتا ہے، چاہے وہ زوال بظاہر سیاسی ہو یا باطنی و روحانی۔

اقوام کا عروج سب سے پہلے اس وقت شروع ہوتا ہے جب ان کے اندر ایک واضح نظریہ حیات جنم لیتا ہے جو ان کی شناخت، ان کے مستقبل اور ان کے اجتماعی طرزِ فکر کو متحد کرتا ہے۔ ایسا نظریہ انہیں داخلی استحکام، شعوری وحدت، اور ایک مشترکہ مقصد عطا کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں نبی کریم ﷺ کی قیادت میں مدینہ کی ریاست، ایسی ہی نظریاتی تحریک کی مثال ہے جس نے مٹھی بھر لوگوں کو ایسی عظیم امت میں بدل دیا جو صدیوں تک دنیا کی رہنمائی کرتی رہی۔ اسی طرح جس قوم کے اندر عدل و مساوات کا نظام نافذ ہو، جہاں فرد کو عزت، حقوق اور انصاف ملے، وہ قوم فطری طور پر ترقی کرتی ہے۔ عدل صرف عدالت کے کمرے تک محدود نہیں بلکہ اس کا اطلاق معیشت، سیاست، معاشرت اور علم کے تمام

شعبوں میں ہوتا ہے۔ جہاں عدل کو پامال کیا جاتا ہے، وہاں بد نظمی، استحصال اور نفرت جنم لیتی ہے جو قوم کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔

زوال کا آغاز اکثر اس وقت ہوتا ہے جب قوم خود فریبی، غرور، اور ماضی کی عظمت پر تکیہ کرنے لگتی ہے۔ جب وہ سمجھنے لگتی ہے کہ اس کی طاقت دائمی ہے، اور اس کا مقام کسی خدائی سند کے ساتھ اسے ہمیشہ کے لیے دے دیا گیا ہے، تو وہ اصلاحِ نفس، تنقیدِ ذات اور فکری بیداری سے غافل ہو جاتی ہے۔ ایسے میں علم کی جگہ تعصبات لے لیتے ہیں، فکر کی جگہ تقلید آجاتی ہے، اور قیادت ایسے افراد کے ہاتھ آجاتی ہے جو صرف مفادات کے پجاری ہوتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب قوم کے اندر علمی جمود، اخلاقی انحطاط اور معاشرتی تفرقہ شروع ہوتا ہے۔

قوموں کے زوال میں سب سے خطرناک کردار وہ اشرافیہ ادا کرتی ہے جو دولت، طاقت اور عہدوں پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہ طبقہ عوام سے کٹ جاتا ہے، قانون سے بالاتر ہو جاتا ہے، اور اپنی آسائشوں کو قوم کے وسائل سے پورا کرتا ہے۔ قرآن کریم قومِ عاد، ثمود، فرعون اور قومِ سبا کی تباہی کی داستان سناتے ہوئے بار بار ان کے متکبر اور ظالم سرداروں کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے زمین میں فساد پھیلایا اور اصلاح سے روگردانی کی۔ زوال کا ایک اور سبب باطل کے خلاف خاموشی، حق گوئی سے کنارہ کشی اور مظلوموں سے بے حسی ہے۔ جب معاشرے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جذبہ ختم ہو جائے، جب ہر شخص صرف

اپنی ذات کا اسیر بن جائے اور اجتماعی احساس ختم ہو جائے، تو وہ قوم خدا کے نظامِ عدل سے محروم ہو جاتی ہے اور آخر کار تباہی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔

اسی طرح تعلیم، فکر اور شعور کی سطح بھی کسی قوم کے عروج وزوال میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہے۔ وہ قوم جو علم کی قدر کرتی ہے، تحقیق کو فروغ دیتی ہے، مکالمے کو زندہ رکھتی ہے، وہ ہمیشہ ترقی کی طرف بڑھتی ہے، چاہے وقتی طور پر وسائل کی کمی کا شکار ہو۔ اور وہ قوم جو جہالت میں ڈوب جائے، فکری تنقید سے ڈرے، اور علمی ترقی کو مغربی سازش سمجھے، وہ صرف ماضی کی یادگار بن کر رہ جاتی ہے۔ تعلیم کا زوال دراصل فکری زوال کی علامت ہے، اور جب فکر مر جائے تو کوئی فوج، کوئی دولت، کوئی ٹیکنالوجی قوم کو نہ بچا سکتی ہے، نہ زندہ کر سکتی ہے۔

اقوام کے عروج وزوال کا ایک باطنی پہلو بھی ہوتا ہے جو اللہ کے قانونِ فطرت سے وابستہ ہے۔ اللہ کسی قوم کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلے۔ اگر کوئی قوم اپنا قبلہ درست رکھے، اپنا محاسبہ کرتی رہے، اور ہر دور میں اپنے انحرافات کو پہچان کر توبہ کرے، تو وہ زوال سے بچ سکتی ہے۔ لیکن جو قوم ہر بار اصلاح کی دعوت کو رد کرے، انبیاء، مصلحین اور اہلِ حق کی آواز کو خاموش کرے، اور صرف مفادات کو معیار بنائے، اس کا انجام تاریخ کے کچرے دان میں ہوتا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو اقوام کے عروج و زوال کے اسباب ایک طرف داخلی ہیں: یعنی فکر، اخلاق، قیادت، علم اور نظامِ عدل۔ اور دوسری طرف خارجی: جیسے جنگ، استعماری طاقتوں کا دباؤ، اور قدرتی عوامل۔ لیکن اگر داخلی قوت سلامت ہو، تو خارجی چیلنجز کبھی قوم کو زیر نہیں کر سکتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جن قوموں نے خود کو اندر سے ٹھیک رکھا، وہ کئی بار زخم کھا کر بھی پھر سے اٹھ کھڑی ہوئیں، لیکن جو اندر سے بکھر چکیں، وہ ایک دھکے میں زمیں بوس ہو گئیں۔ اس لیے اصل جنگ ہمیشہ قوم کے اندر لڑی جاتی ہے، اور اصل فتح یا شکست بھی وہیں سے شروع ہوتی ہے۔

امام حسینؑ کے مشن سے مربوط عزاداری

ہر سال جب محرم کا چاند طلوع ہوتا ہے تو دنیا بھر کے مسلمان بالخصوص اہلِ تشیع کے دلوں میں ایک خاص تڑپ، غم، عشق اور شعور بیدار ہونے لگتا ہے۔ عاشورا کی یاد، کربلا کی تپتی ریت، امام حسینؑ کی فریاد، عباسؑ کی وفاداری، زینبؑ کا صبر، اور علی اکبرؑ کا شباب ہر اہلِ دل کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ مجالس، ماتم، نوحے اور جلوس اس عظیم قربانی کی یاد میں برپا کیے جاتے ہیں جو امام حسینؑ نے دینِ اسلام کی بقاء اور حق و باطل کے معرکہ میں خدا کی طرف سے منتخب کردہ معیارِ عدل کے دفاع میں پیش کی۔

تاہم وقت کے ساتھ ساتھ عزاداری کی اصل روح سے انحراف کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔ بہت سے ایسے اعمال اور مظاہر اس نظامِ عزاء میں شامل ہو گئے ہیں جن کا کربلا کے حقیقی مقصد اور امام حسینؑ کے مشن سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض رسمیں، حرکات اور دعوے خواہشاتِ نفس اور معاشرتی رواجوں کے تابع ہو کر وجود میں آئے اور یوں امام حسینؑ کی عزاداری میں بدعات شامل کر دی گئیں، جن سے اصل پیغام دھندلا گیا۔ یزید اور اس کے نظام کے خلاف جو انقلابی روح امامؑ نے پیش کی، اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بعض نے عزاداری کو صرف آنسو بہانے یا محض جذباتی تسکین تک محدود کر دیا، جبکہ امام حسینؑ نے

صرف غم کے اظہار کیلئے نہیں بلکہ بیداری، انقلاب، فکری جہاد، اور سماجی اصلاح کیلئے قربانی دی۔

عزاداری درحقیقت ایک مسلسل دعوت ہے — ایک دعوت رجوع الی اللہ کی، حق کی طرف پلٹنے کی، ظلم سے بیزاری اور مظلوم کا ساتھ دینے کی۔ اگر اس عزاداری میں وہ روح نہ رہے، وہ تجدیدِ عہد نہ ہو، وہ انقلابی بصیرت نہ ہو، تو یہ صرف خالی رسم رہ جائے گی جس سے نہ دنیا بدلے گی نہ ضمیر جاگیں گے۔ امام حسینؑ کا قیام وقت کی سب سے بڑی طاقت کے خلاف تھا۔ ان کا ہر قدم الٰہی پیغام کی بقاء، انسانیت کی حرمت، اور دین کی سچائی کے اثبات کیلئے تھا۔ ان کا خون فکری غلامی، سیاسی جبر، طبقاتی تفاوت اور دینی انحراف کے خلاف بہا۔

پس، ہمیں وہ عزاداری اپنانی چاہیے جو ہر دور کے یزیدی فتنوں کی شناخت کرے، جو وقت کے شمر اور ابنِ زیاد کو بے نقاب کرے، جو انسان کو نفس پرستی، مادہ پرستی اور بے دینی سے نکال کر اللہ کے راستے پر استقامت سے کھڑا کرے۔ وہ مجالس جو شعور دیں، وہ ماتم جو دلوں کو پاک کرے اور ضمیر کو بیدار، وہ نوحے جو روح کو جھنجھوڑیں اور صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کریں، یہی اصل عزاداری ہے۔ اگر ہماری عزاداری اس پہلو سے خالی ہو تو ہم فقط اپنے جذبات کی تسکین کر رہے ہیں، امام حسینؑ کے مشن کو زندہ نہیں کر رہے۔

آج جب دنیا ایک نئے یزیدی نظام کے شکنجے میں جکڑی جا رہی ہے، جب دین محض الفاظ کا مجموعہ بنا دیا گیا ہے، جب مظلوموں کی آہیں سنی نہیں جاتیں اور طاقتور حق کو کچل رہا ہے،

تب امام حسینؑ کی یاد میں منائی جانے والی عزاداری ایک عظیم ذمہ داری کی طرف ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ عزاداری محض ماضی کا مرثیہ نہیں، یہ مستقبل کی تعمیر کا پختہ عہد ہے۔ یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا، حق کے لئے قربانی دینا، اور باطل کے نظام کو رد کرنا، یہی حسینیت ہے۔

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم عزاداری کو پاکیزگی کے اس معیار پر لے جائیں جہاں امام حسینؑ کی روح کو سکون ملے، جہاں ان کے مشن کی سچائی نکھرے، اور جہاں ہر سننے والا، دیکھنے والا اور ماتم کرنے والا یہ عہد کرے کہ وہ اس دنیا میں حسینؑ کا سپاہی ہے، اور ہر ظلم، ہر فریب، ہر استحصالی نظام کے خلاف امامؑ کی طرح قیام کرے گا۔ یہی عزاداری کی اصل روح ہے، یہی حسینی بصیرت ہے، اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں خدا تک لے جاتا ہے۔

عزاداری اگر امام حسینؑ کے اصل مشن پر قائم ہو، تو وہ نہ صرف ماضی کے عظیم سانحے کی یادگار ہوتی ہے بلکہ مستقبل کے عظیم وعدے یعنی ظہور امام زمانہؑ کیلئے بہترین زمینہ سازی بھی بن جاتی ہے۔ امام حسینؑ کا قیام ایک وقتی ردعمل یا جذباتی احتجاج نہیں تھا بلکہ یہ تاریخ کی ہر صبح اور ہر شام پر اثر انداز ہونے والا دائمی پیغام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ معصومینؑ نے فرمایا: "کل یوم عاشورا و کل ارض کربلا"۔ یعنی ہر دن عاشورا ہے اور ہر زمین کربلا، کیونکہ حق و باطل کی جنگ، عدل و ظلم کا تصادم، اور خداپرستوں و خودپرستوں کا معرکہ ہر زمانے اور ہر جگہ جاری ہے۔

یہی اصول ہمیں عزاداری کی ماہیت اور اس کے عالمگیر مشن کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہر دن عاشورا ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ ظلم کے خلاف قیام اور حق کی حمایت آج بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا امام حسینؑ کے وقت تھا۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ ہر زمین کربلا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں جہاں بھی ظلم و ستم ہے، جہاں باطل نے حق کو دبا رکھا ہے، جہاں عدل دفن ہو چکا ہے اور باطل کے عَلَم بلند ہیں، وہ جگہ میدانِ کربلا ہے، اور وہاں حسینی قیام کی ضرورت ہے۔

ایسی عزاداری جو شعور بخشے، جو ظلم کے خلاف بغاوت کی تربیت دے، جو لوگوں کو نفس پرستی، دنیا پرستی اور غفلت سے نکال کر عدل، تقویٰ اور استقامت کی راہ پر لے آئے، وہ درحقیقت امام مہدیؑ کے عالمی مشن کیلئے انسانوں کو تیار کر رہی ہوتی ہے۔ امام حسینؑ کا خون جس دین کی بقا کیلئے بہا، وہی دین امام مہدیؑ کے ظہور کے بعد دنیا پر غالب آئے گا۔ اور یہ دونوں قیام، دراصل ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔ ایک قیام نے قربانی کی انتہا دکھائی، دوسرے قیام نے کامیابی اور عدل کی انتہا کو ظاہر کرنا ہے۔

اگر عزاداری صرف سادہ سوگ منانے اور تاریخ دہرانے تک محدود رہے، تو وہ اس مشن کی تیاری نہیں بن سکتی۔ لیکن اگر یہ عزاداری ظلم شناسی، دشمن شناسی، دینی شعور، سیاسی بصیرت، فکری بیداری، اور روحانی تربیت کا مرکز بنے، تو پھر یہی عزاداری امام مہدیؑ کے ناصروں کو تیار کرتی ہے۔ اس طرح کی مجالس، انسانوں کے ضمیر کو جگاتی ہیں، ان کے افکار کو سُدھارتی ہیں، اور انہیں باطل کے خلاف لڑنے کیلئے آمادہ کرتی ہیں۔ یہی لوگ پھر امام

مہدیؑ کے انصار بننے کے قابل ہوتے ہیں، وہی اصحاب جو "لبیک یا مہدیؑ" کہنے میں فقط زبان سے نہیں بلکہ عمل سے بھی وفا کرتے ہیں۔

اس تیاری کا آغاز معرفتِ حسینؑ سے ہوتا ہے۔ معرفتِ حسینؑ، معرفتِ دین ہے۔ حسینؑ کو صرف شہید کہنا کافی نہیں بلکہ انہیں سمجھنا، ان کے مقاصد کو اپنانا، اور ان کے راستے پر چلنا ہی وہ معرفت ہے جو ہمیں ظہور کی طرف لے جاتی ہے۔ مجالسِ حسینؑ میں صرف تاریخ نہ سنائی جائے بلکہ اس تاریخ کے تقاضے، اُس کے معانی، اور اس کے مشن کو آج کے حالات پر منطبق کیا جائے۔ آج کے یزید کو پہچاننا، آج کے شمر و ابن زیاد کو بے نقاب کرنا، اور ان کے خلاف آواز بلند کرنا، یہی حسینیت ہے۔ اور یہی امام مہدیؑ کی راہ ہے۔

جب عزاداری ایک علمی، فکری، روحانی اور انقلابی تربیت گاہ بن جائے، تو وہ لاکھوں ایسے انسان تیار کرتی ہے جو ظلم سے نفرت کرتے ہیں، حق کیلئے قربانی دینے کو تیار ہوتے ہیں، اور جب وقت آئے گا تو امام مہدیؑ کے لشکر میں صف اول میں کھڑے ہوں گے۔ یہ وہی لشکر ہے جس کی بنیاد کربلا میں پڑی اور جس کی تکمیل ظہور پر ہو گی۔ لہٰذا عزاداری کا مقصد فقط گریہ نہیں بلکہ قیام ہے، صرف غم نہیں بلکہ شعور ہے، اور صرف یادگار نہیں بلکہ تیاری ہے۔

زنجیر زنی، قمہ زنی، آگ پر ماتم اور اس جیسے دیگر اعمال جنہیں کچھ حلقے عشقِ حسینؑ کا اظہار سمجھ کر انجام دیتے ہیں، ان کی حیثیت پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔ امام حسینؑ کا

مشن ایک شعوری، انقلابی اور اصلاحی تحریک تھی جس کی بنیاد عدل، عقل، فہم، اور دینی بصیرت پر تھی، نہ کہ صرف جذباتی ہیجان یا جسمانی اذیت پر۔ امامؑ نے خود کو زخمی نہیں کیا بلکہ دوسروں نے انہیں زخم دیئے اور اذیتیں پہنچائیں۔ ان کا قیام، باطل کے مقابلے میں ایک فکری وروحانی استقامت کی علامت ہے۔ امام حسین ع کی سیرت کی پیروی تو دراصل یہ ہے کہ ہم قیام حق و عدالت کی راہ میں ایسی جدوجہد کریں کہ باطل ہمیں بھی ایسی ہی اذیتیں, تکالیف اور زخم دے۔ خود اپنے ہاتھ سے خود کو زخمی کرنا، اذیت دینا امام ع کی سیرت تونہیں۔

زنجیر زنی اور قمہ زنی جیسے اعمال صدیوں بعد ایک مخصوص ثقافتی ماحول میں پیدا ہوئے، جن کا امام حسینؑ کے حقیقی مقصد اور کربلا کے پیغام سے کوئی براہِ راست ربط موجود نہیں۔ یہ افعال اگرچہ عشق کے جذبے سے انجام دیے جاتے ہیں، لیکن نہ قرآن سے ان کی تائید ملتی ہے، نہ معصومینؑ سے، اور نہ ہی عقل اسے سراہتی ہے۔ جو عمل دین کے چہرے کو دنیا کے سامنے مسخ کرے، جس سے دشمن کو اسلام پر تنقید کا موقع ملے، وہ نہ عزاداری ہے نہ عبادت، بلکہ وہ حسینیت کے انقلابی پیغام کی روح کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔

اسی طرح بعض تبرکات جیسے چادرِ زینبؑ، جھولا علی اصغرؑ، علمِ عباسؑ وغیرہ، اگر صرف عقیدت کی علامت کے طور پر ہوں اور ان کا مقصد ذکرِ مصائب سے وابستہ ہو تو یہ عوامی سطح پر جذبے کو جوڑنے میں مدد دے سکتے ہیں، بشرطیکہ ان سے شرعی یا عقلی مخالف غلو اور خرافات نہ جڑی ہوں۔ لیکن اگر ان چیزوں کو مقصود بالذات سمجھا جائے، یا ان سے ایسی

توقعات وابستہ کر لی جائیں جو دین میں ثابت نہیں، تو یہ رسم پرستی بن جاتی ہے، جس سے اصل پیغامِ کربلا پسِ پشت چلا جاتا ہے۔

امام حسینؑ نے قربانی دے کر انسان کو بیداری، غیرت، اور باطل کے خلاف قیام کا راستہ دکھایا۔ اس راہ میں عزاداری کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے کہ انسان گریہ کے ذریعے باطل سے نفرت کرے، مجلس کے ذریعے بصیرت حاصل کرے، اور حسینؑ کی یاد کے ذریعے حق کا علم بلند رکھے۔ جو بھی عمل اس پیغام کو کمزور کرے، اس کا تجدیدِ نظر کے ساتھ جائزہ لینا واجب ہے۔ عزاداری کو حسینی شعور، دینی فہم، اور دشمن شناسی کا مرکز بنانا چاہیے، نہ کہ جذباتی وقتی ہیجان یا خود اذیتی کا مظہر۔

لہٰذا زنجیر زنی، قمہ زنی یا آگ کا ماتم وہ راہ نہیں جو امام حسینؑ نے دکھائی، بلکہ وہ راہ تعلیم، بصیرت، حق گوئی، اور ظلم کے خلاف جہاد کی راہ ہے۔ اگر ہم واقعی حسینی ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ عزاداری کو ایسے اعمال سے پاک کریں جو پیغامِ حسینؑ کو مسخ کریں، اور اس شعوری عزاداری کی طرف پلٹیں جو امامِ وقت عجل اللہ فرجہ کیلئے زمینہ ساز بنے۔ یہی وہ عزاداری ہے جو امام حسینؑ کے مشن سے جڑی ہوئی ہے اور یہی وہ عزاداری ہے جو امام زمانہؑ کے ظہور کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر سال کی عزاداری کو صرف ماتم کی نہیں بلکہ تیاری کی فضا بنائیں، اور خود کو اس عظیم عالمی قیام کا سپاہی بننے کے قابل بنائیں جو خدا کے دین کو تمام ادیان پر غالب کرے گا، اور دنیا کو عدل و قسط سے بھر دے گا، جیسے وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔

امت محمدی ﷺ اور عالمی محرمیوں کا مستقبل

ملت تشیع بالخصوص، اور امتِ مسلمہ بالعموم، بلکہ دنیا کے تمام مظلوم، محروم، اور مستضعف اقوام کو آج کی صورتِ حال میں ایک نہایت حساس اور تاریخی نکتہ ذہن نشین کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ اگر خدانخواستہ ایران موجودہ عالمی جنگ یا سامراجی محاصرہ میں شکست کھا گیا، تو صرف ایک ملک نہیں، بلکہ ایک نظریہ، ایک امید، ایک مزاحمتی مرکز، اور ایک عالمگیر دفاعی فصیل ٹوٹ جائے گی، جس کے اثرات نہ صرف شیعہ مسلمانوں بلکہ تمام مستضعف اقوام پر بہت بھیانک ہوں گے۔ یہ صرف جغرافیائی جنگ نہیں، بلکہ ایک ایسی فکری و تہذیبی کشمکش ہے جس کی جڑیں سینکڑوں سال پیچھے، تقریباً چار سے سات صدیوں پر محیط، اس مغربی سامراجی منصوبہ بندی میں پیوستہ ہیں جس نے پہلے تلوار، پھر تجارت، پھر نظریات اور اب ڈیجیٹل و فوجی تسلط کے ذریعے دنیا کے ہر گوشے پر اپنی چادر تان دی ہے۔ ایران، 1979 کے اسلامی انقلاب کے بعد، وہ واحد ریاستی طاقت بن کر ابھرا جس نے نہ صرف اس عالمی استعماری ڈھانچے کو چیلنج کیا بلکہ اسے مسلسل ایک سخت مزاحمت (tough time) دیا۔ اس نے نہ تو صہیونی ریاست کو تسلیم کیا، نہ ہی مغربی سامراجی مالیاتی و ثقافتی نظام کے آگے سر جھکایا، بلکہ وہ مظلومینِ عالم کے لیے ایک محور، ایک پناہ گاہ، اور ایک عملی حمایت بن کر کھڑا رہا۔ آج غزہ میں فلسطینی، یمن میں حوثی، لبنان میں حزب اللہ،

عراق میں مزاحمتی قوتیں، شام میں استقلال پسند عناصر اور دیگر کئی خطوں کے آزدی پسند گروہ اسی ایران کی فکری و معنوی امداد سے تقویت پاتے ہیں۔ ایران کی شکست دراصل ان سب کی امیدوں کی شکست ہو گی، کیونکہ سامراج کسی بھی مزاحمت کو تنہا اور بے پشت پناہی دیکھ کر ہی اس کا قلع قمع کرتا ہے۔

جدید استعمار جو اس وقت اسرائیل، امریکہ، اور ان کے نیٹو اتحادیوں کے ذریعے دنیا کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں، وہ ایران کے خلاف کی جانے ولی ہر جارحیت کو ایک بڑی تہذیبی جنگ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اگر وہ دیکھیں کہ ایران جیسی اسٹریٹیجک اور نظریاتی طاقت ختم ہو گئی تو وہ ہر اس آواز، ہر اس تحریر، ہر اس جماعت، اور ہر اس تحریک کے خلاف عالمی سطح پر کریک ڈاؤن کریں گے جو استعماری نظام کے خلاف مزاحمت کرتی ہے۔ مسلمان خواہ شیعہ ہوں یا سنی، خواہ عرب ہوں یا عجم، سب پر وقت کی سختی آجائے گی۔ اسلامی تعلیمی ادارے، مساجد، دینی مدارس، حتیٰ کہ فکری حلقے اور آزادی کی بات کرنے والے ہر ذہن کو نشانہ بنایا جائے گا۔ اور جو کچھ تھوڑی بہت مذہبی یا فکری آسانیاں، خودمختاری یا مزاحمتی تنفس باقی رہ گیا ہے، وہ بھی چھین لیا جائے گا۔

یہ منظر نامہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ زمینی حقائق پر مبنی ہے۔ عراق پر حملے سے لے کر شام میں سازش، لیبیا کی تباہی، یمن کی ناکہ بندی، اور افغانستان میں بحران ـــ یہ سب اس بڑے منصوبے کا حصہ ہیں، جس کا اصل ہدف اسلام کا وہ چہرہ ہے جو ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا

ہے، جو امام حسینؑ کی طرح وقت کے یزید کو للکارنے کی جرات رکھتا ہے، اور جو عدلِ الٰہی کو انسانوں کی نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

لہٰذا یہ صرف ایران کی جنگ نہیں ہے، بلکہ یہ کربلا کی طرح ایک عالمی معرکہ ہے، جہاں کوئی بھی تماشائی بن کر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جسے جتنی طاقت، عقل، وقت، ذرائع یا مقام حاصل ہے، وہ اس جنگ میں کسی نہ کسی صورت میں شریک ہو۔ کوئی زبان سے، کوئی قلم سے، کوئی دعا سے، کوئی مالی تعاون سے، اور کوئی سوشل نیٹ ورک کے ذریعے اس نظریاتی مزاحمت کو مضبوط کرے۔ کیونکہ اگر آج ہم نے خاموشی اختیار کی، تو کل ہماری نسلوں کو صرف خاموش قبرستانیں ورثے میں ملیں گی، نہ کوئی دین بچ پائے گا، نہ شناخت، نہ آزادی، نہ وقار۔

وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو فقط روٹی، کپڑا اور موبائل ہی نہ دیں، بلکہ انہیں وہ نظریہ، وہ بصیرت، اور وہ شعور دیں کہ وہ جان سکیں کہ دنیا میں عزت صرف ان کو ملتی ہے جو ظلم کے خلاف کھڑے ہوتے ہیں، اور اس کھڑے ہونے کی قیمت اگر خون سے ادا کرنی پڑے تو وہ بھی کم ہے۔ ایران کی موجودہ مزاحمت ہر ایک کے ضمیر کا امتحان ہے۔ ہم اس میں شرکت کر کے اپنی آئندہ نسلوں کے لیے آزادی اور شناخت کا چراغ جلا سکتے ہیں، یا خاموشی اختیار کر کے ایک غلامانہ اندھیرا ان کے مستقبل میں چھوڑ سکتے ہیں۔ فیصلہ آج کا ہے، اثر کل تک پھیلے گا۔

اندر کا آئینہ

انسانی نفس عجیب ہے۔ جو چیز وہ اپنے اندر سہنے کے قابل نہیں ہوتا، وہی اسے دوسروں میں زیادہ شدت سے دکھائی دیتی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ جو بچپن یا زندگی کے کسی مرحلے میں ٹوٹ پھوٹ، محرومی، یا جذباتی درد سے گزرے ہوتے ہیں، وہ لاشعوری طور پر ایک ایسے ذہنی سانچے میں چلے جاتے ہیں جہاں دوسروں کا مسلسل تجزیہ کرنا، ان کی خامیاں نکالنا اور ان پر نکتہ چینی کرنا ہماری اندرونی بے چینی کو وقتی طور پر دبانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ اگر ہم دوسروں کی غلطیوں، کمزوریوں اور گراوٹ پر نظر رکھیں، انہیں سامنے لائیں، یا ان کے انجام کا تجزیہ کریں، تو ہم کسی قسم کی "اندرونی برتری" یا "نیکی کی حفاظت" کر رہے ہیں، حالانکہ اصل میں یہ سب ہمارے دل میں موجود ایک غیر حل شدہ زخم کی چیخ ہوتی ہے۔

دوسروں کی برائیوں پر نگاہ رکھنا ایک طرح کی نفسیاتی خود دفاعی کیفیت ہے، جو انسان کو اپنی اندرونی تکلیف سے دور رکھنے کے لیے ایک مشغولیت عطا کرتی ہے۔ لیکن یہ مشغولیت ایک زہر کی مانند ہے جو انسان کے باطن کو کھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی کو برا کہتے ہیں، اس کے بارے میں بدگمانی کرتے ہیں، اس کے "کرمہ" کا انتظار کرتے ہیں یا اس کے انجام پر خوش ہوتے ہیں، تو دراصل ہم اپنے وجود کی ارتعاشی توانائی کو نیچے گرا رہے ہوتے ہیں۔ ہم محبت،

سکون اور قبولیت جیسی اعلیٰ کیفیات سے نکل کر خوف، نفرت اور حسد کی فریکوئنسی پر چلے جاتے ہیں۔ اور یوں، ہم خود ہی وہ زخم جھیلنے لگتے ہیں جن کا ہم تصور دوسروں کے لیے کر رہے ہوتے ہیں۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ دوسرا شخص غلط ہے یا صحیح، نیک ہے یا بد۔ اصل سوال یہ ہے کہ وہ شخص ہمارے اندر کون سا ایسا درد، یاد، یا خوف جگا رہا ہے کہ ہم اس کی برائی کو برداشت نہیں کر پا رہے؟ ہم کیوں اس کی سزا کے خواہشمند ہیں؟ کیوں اس کی غلطی ہمارے دل کی زمین کو ہلا دیتی ہے؟ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے شخص کی کوئی بات، کوئی حرکت یا کوئی رویہ ہمارے ماضی کے کسی تکلیف دہ تجربے کو جگا دیتا ہے۔ جیسے کسی ظالم کے ہاتھوں کی گئی ناانصافی ہمیں اپنی پرانی محرومی کی یاد دلاتی ہے۔ یا کسی کے تکبر سے ہمیں وہ احساسِ کمتری یاد آتا ہے جو ہمیں بچپن میں دیا گیا تھا۔ یوں ہم دوسروں پر تبصرہ کر کے دراصل اپنے اندر کے درد کو زبانی شکل دیتے ہیں، مگر شفا نہیں پاتے۔

شفا تب آتی ہے جب انسان اپنی توجہ باہر سے ہٹا کر اندر کی طرف لے جائے۔ جب وہ دوسروں کا تجزیہ کرنے کے بجائے خود سے یہ سوال کرے کہ آخر وہ کس درد سے بھاگ رہا ہے؟ کیا وہ اس قابل ہو سکتا ہے کہ کسی کے کردار کو اس کی تکمیل یا ناکامی کے بغیر بھی دیکھ سکے؟ کیا وہ کسی کی کمزوری کو سمجھ کر اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھ سکے؟ کیا وہ اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ وہ دوسروں کے سفر کو ان کے حال پر چھوڑ دے اور اپنی روح کی نگہداشت کو مقدم سمجھے؟

یہ زندگی ایک بہت گہرا آئینہ ہے۔ جو چیز ہمیں دوسروں میں تکلیف دیتی ہے، وہی ہمیں اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ سکھانے آئی ہے۔ کسی کا فریب، کسی کی زیادتی، کسی کا غرور، یا کسی کی غلطی — یہ سب دراصل وہ حالات ہیں جو ہمیں یہ دکھانے آتے ہیں کہ ہم کہاں آزاد نہیں ہیں، کہاں ہم ابھی بھی اندر سے الجھے ہوئے ہیں۔ اور اسی لیے، جیسے جیسے انسان اپنی باطنی صفائی کی طرف جاتا ہے، وہ دوسروں کو کم تجزیہ کرتا ہے اور زیادہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ تنقید کے بجائے دعا کرتا ہے، وہ ردعمل کے بجائے خاموشی اختیار کرتا ہے، اور وہ بدلہ لینے کی خواہش کو اپنی روح کے سکون پر قربان کر دیتا ہے۔

دوسروں کی غلطیوں پر گرفت کا رویہ ترک کرنا ایک مشق ہے۔ یہ تب ممکن ہے جب انسان خود کو معاف کرنا سیکھے، اپنے ماضی کے زخموں کو تسلیم کرے، اور اس درد سے سیکھنے کی نیت رکھے۔ تب جا کر وہ دوسروں کے اعمال میں بھی وہی تکلیف دیکھتا ہے جس سے وہ خود کبھی گزرا ہوتا ہے، اور پھر دل میں رحم پیدا ہوتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ ہر شخص اپنے شعور کی سطح پر زندگی گزار رہا ہے، اور کوئی بھی محض برائی کے لیے برا نہیں ہوتا، بلکہ وہ بھی کسی اندرونی الجھن، خوف یا درد کا اسیر ہوتا ہے۔ تب انسان "منصف" کے تخت سے اتر کر "مشاہدہ کرنے والے" کے مقام پر آتا ہے، اور یہیں سے حقیقی آزادی اور اندرونی سکون کا آغاز ہوتا ہے۔

جو شخص اپنی توجہ دوسروں سے ہٹا کر خود پر مرکوز کرنا سیکھ لیتا ہے، وہ اپنے دل کے زہر کو محبت میں بدلنے لگتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ اس دنیا میں سب کچھ وقتی ہے، حتیٰ کہ درد بھی۔

اور اگر وہ اپنی توانائی کو دوسروں کی گرفت سے نکال کر شکر، خاموشی، دعا اور اپنے سفر کی بہتری پر مرکوز رکھے تو وہ نہ صرف خود کو ہلکا محسوس کرتا ہے بلکہ اس کی موجودگی دوسروں کے لیے بھی ایک روشنی بن جاتی ہے۔ کیونکہ جو شخص خود کو شفا دے لیتا ہے، وہ دوسروں کے لیے سزا نہیں بلکہ محبت کی علامت بن جاتا ہے — اور یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کا وجود، اس کی موجودگی اور اس کی خاموشی بھی درس بن جاتی ہے۔

انسانی رویوں کی سرخ لکیر

زندگی ایک توازن کا نام ہے، اور ہر عمل، جذبہ یا تعلق اپنی مخصوص حد رکھتا ہے۔ جب کوئی رویہ اپنی فطری حدود سے تجاوز کر جائے، تو وہ اپنی اصل خوبی کھو کر نقصان دہ بننے لگتا ہے۔ اسی باریک حد کو ہم "ریڈ لائن" کہتے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جہاں اچھائی اور برائی، حکمت اور کمزوری، خلوص اور محتاجی، عمل اور بے عملی کے درمیان فاصلہ بہت نازک ہو جاتا ہے۔ اس لیے ریڈ لائنز کو پہچاننا، سمجھنا اور ان کا احترام کرنا زندگی کے ہر شعبے میں توازن، سکون اور شعوری بیداری کے لیے ضروری ہے۔

زندگی میں ہر عمل اور رویے کی ایک ظاہری شکل ہوتی ہے اور ایک باطنی حقیقت۔ بسا اوقات وہی رویہ جو بظاہر نیکی، تقویٰ یا حکمت کی علامت دکھائی دیتا ہے، اندر سے کمزوری، خود فریبی یا بے عملی کی صورت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات انسان جس چیز کو برداشت، صبر یا تسلیم کا نام دیتا ہے، وہ دراصل اس کی ہمت کا فقدان، خوف کا پردہ یا سستی کی جذاب تعبیر ہوتی ہے۔ اس لیے زندگی میں سب سے اہم سوال یہ نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ *کیوں* کر رہے ہیں اور *کس کیفیت میں* کر رہے ہیں۔ رویے کی ریڈ لائن وہ مقام ہوتا ہے جہاں کوئی اچھا وصف اپنی اصل معنویت کھو کر اپنی ضد

میں بدلنے لگتا ہے، اور اس فرق کو پہچاننے کے لیے انسان کو بار بار اپنے باطن کی طرف پلٹ کر دیکھنا ہوتا ہے۔

صبر ایک عظیم انسانی وصف ہے، مگر وہ کب سستی بن جاتا ہے؟ یہ وہ لمحہ ہے جب صبر ہمیں حرکت سے روکنے لگے، جب وہ ہمیں ظلم سہنے اور حق پر خاموش رہنے کا بہانہ دینے لگے، جب وہ ہمیں دلاسہ تو دے مگر تبدیلی کی تحریک نہ بنے۔ صبر کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے دل میں شکوہ نہ رکھے، مگر اس کا ہر لمحہ شعوری جدوجہد اور بہتری کی طلب سے لبریز ہو۔ اگر انسان صبر کے نام پر اپنی ذمہ داریوں سے کترانے لگے، وقت کو ضائع کرے، مواقع کو جانے دے اور اپنی کمزوریاں تقدیر کے کھاتے میں ڈالنے لگے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب صبر اپنی ریڈ لائن عبور کر چکا ہے اور سستی و بے عملی کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

ایسے ہی، خاموشی کب دانائی سے بے حسی بن جاتی ہے؟ یہ تب ہوتا ہے جب انسان حق کے وقت چپ رہے، ظلم کو دیکھ کر خاموشی کو حکمت کا نام دے، یا اپنے دل کی بزدلی کو بردباری میں ملفوف کر دے۔ دانائی وہ ہوتی ہے جو دل میں درد بھی رکھتی ہو اور وقت پر بولنے کا حوصلہ بھی۔ اگر ہماری خاموشی ہمیں راحت دے مگر دوسروں کو ظلم میں چھوڑ دے تو یہ خاموشی نہیں، مصلحت کی بزدلی ہے۔

محبت کب خود فریبی بن جاتی ہے؟ جب ہم کسی کو دل سے چاہنے لگیں مگر اپنی عزتِ نفس اور اصولوں کو قربان کر دیں، یا اپنی ذات کو مٹا کر دوسرے کی کمزوریوں کو بھی محبت سمجھنے

لگیں، تو وہاں محبت اپنی پاکیزگی کھو بیٹھتی ہے۔ محبت میں فطری قربانی اور ایثار ضرور ہوتا ہے، مگر وہ قربانی جو انسان کو بکھیر دے اور خودی کو مٹادے، وہ محبت نہیں بلکہ محتاجی ہے، اور محتاجی کبھی بھی روح کو سکون نہیں دیتی، بلکہ آہستہ آہستہ کھاجاتی ہے۔

ریڈ لائن کو پہچاننے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے *خود مشاہدہ*۔ یعنی انسان ہر عمل، ہر خاموشی، ہر جذبے اور ہر فیصلے کے پیچھے چھپے ہوئے نیت اور جذبے کو پہچاننے کی کوشش کرے۔ یہ سوال بار بار خود سے کیا جائے کہ جو میں کر رہا ہوں، کیا وہ دل کے سچ اور روح کی صحت سے ہم آہنگ ہے، یا کسی وقتی مجبوری، خوف یا بے علمی کا نتیجہ ہے؟ کیا میرا صبر مجھے بلند کر رہا ہے یا تھکا رہا ہے؟ کیا میری خاموشی دل کے سکون کی علامت ہے یا ایک اندرونی بے بسی کی؟ کیا میری محبت دوسروں کو نکھار رہی ہے یا مجھے اندر سے ختم کر رہی ہے؟

ریڈ لائن وہاں کھینچی جاتی ہے جہاں باطن کی کیفیت اور ظاہری عمل میں تضاد آجائے۔ یہ تضاد کبھی ظاہر نہیں ہوتا، اگر انسان مسلسل خود کو دیکھتا اور پرکھتا نہ رہے۔ اسی لیے روحانی سچائی کا ایک بنیادی اصول یہی ہے کہ انسان ہر روز خود کو احتساب کے آئینے میں دیکھے، بغیر فریب، بغیر بہانے، اور بغیر موازنہ کیے۔ کیونکہ دوسروں کے رویے ہماری راہ کا معیار نہیں، ہمارا باطن ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر وصف ایک تلوار کی مانند ہوتا ہے، جو اگر توازن کے ساتھ استعمال نہ ہو تو خیر کے بجائے شر کا سبب بن سکتا ہے۔ اسی لیے دانا وہ ہے جو نہ صرف اچھائی کو اپنائے،

بلکہ اس کی حدود کو بھی پہچانے۔ کیونکہ خیر بھی اگر اپنی حدود سے نکل جائے تو خیر نہیں رہتا، اور شرف بھی اگر شعور کے بغیر ہو تو ذلت کا راستہ بن جاتا ہے۔

لہٰذا ہر رویے کی ریڈ لائن وہ جگہ ہے جہاں نیت اپنی شفافیت کھو دے، یا عمل شعور سے کٹ جائے۔ جو انسان مسلسل اپنی نیت اور کیفیت کو پرکھتا ہے، وہ اس حد کو دیکھ لیتا ہے۔ اور جو دیکھ لیتا ہے، وہ گم نہیں ہوتا۔ وہی روشنی میں جیتا ہے، چاہے دنیا اندھیرے میں ہو۔

سماجی تعلقات میں بھی ایک حد ہے، ایک توازن، ایک ریڈ لائن —جو اگر عبور کرلی جائے تو یہی تعلقات جو پہلے قوت کا ذریعہ تھے، کمزوری، الجھن اور روحانی زوال کا باعث بننے لگتے ہیں۔

سماجی رابطوں کی سب سے پہلی ریڈ لائن خودی کی حدود ہیں۔ جب ہم دوسروں کے ساتھ اس درجہ مشغول ہو جاتے ہیں کہ اپنی ذات کا شعور، اپنی خاموشی، اپنی تنہائی، اور اپنی اصل کھو بیٹھتے ہیں، تو یہ تعلق صحت مند نہیں رہتا۔ وہ تعلق جو ہمیں اپنی باطنی روشنی سے دور کر دے، جو ہمارے اصولوں، وقت، جذبات یا سوچ پر قبضہ کرنے لگے، وہ دراصل تعلق نہیں بلکہ ایک داخلی غلامی ہے۔ دوست، عزیز یا ہم نشین اگر ہماری روح کی آزادی کو محدود کر دے تو یہ ایک ایسی ریڈ لائن ہے جہاں سے انسان کا وجود بوجھ بننے لگتا ہے۔

ایک اور ریڈ لائن یہ ہے کہ ہم دوسروں کی خوشی، قبولیت یا تائید کے محتاج بن جائیں۔ جب ہماری خوشی اس بات سے مشروط ہو جائے کہ فلاں ہمیں کتنا پسند کرتا ہے، یا فلاں ہمیں کیا

سمجھتا ہے، تب ہم اپنی جذباتی طاقت کسی اور کے ہاتھ میں دے بیٹھتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان سماجی وابستگی کے نام پر اپنی خودی کو رہن رکھ دیتا ہے۔ انسان کو اپنے خلوص، محبت اور خدمتی جذبے کے اظہار میں آزاد ہونا چاہیے، مگر اس کے بدلے میں تائید یا توجہ کی خواہش جب ضرورت میں بدل جائے تو یہی تعلق روح کو غلامی کی زنجیر میں جکڑ لیتا ہے۔

سماجی رابطوں میں ایک باریک ریڈ لائن دوسروں کے مسائل میں حد سے زیادہ مداخلت ہے۔ ہمدردی، مشورہ اور معاونت اپنی جگہ، مگر جب ہم دوسرے کی زندگی کو اپنی اصلاح کی زمین سمجھنے لگیں، جب ہم اپنی سوچ، نظریات یا فیصلے ان پر تھوپنے لگیں، تو تعلق ایک طاقت کے کھیل میں بدل جاتا ہے۔ اور یہ بازی اکثر خلوص کی چادر اوڑھ کر کھیلی جاتی ہے، جس میں ایک شخص نجات دہندہ کا کردار اپناتا ہے اور دوسرا یا تو بیزاری میں مبتلا ہو جاتا ہے یا انحصار کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ ہر انسان کا سفر اس کا ذاتی امتحان ہے، اور اگر ہم اسے اُس کی آزمائش کے ساتھ چلنے کا موقع نہ دیں تو ہم اس کی روحانی آزادی کو صلب کر رہے ہوتے ہیں۔

سماجی تعلقات میں ایک اور نادیدہ ریڈ لائن یہ ہے کہ انسان دوسروں کے خیالات، عادتوں، یا اندازِ زندگی پر مسلسل رائے دینے لگے۔ ہر وقت تجزیہ، تنقید، اصلاح اور مشورہ دینا ایک طرح کی ذہنی جارحیت ہے، جو بظاہر خیر خواہی میں لپٹی ہوتی ہے مگر اصل میں دوسروں کو اپنے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ رویہ دوسروں کو سمیٹنے کے بجائے ان کو دور کر دیتا ہے، کیونکہ ہر شخص اپنی انفرادیت کے ساتھ جینے کا حق رکھتا ہے۔ جو تعلقات

مسلسل رائے دہی اور نگرانی کی زد میں ہوں، وہ تنگ ہو جاتے ہیں، ان میں محبت گھٹ جاتی ہے، اور روحانی سکون چھننے لگتا ہے۔

کبھی سماجی تعلقات میں ریڈ لائن وہ ہوتی ہے جب ہم اپنے اندر کے درد، خوف، یا احساسِ کمتری کا علاج دوسروں کی موجودگی سے کرنے لگتے ہیں۔ ہم مسلسل محفلوں، گفتگوؤں یا سماجی مصروفیتوں میں خود کو کھپا دیتے ہیں، صرف اس لیے کہ ہم اپنے اندر کی خاموشی، تنہائی یا خلاء کا سامنا نہیں کر پاتے۔ یہ تعلقات اب خود کو بھرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ خود سے بچنے کی کوشش بن جاتے ہیں، اور یہی وہ ریڈ لائن ہے جہاں انسان کی روح تھکن کا شکار ہو جاتی ہے۔

سماجی رابطے خوبصورت ہوتے ہیں جب وہ باہمی عزت، آزادی، ہمدردی اور محبت کے اصول پر قائم ہوں۔ وہ دل کو وسعت دیتے ہیں، انسان کو نکھارتے ہیں اور زندگی میں رنگ بھرتے ہیں۔ مگر جب یہی تعلقات جبر، انحصار، توقعات یا خودی کی قربانی کا میدان بن جائیں تو وہ بگاڑ پیدا کرنے لگتے ہیں۔ توازن اس میں ہے کہ انسان دوسروں سے جڑے، مگر اپنی مرکزیت کے ساتھ؛ محبت دے، مگر اپنی خودی کا سودا کیے بغیر؛ سنجیدگی سے سنے، مگر اپنی خاموشی کا دھیان رکھے؛ اور دوسروں کا درد محسوس کرے، مگر اپنی روح کا بوجھ ان پر نہ ڈالے۔

تعلق کی خوبصورتی اس میں نہیں کہ ہم ہمیشہ قریب رہیں، بلکہ اس میں ہے کہ جب بھی ملیں، تو ایک دوسرے کو آزاد، مکمل اور محبت سے بھرا ہوا پائیں۔ وہ تعلق ہی اصل تعلق ہوتا ہے جو ایک دوسرے کو اپنے ہونے کی اجازت دیتا ہے—اور جو ہماری خودی کو روشن

کرتا ہے، بجھاتا نہیں۔ یہی وہ شعور ہے جو ہمیں سماجی تعلقات کی ریڈ لائنز پہچاننے، ان کا احترام کرنے، اور ان سے خوشبو کی طرح جڑنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔

ریڈ لائنز صرف بیرونی اصول نہیں بلکہ ہمارے باطن کی وہ سرحدیں ہیں جو ہمیں اپنی اصل سے جوڑے رکھتی ہیں۔ جو انسان ان حدود کو پہچانتا ہے، وہ نہ خود کو کھونے دیتا ہے، نہ دوسروں کو اپنی حدود میں دخل اندازی کی اجازت دیتا ہے۔ یہی شعور انسان کو متوازن، باوقار اور بامقصد بناتا ہے۔ ریڈ لائنز کا شعور زندگی کو ان کہی خرابیوں سے بچاتا ہے، اور باطن کو ایک ایسی روشنی دیتا ہے جس سے ہر تعلق، ہر فیصلہ اور ہر قدم صاف، ہلکا اور پُر اثر ہو جاتا ہے۔

انسانی نفسیات میں امام کی فطری احتیاج

انسان کی فطرت اور اس کے حالات اسے ہمیشہ ایک خارجی سہارا تلاش کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، ایک ایسی ہستی جو اس کی کمیوں کو پورا کرے اور اسے اعتماد اور یقین کی بنیاد فراہم کرے۔ یہ خارجی سہارا اس کی داخلی نفسیاتی ضرورت ہے جو اسے کسی برتر ہستی کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ ایسی ہستی چاہتا ہے جو اس کی تمام مشکلات کو حل کرے، اس کی روحانی اور مادی کمیوں کو پورا کرے، اور اس کی زندگی کو ایک مقصد اور سکون فراہم کرے۔ جب انسان کسی کو اپنا معبود یا امام تسلیم کرتا ہے، تو اس کے دل میں محبت، عقیدت، اور تعظیم کے تمام جذبات اس ہستی کے لیے مختص ہو جاتے ہیں۔ یہ جذبات اس کی فطرت میں موجود ہیں اور خدا نے ان کی تخلیق کی ہے تاکہ انسان خدا اور اس کے نمائندوں کی طرف مائل ہو۔

خدا نے انسان کی اس فطری ضرورت کا مداوا اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے کیا ہے۔ یہ نمائندے، جو ید اللہ، عین اللہ، اور وجہ اللہ کہلاتے ہیں، وہ ہستیاں ہیں جنہیں خدا نے انسانوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا۔ ان ہستیوں کی تعلیمات اور کردار انسان کو خدا کے قریب لاتے ہیں اور اسے زندگی کے حقیقی مقصد سے روشناس کراتے ہیں۔ یہ نمائندے انسان کو اس کی روحانی اور اخلاقی بلندی تک پہنچانے کے لیے خدا کے پیغام کو واضح اور مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

تاہم، ظاہر پرست انسان، جو اکثر ظاہری دنیا کے اثرات میں الجھ کر رہ جاتا ہے، خدا کے ان نمائندوں کو قبول نہیں کرتا کیونکہ خدا خود نظر نہیں آتا۔ ایسے لوگ عام طور پر ایسی نظر آنے والی ہستیوں کو اپنا رہنما یا پیشوا بنا لیتے ہیں جو دراصل اس مقام کے مستحق نہیں ہوتیں۔ یہ ہستیاں ذاتی پسند، سماجی روایات، یا دنیاوی معیاروں کے تحت سردار یا پیشوا بنائی جاتی ہیں۔ جب انسان کو کسی ایسی شخصیت کا سامنا نہ ہو جو اس کی توقعات پر پورا اترے، تو وہ ماضی کی مقدس شخصیات کے بت بنا کر ان کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ انبیاء اور خدا کے نمائندوں کو بھی اسی طرح مسترد کیا جاتا ہے کیونکہ وہ سماج کے طے شدہ معیاروں پر پورا نہیں اترتے۔ ان معیاروں میں عموماً دنیاوی دولت، سماجی مقام، یا دیگر ظاہری خصوصیات شامل ہوتی ہیں، جبکہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ سرداری کی شرائط ان تمام معیاروں سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان شرائط کو سمجھنا اور قبول کرنا منکرین کے لیے مشکل ہوتا ہے، اس لیے وہ انبیاء کی رہنمائی کو مسترد کر دیتے ہیں۔

ابلیس کا حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کرنا ایک گہری نفسیاتی حقیقت کی عکاسی کرتا ہے، جو غرور، حسد، اور برتری کے احساس سے جڑی ہوئی ہے۔ ابلیس نے اپنی تخلیق کو حضرت آدمؑ کی تخلیق سے بہتر قرار دیا اور اس بنیاد پر خدا کے حکم کو رد کر دیا۔ یہ رویہ نہ صرف خدا کی حکمت کو چیلنج کرتا ہے بلکہ اس میں ایک مخصوص نفسیاتی مزاحمت بھی ظاہر ہوتی ہے، جو بالاتر ہستی کی برتری اور سرداری کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔ یہی نفسیات منکرین انبیاء اور منکرین ولایت اہل بیتؑ میں بھی نظر آتی ہے، اور اس کا بنیادی جواز انسان کے اندر موجود غرور اور اپنے محدود فہم پر اصرار ہوتا ہے۔

منکرین انبیاء کی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انبیاء کو اکثر ان کے سماجی مقام، مادی حیثیت، یا ظاہری وجاہت کی بنیاد پر رد کیا گیا۔ وہ افراد جنہوں نے انبیاء کی رسالت کو مسترد کیا، عموماً ان کے اندر یہ احساس پایا جاتا تھا کہ انبیاء ان کے برابر یا کمتر ہیں اور ان کی سرداری کو قبول کرنا ان کے اپنے مقام اور مرتبے کے خلاف ہو گا۔ انبیاء کا پیغام توحید، عدل، اور مساوات پر مبنی ہوتا ہے، جو کہ غرور و تکبر سے لبریز شخصیات کے لیے ناقابل قبول ہوتا ہے۔ اسی طرح، منکرین ولایت اہل بیتؑ کے رویوں میں بھی یہی مزاحمت دیکھی جاتی ہے۔ اہل بیتؑ کی فضیلت، علم، اور کردار کی برتری واضح ہونے کے باوجود، ان کی ولایت کو تسلیم نہ کرنا ایک نفسیاتی جنگ کی علامت ہے جہاں ذاتی برتری، انا، اور دنیاوی مفادات غالب آ جاتے ہیں۔

یہ نفسیات دراصل ایک ہی مائنڈ سیٹ کی عکاسی کرتی ہے جو بالاتر ہستی کی سرداری کو اپنے غرور کی بنا پر مسترد کرتا ہے۔ جب کوئی فرد اپنی ذات، اپنی سوچ، اور اپنی حیثیت کو ہر چیز سے بالاتر سمجھنے لگے، تو وہ نہ صرف حق کو تسلیم کرنے سے قاصر رہتا ہے بلکہ اپنی نفسیاتی حالت کو حق کے خلاف ڈھال کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ابلیس کا انکار بھی اسی مائنڈسیٹ کا مظہر تھا، جہاں اس نے اپنی تخلیق کی بنیاد پر اپنی برتری کا دعویٰ کیا اور خدا کے حکم کو اپنی ذات کے خلاف سمجھا۔ یہی رویہ ان افراد میں بھی دیکھا جاتا ہے جو انبیاء اور اولیاء کو محض اس لیے مسترد کرتے ہیں کہ ان کی سرداری کو قبول کرنے سے ان کی اپنی انا مجروح ہوتی ہے۔

نفسیاتی تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ ایسے رویے میں بنیادی عنصر "غرور" ہے، جو انسانی شخصیت کا ایک نہایت پیچیدہ پہلو ہے۔ غرور انسان کو حقیقت سے دور کر دیتا ہے اور اسے اپنی محدود

سوچ میں قید کر دیتا ہے۔ جب ایک فرد یہ ماننے سے انکار کرتا ہے کہ کوئی اس سے زیادہ برتر یا حق پر ہو سکتا ہے، تو وہ ایک دفاعی کیفیت میں آجاتا ہے جہاں ہر دلیل اور ہر حقیقت اس کے ذہن میں رد کر دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس، عاجزی انسان کو حق کی جانب کھینچتی ہے اور اسے اپنی کمیوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

منکرین انبیاء اور اہل بیتؑ کے لیے، ان کے انکار کی ایک اور نفسیاتی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو خطرے میں محسوس کرتے ہیں۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی تعلیمات عدل، برابری، اور اخلاقیات پر مبنی ہوتی ہیں، جو ان کے مفادات اور سماجی برتری کو چیلنج کرتی ہیں۔ ان تعلیمات کو قبول کرنا ان کے لیے اپنی طاقت، اثر، اور دنیاوی مقام کو ترک کرنے کے مترادف ہوتا ہے، اور یہ ایک ایسا فیصلہ ہوتا ہے جسے غرور کا شکار انسان قبول نہیں کر پاتا۔

لہٰذا، ابلیس سے لے کر منکرین انبیاء اور منکرین ولایت اہل بیتؑ تک، یہ نفسیاتی رویہ ایک ہی مائنڈ سیٹ کی پیداوار ہے۔ یہ مائنڈ سیٹ اس وقت وجود میں آتا ہے جب انسان اپنے آپ کو عقل و شعور اور حیثیت میں سب سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے اور اپنی ذات کے غرور میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ حق اور حقیقت کو دیکھنے اور تسلیم کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ اس مائنڈ سیٹ کو شکست دینے کے لیے انسان کو عاجزی، انصاف پسندی، اور حقیقت کی جستجو کو اپنی زندگی کا محور بنانا ہو گا، ورنہ وہ بھی ابلیس کی طرح اپنی ذات کے خول میں قید ہو کر رہ جائے گا۔

اس مائنڈ سیٹ کا گہرائی سے تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم انسانی نفسیات، سماجی حرکیات، اور روحانی حقائق کو یکجا کر کے سمجھیں۔ یہ مائنڈ سیٹ دراصل انسان کی اس داخلی

کمزوری سے جنم لیتا ہے جو اپنی ذات کو مرکزیت دینے کے رجحان سے عبارت ہے۔ جب انسان اپنی شخصیت، اپنی عقل، یا اپنے نظریات کو مطلق سچائی سمجھنے لگتا ہے، تو اس کے اندر یہ رویہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی بالاتر حقیقت یا ہستی کی سرداری کو تسلیم نہ کرے۔ یہ انکار دراصل دو بنیادی عوامل پر مبنی ہوتا ہے: ایک، خود پسندی اور دوسرا، خوف۔

خود پسندی انسان کو یہ باور کراتی ہے کہ وہ اپنی حقیقت کا خود مالک ہے اور کسی بالاتر ہستی یا اصول کی طرف جھکنا اس کی ذاتی خود مختاری کے خلاف ہے۔ یہ رویہ ابلیس کی نفسیات میں بالکل واضح ہے، جہاں اس نے اپنی تخلیق کی بنیاد پر حضرت آدمؑ کی فضیلت کو مسترد کیا۔ اس کا ماننا تھا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، جو مٹی سے افضل ہے، اور اس بنیاد پر اس نے خدا کے حکم کو رد کر دیا۔ یہی اصول منکرین انبیاء اور منکرین ولایت اہل بیتؑ پر بھی لاگو ہوتا ہے، جو اپنی سماجی حیثیت، علم، یا طاقت کے نشے میں کسی ایسی ہستی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں جو ان کے ظاہری معیار پر پورا نہ اترتی ہو۔

یہ مائنڈ سیٹ انسان کے اندر موجود خوف سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یہ خوف اس بات کا ہے کہ بالاتر ہستی کی سرداری کو تسلیم کرنے کا مطلب اپنی موجودہ حیثیت، اختیارات، یا طاقت کو ترک کرنا ہو گا۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی تعلیمات، جو عدل، مساوات، اور حقوق پر مبنی ہوتی ہیں، اکثر ان لوگوں کے لیے خطرہ بن جاتی ہیں جو اپنی طاقت کو دوسروں کے استحصال کے ذریعے قائم رکھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ تعلیمات اپنی بنیاد کھونے کے مترادف ہوتی ہیں، اور اس لیے وہ انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر یہ مائنڈ سیٹ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان کا "انا" ضرورت سے زیادہ مضبوط ہو جائے۔ "انا" کا مطلب ہے اپنی شناخت، حیثیت، اور اختیار کو اتنا اہم سمجھنا کہ وہ

دوسرے تمام حقائق پر غالب آجائے۔ جب انسان کے اندر عاجزی کی کمی ہوتی ہے، تو اس کا ذہن ہر اس چیز کے خلاف مزاحمت کرنے لگتا ہے جو اس کی "انا" کو چیلنج کرے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین انبیاء اور اہل بیتؑ کو ان کی سرداری اور فضیلت تسلیم کرنے میں مشکل ہوتی ہے، کیونکہ یہ ان کے اندر موجود "انا" کے خلاف جاتی ہے۔

سماجی طور پر یہ مائنڈ سیٹ اس وقت زیادہ پروان چڑھتا ہے جب کسی معاشرے میں طاقت، دولت، یا علم کو بالادستی کی علامت سمجھا جائے۔ ایسے معاشروں میں لوگ انبیاء اور اولیاء کی تعلیمات کو غیر اہم یا غیر عملی سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ ان تعلیمات کو اپنے مفادات کے خلاف پاتے ہیں۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی شخصیتیں اپنی سادگی، دیانت، اور اصول پسندی کی وجہ سے ان سماجی روایات کو چیلنج کرتی ہیں، جو طاقت اور حیثیت کو بنیاد بناتی ہیں۔ نتیجتاً، منکرین ان کے خلاف ایک نفسیاتی اور سماجی دیوار کھڑی کر لیتے ہیں۔

روحانی اعتبار سے یہ مائنڈ سیٹ انسان کے خدا سے تعلق کے فقدان کی عکاسی کرتا ہے۔ جب انسان خدا کو اپنی زندگی کا مرکز نہیں بناتا اور اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیتا ہے، تو وہ ہر اس حقیقت کو مسترد کر دیتا ہے جو اس کے اندرونی تضادات کو بے نقاب کرے۔ خدا کے نمائندے انسان کو اس کی حقیقت دکھانے اور اسے اس کے روحانی سفر کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اگر انسان کے اندر انکساری اور حق کی طلب نہ ہو، تو وہ اس دعوت کو مسترد کر دیتا ہے۔

یہ مائنڈ سیٹ ایک گہری نفسیاتی، سماجی، اور روحانی بیماری ہے جو انسان کو حقیقت کے قریب آنے سے روک دیتی ہے۔ اس کا علاج صرف اس وقت ممکن ہے جب انسان اپنے اندر عاجزی پیدا کرے، اپنی محدودیت کو تسلیم کرے، اور اپنے دل و دماغ کو حق کی تلاش کے

لیے کھول دے۔ انبیاء اور اہل بیتؑ کی تعلیمات کا مقصد یہی ہے کہ انسان کو اس بیماری سے نکالا جائے اور اسے خدا کی معرفت تک پہنچایا جائے۔ لیکن یہ سفر اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی "انا" کو ترک کر کے سچائی کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہو۔

ہم نے جس مائنڈ سیٹ کی نشاندہی کی ہے، وہ حقیقت میں ایک ہی بنیادی نفسیاتی اور روحانی رویے کا اظہار ہے، جو انسان کی انانیت، غرور، اور خود ساختہ برتری کے احساس سے جڑا ہوا ہے۔ اس رویے کی جڑیں اس حقیقت میں پنہاں ہیں کہ انسان جب اپنے نفس کو مرکزیت دے لیتا ہے، تو وہ کسی بالاتر ہستی یا اصول کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ یہ مائنڈ سیٹ ہر زمانے اور ہر طبقے میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے، لیکن اس کا جوہر ایک ہی ہے۔

ابلیس کا حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار محض ایک عمل نہیں تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک گہری نفسیات کارفرما تھی۔ ابلیس نے اپنی تخلیقی برتری (آگ) کو بنیاد بنا کر آدمؑ (مٹی) کے انتخاب کو مسترد کیا۔ یہ انکار دراصل اللہ کے فیصلے اور حکمت کو مسترد کرنا تھا، جو اس کے نفس کے غرور کی انتہا کی نشانی تھی۔ یہی نفس پرستی اور خود کو برتر سمجھنے کا مائنڈ سیٹ انبیاء کے انکار کرنے والے مشرکین و کفار میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ اپنی روایات، مفادات، اور سماجی برتری کے دائرے میں اس قدر جکڑے ہوئے تھے کہ وہ کسی ایسے پیغام کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے جو ان کے نظریات یا اقتدار کو چیلنج کرتا تھا۔

یہی رویہ مسلمانوں میں بھی منافقین کے طور پر ظاہر ہوا، جو بظاہر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن حقیقت میں رسولؐ اور ان کے جانشینوں کی قیادت کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ ان کی مخالفت نہ صرف رسولؐ کی ذات کے خلاف تھی بلکہ وہ اس الٰہی منصوبے

کے خلاف تھے جو انسانیت کو ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی منزل تک لے جانے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔

علماء اور ولی فقیہ کے حوالے سے غالی اور مقصرین کا رویہ بھی اسی مائنڈ سیٹ کا تسلسل ہے۔ غالی اپنے جذباتی یا فکری انحراف کی وجہ سے علماء اور ولی فقیہ کے کردار کو غیر اہم سمجھتے ہیں اور اپنی خود ساختہ تعبیرات کو برتر قرار دیتے ہیں، جبکہ مقصرین ان کی اتھارٹی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، اکثر اپنی انا، جہالت یا دنیاوی مفادات کی وجہ سے۔ ان دونوں گروہوں کا رویہ اس بات کا عکاس ہے کہ وہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ قیادت کے اصول کو تسلیم کرنے کے بجائے اپنی مرضی کے اصول بناتے ہیں۔

ولی فقیہ کے نمائندے کے مقابلے پر سپر انقلابیوں کا رویہ بھی اسی مائنڈ سیٹ کا حصہ ہے۔یہ لوگ خود کو انقلاب کا حقیقی محافظ سمجھتے ہیں اور ولی فقیہ کی قیادت کو اس کے تقاضوں کے مطابق سمجھنے اور قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ "اصلاح" یا "انقلاب کے تحفظ" کے لیے کام کر رہے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ رویہ ان کی ذاتی انا، نظریاتی شدت پسندی، یا ناقص فہم کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ تمام مثالیں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ ایک ہی مائنڈ سیٹ ہے جو خود کو برتر سمجھنے، اپنی خواہشات کو الٰہی ہدایت پر ترجیح دینے، اور کسی بالاتر قیادت یا اصول کو قبول نہ کرنے سے جنم لیتا ہے۔ اس مائنڈ سیٹ کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی انا کو توڑے، اپنی حیثیت کو سمجھے، اور خدا کی طرف سے مقرر کردہ قیادت کو دل و جان سے قبول کرے۔ قرآن کریم اور احادیث اس بات پر زور دیتے ہیں کہ حقیقی کامیابی صرف اللہ کے سامنے جھکنے، اس کے نمائندوں کی اطاعت کرنے، اور اپنی خواہشات کو الٰہی ہدایت کے تابع

کرنے میں ہے۔ جب تک انسان اپنے نفس کے غلام رہیں گے، یہ مائنڈ سیٹ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا رہے گا، اور اس کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تباہ کن رہیں گے۔ انسان کی زندگی کا حقیقی مقصد محض دنیاوی سکون یا عارضی راحتوں کا حصول نہیں بلکہ روحانی تکمیل اور حقیقت تک پہنچنا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کو ایک اعلیٰ مقصد کے تحت گزارنا چاہیے اور یہ مقصد صرف خدا کی ہدایات اور رہنمائی سے متعین ہو سکتا ہے۔ خدا نے اپنی ہدایات کو انبیاء اور اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچایا، جو کہ انسان کی فطری خلا کو پر کرنے اور اسے صحیح راستے پر گامزن کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

خدائی نمائندے ہمیشہ سچائی اور صداقت پر مبنی پیغام دیتے ہیں۔ ان کی تعلیمات میں ہمیشہ عدل، محبت، انسانیت کی بھلائی، اور روحانی حقیقتوں کی وضاحت شامل ہوتی ہے۔ ان کی شخصیت دیانت، پاکیزگی، اور خدا کے ساتھ گہرے تعلق کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ دنیاوی مفادات اور ذاتی فوائد سے آزاد ہوتے ہیں اور ان کے کردار اور عمل میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔ ان کی تعلیمات ہمیشہ قرآن اور خدا کی ہدایات سے ہم آہنگ ہوتی ہیں اور ان میں کسی قسم کا تضاد یا خامی نہیں ہوتی۔ ان کی شخصیت اور کردار انسانوں کے لیے عملی نمونہ ہوتا ہے اور وہ اپنے معجزات اور کرامات کے ذریعے اپنی صداقت کو ثابت کرتے ہیں۔

انسان کو اپنی عقل اور بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے ان نمائندوں کی صداقت کو سمجھنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ وہ کسی بھی شخصیت کو بغیر سوچے سمجھے یا ذاتی پسند کے تحت اپنا رہنما نہ بنائے بلکہ خدا کی ہدایات کے مطابق ان کے کردار، تعلیمات، اور عمل کو پرکھے۔ صرف اسی صورت میں انسان حقیقی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے اور اپنی روحانی ضروریات کو

پورا کرتے ہوئے خدا کے قریب آسکتا ہے۔ یہ خدائی نمائندے ہی انسان کی زندگی کو مقصد، سکون، اور ابدی کامیابی کی طرف لے جانے والے حقیقی رہنما ہیں۔

انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی

انفرادی شعور اور اجتماعی زندگی کا تعلق اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ انسانی تمدن کی ہر پرت میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انسان اپنی فطرت میں ایک باشعور مخلوق ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے، سوچتا ہے، جانتا ہے، سیکھتا ہے، اور انہی مراحل سے گزر کر اپنی ذات کے بارے میں آگاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ آگاہی، یعنی انفرادی شعور، درحقیقت ایک داخلی روشنی ہے جو انسان کو اپنی ذات، اپنے افعال، اپنے محرکات اور اپنی ذمہ داریوں کا ادراک عطا کرتی ہے۔ انفرادی شعور ہی وہ بنیادی ستون ہے جس پر انسان اپنی زندگی کی سمت طے کرتا ہے۔ لیکن انسانی وجود صرف اپنی ذات تک محدود نہیں۔ وہ فطرتاً ایک اجتماعی مخلوق ہے، جو خاندان، معاشرہ، قوم اور انسانیت کے دائرے میں سانس لیتا ہے۔ لہٰذا اجتماعی زندگی اس کے وجود کا ناگزیر حصہ ہے، اور یہ اجتماعی دائرہ اس وقت تک صحت مند اور متوازن نہیں ہو سکتا جب تک ہر فرد اپنے شعور میں بیدار نہ ہو۔

انفرادی شعور انسان کو اپنے حقوق اور فرائض کا شعور عطا کرتا ہے۔ جب ایک فرد اس بات کو جانتا ہے کہ اس کا ایک عمل نہ صرف اس کی ذاتی زندگی پر بلکہ پورے معاشرے پر اثرانداز ہوتا ہے، تو وہ اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہے۔ یہی احساس اسے دوسروں کے حقوق کی رعایت سکھاتا ہے، اور یہی شعور اسے ظلم، ناانصافی اور بددیانتی جیسے اجتماعی

امراض سے دور رکھتا ہے۔ اگر معاشرے میں افراد شعور سے عاری ہوں تو وہ محض ہجوم میں بدل جاتے ہیں، جہاں ہر شخص صرف اپنی بقا، مفاد یا خواہش کے گرد گھومتا ہے، اور پھر اجتماعی زندگی میں بے حسی، افراتفری اور بربادی جنم لیتی ہے۔

اجتماعی زندگی کا حسن اسی وقت ممکن ہے جب افراد کا شعور اعلیٰ اقدار سے منسلک ہو۔ وہ اقدار جو عدل، محبت، احترام، صداقت، قربانی اور ہمدردی پر قائم ہوں۔ یہ اقدار صرف تعلیم یا وعظ سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ داخلی طور پر جاگے ہوئے شعور سے جنم لیتی ہیں۔ جب فرد اپنے باطن سے جڑا ہوتا ہے تو وہ اجتماعی مسائل کو بھی اپنی ذات کا حصہ سمجھتا ہے۔ وہ کسی مظلوم کو دیکھ کر صرف تماشائی نہیں رہتا، بلکہ اس کے درد کو اپنا درد سمجھ کر ردعمل دیتا ہے۔ ایک باشعور فرد نہ صرف ذاتی اصلاح کی کوشش کرتا ہے بلکہ اپنے ارد گرد کے نظام کو بھی بہتر بنانے کی کوشش میں جُت جاتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں جو بگاڑ، زوال اور انحطاط نظر آتا ہے، اس کی جڑیں اسی وقت سمجھ آتی ہیں جب انفرادی شعور کے بحران کو پہچانا جائے۔ ہر انقلاب، ہر فکری تحریک، ہر سماجی تبدیلی کا آغاز فرد کے شعور کی بیداری سے ہوا ہے۔ جب کوئی فرد ظلم کو ظلم سمجھتا ہے، ناانصافی کے خلاف بولنے کی ہمت پیدا کرتا ہے، جب وہ حق کی آواز بلند کرنے کو فرض سمجھتا ہے، تب ہی معاشرے میں ایک لہر دوڑتی ہے۔ یہ لہر اگر چند باشعور افراد تک محدود رہے تو اس کے اثرات محدود ہوتے ہیں، لیکن جب اجتماعی سطح پر شعور بیدار ہو جائے تو وہ اقوام کی تقدیر بدل دیتا ہے۔

دین اسلام بھی انفرادی شعور اور اجتماعی ذمہ داری کو جدا نہیں کرتا۔ قرآن بارہا انسان کو "افلا تعقلون"، "افلا تتفکرون"، اور "اولی الالباب" کہہ کر شعور کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے سب سے پہلے انسان کے شعور کو جھنجھوڑا، اسے اس کے مقام، اس کی حیثیت اور اس کے عمل کے نتائج سے آگاہ کیا۔ جب شعور جاگا تو عمل بدلا، اور جب عمل بدلا تو معاشرہ بدلا۔

انفرادی شعور اگر صرف نفس پرستی، دنیا پرستی یا سطحی کامیابیوں تک محدود ہو جائے تو اجتماعی زندگی میں توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر فرد کا شعور بلند ہو، وہ اپنی ذات کو ایک وسیع تر مقصد سے جوڑ دے، تو اجتماعی زندگی میں روحانیت، انسانیت اور فلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔ لہٰذا اجتماعی زندگی کی اصلاح کا راستہ فرد کے شعور سے ہو کر گزرتا ہے۔ ہر وہ قدم جو انسان اپنے باطن کو جگانے، اپنے افعال کا محاسبہ کرنے، اور اپنے معاشرتی کردار کو بہتر بنانے کے لیے اٹھاتا ہے، وہ اجتماعی اصلاح کی بنیاد بنتا ہے۔

انفرادی شعور ایک شعلہ ہے، اور اجتماعی زندگی ایک مشعل۔ اگر ہر فرد کے شعور کا شعلہ روشن ہو تو پوری قوم کا چراغ جلتا ہے، اور اگر فرد کا شعور بجھ جائے تو معاشرہ اندھیروں میں ڈوب جاتا ہے۔ اس لیے انفرادی شعور کو بیدار کرنا نہ صرف ایک ذاتی ضرورت ہے بلکہ ایک اجتماعی فریضہ بھی ہے۔

تعلیم کا انفرادی شعور میں اہم کردار ہے، تعلیم اور انفرادی شعور وہ دو بنیادی عناصر ہیں جو انسان کو نہ صرف ذاتی سطح پر بیداری عطا کرتے ہیں بلکہ معاشرتی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی

میدانوں میں اس کی حیثیت کو تعمیری اور بامقصد بناتے ہیں۔ تعلیم ایک ایسا ذریعہ ہے جو معلومات، فہم، استدلال اور مہارتیں فراہم کرتا ہے، جب کہ انفرادی شعور ان تمام چیزوں کو باطنی بیداری، فہمِ مقصد اور اخلاقی معیار کے ساتھ جوڑتا ہے۔ جب تعلیم شعور سے جُڑ جائے تو انسان صرف پڑھا لکھا نہیں ہوتا، بلکہ باشعور، ذمہ دار اور فعال شہری بن جاتا ہے۔ یہی باشعور انسان معاشرے، ریاست اور تہذیب کے لیے ستون کا درجہ رکھتا ہے۔

سیاسی زندگی میں تعلیم اور شعور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک باشعور انسان جانتا ہے کہ سیاست صرف اقتدار کا کھیل نہیں بلکہ عوامی خدمت، قانون سازی، اور اجتماعی نظم کا عمل ہے۔ جب تعلیم یافتہ فرد سیاسی شعور حاصل کرتا ہے تو وہ اندھی تقلید، فرقہ واریت، شخصیت پرستی اور جھوٹے نعروں کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو پہچانتا ہے، اپنے حقِ انتخاب کو سمجھتا ہے، اور سیاستدانوں سے ان کی کارکردگی، دیانت اور نظریاتی سچائی کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہی فرد جب قیادت کے مناصب پر پہنچتا ہے تو قوم کو اصولوں، شفافیت اور عدل پر مبنی سیاست فراہم کرتا ہے، نہ کہ مفاد پرستی، کرپشن یا ذاتی مفادات پر مبنی پالیسیاں۔

معاشی زندگی میں تعلیم اور شعور ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ تعلیم انسان کو صرف نوکری کے قابل نہیں بناتی بلکہ اسے پیداوار، تحقیق، منصوبہ بندی اور اختراع کی صلاحیت دیتی ہے۔ لیکن اگر تعلیم کے ساتھ شعور نہ ہو تو انسان اپنی قابلیت کو صرف ذاتی مفادات، حرص، یا استعماری نظام کے ایجنڈے کی تکمیل میں کھپا دیتا ہے۔ شعور یافتہ فرد جانتا

ہے کہ اس کی معاشی سرگرمیوں کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔ وہ رزقِ حلال، انصاف پر مبنی لین دین، ملازمین کے حقوق، صارفین کی امانت، اور قومی وسائل کی امانت داری کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ ایسے افراد جب معیشت میں سرگرم ہوتے ہیں تو وہ استحصالی سرمایہ داری کے بجائے ایک متوازن، انسانی اور اخلاقی معیشت کی بنیاد رکھتے ہیں۔

تہذیبی زندگی میں تعلیم اور شعور کا کردار اور بھی گہرا ہے۔ ایک تعلیم یافتہ مگر بے شعور فرد مغرب کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر اپنی تہذیب کو پسماندہ سمجھنے لگتا ہے، اور اپنی زبان، لباس، اقدار، اور تاریخ سے کٹ جاتا ہے۔ لیکن جب تعلیم شعور سے جُڑتی ہے تو انسان اپنی تہذیب کے حسن، اس کے فکری سرمایے، اس کی روحانی عظمت اور اس کے تمدنی تنوع کو پہچانتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنی شناخت پر فخر کرتا ہے بلکہ اسے مزید نکھارنے، اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، اور دنیا کے سامنے ایک زندہ تہذیب کے نمائندے کے طور پر پیش کرنے کی جستجو کرتا ہے۔ وہ مغرب کے علم سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اس کے کُلچر کا غلام نہیں بنتا۔ وہ اپنی تہذیب کو ارتقاء کے مراحل سے گزار کر دنیا کو نئی فکری راہیں فراہم کرتا ہے۔

اگر معاشرے میں تعلیم عام ہو لیکن شعور نہ ہو تو وہ معاشرہ ٹیکنیکل طور پر ترقی یافتہ لیکن اخلاقی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں ذہین لوگ بھی ظلم کا ساتھ دیتے ہیں، معاشی چالاکیاں استحصال کا ذریعہ بن جاتی ہیں، اور علم تہذیب کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر تعلیم شعور کے ساتھ پروان چڑھے تو وہ ایسی قیادت،

ایسی معیشت اور ایسی تہذیب پیدا کرتی ہے جو نہ صرف اپنے لیے بلکہ پوری انسانیت کے لیے خیر کا سبب بنتی ہے۔

پس تعلیم اور شعور کا امتزاج ہی وہ طاقت ہے جو انسان کو کٹھ پتلی نہیں، خود مختار و باکردار شخصیت بناتا ہے۔ یہی فرد جب معاشرے کا حصہ بنتا ہے تو سیاست سے لے کر معیشت اور تہذیب تک ہر شعبے میں بیداری، عدل، رشد اور ارتقاء کی شمع روشن کرتا ہے۔ یہی وہ انسان ہے جو اپنی قوم کی تقدیر بدلتا ہے، اور یہی وہ انسان ہے جو وقت کے فرعونوں اور قارونوں کے مقابل حق کا علم بلند کرتا ہے۔

اہل روحانیت و معنویت اور مادہ پرست، ظاہر بینوں کی ازلی جنگ

اہل روحانیت اور اہل مادّہ کی جنگ آفرینش انسان کے دن سے جاری ہے۔ جب آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو ایک طرف ملائکہ نے فوراً سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار کیا، اور اس انکار کی بنیاد ہی مادّہ پرستی تھی۔ اس نے کہا: "أنا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین"۔ یعنی میں اس سے بہتر ہوں، کیونکہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور وہ مٹی سے۔ ابلیس کی نگاہ مادے کی نوعیت، عناصر کی برتری، اور ظاہری قوت پر مرکوز تھی، جبکہ سجدے کا راز روح کے نور، عبدیت، اور الٰہی امر کی تعظیم میں تھا۔ یوں روحانیت و اطاعت اور مادہ پرستی و تکبر کا پہلا معرکہ برپا ہوا، جس کی صدائے بازگشت آج بھی دنیا کی ہر گلی، عدالت، ایوان، اور اسکرین پر سنائی دیتی ہے۔

تاریخ کے ہر دور میں یہ دو گروہ موجود رہے ہیں: ایک وہ جو ظاہر کی چمک، دنیا کی طاقت، زر، زمین، لذت اور جسمانی تفوق کو سب کچھ سمجھتے ہیں، اور دوسرے وہ جو دل کی روشنی، روح کی پاکیزگی، خضوع، اخلاص، اور عبدیتِ الٰہی کو اصل معیار سمجھتے ہیں۔ موسیٰؑ اور فرعون کی جنگ ہو یا ابراہیمؑ اور نمرود کا معرکہ، حسینؑ بن علی اور یزید کے مابین کربلا کی جنگ ہو یا امام خمینیؒ اور شیطانی عالمی نظام کے درمیان انقلاب کی جدوجہد، یہ سب دراصل اسی ازلی و ابدی جنگ کے مظاہر ہیں۔

جدید دور میں مادّہ پرستی نے خود کو سائنس، ٹیکنالوجی، اکنامکس، میڈیا، اور سیاست کے نئے چہروں میں چھپالیا ہے۔ اس کے نمائندے آج کے مغربی سرمایہ دار ہیں، جن میں روتھ چائلڈز، راک فیلرز، بل گیٹس، ایلون مسک، ورلڈ اکنامک فورم، نیٹو، سی آئی اے، ایم آئی سکس، اقوام متحدہ اور دیگر استعمار کی مخلوق شامل ہیں۔ یہ جدید فرعونی قوتیں دنیا پر ایک ایسے نظام کو نافذ کررہی ہیں جو مکمل طور پر روح سے خالی ہے۔ یہ جسم کو سہولت دیتی ہیں مگر روح کو مفلوج کر دیتی ہیں، یہ زبان پر آزادی کا نعرہ دیتی ہیں مگر قلب کو غلامی میں جکڑ دیتی ہیں، یہ ظاہری ترقی دیتی ہیں مگر باطن میں بے سکونی، اضطراب، اور خودکشی کی لعنت چھوڑ جاتی ہیں۔

یہ قوتیں اہل روحانیت کو دقیانوسی، غیر ترقی یافتہ، غیر سائنسی اور ناکارہ ظاہر کرتی ہیں۔ ان کا ہدف یہ ہے کہ انسان صرف اس چیز پر ایمان لائے جو آنکھ سے دیکھی جائے، جس کا پیمانہ مادی ہو، جس کا انجام دنیا میں ہو۔ وہ نماز، ذکر، تقویٰ، توکل، معرفت، شہادت، اور انتظار جیسے مفاہیم کو بے معنی قرار دیتے ہیں۔ وہ "صبر" کو کمزوری، "دعا" کو سستی، "عبادت" کو رجعت پسندی اور "شہادت" کو خودکشی کہتے ہیں۔ اور یوں انسان کو اس کی فطرت سے کاٹ دیتے ہیں تاکہ وہ ایک نفع خور مشین میں بدل جائے۔

مگر خدا کی سنت ہے کہ وہ ہر دور میں اپنے نور کو ان سب اندھیروں کے مقابل روشن کرتا ہے۔ جدید مادہ پرستوں کے مقابل خدا کی روحانی تدبیر یہ ہے کہ وہ خاموش، بظاہر کمزور، مگر باطنی طور پر پرجوش اور ولائی انسانوں کو کھڑا کرتا ہے۔ امام خمینیؒ، شہید مطہری، علامہ

اقبال، شہید عماد مغنیہ، سید حسن نصر اللہ، رہبر معظم سید علی خامنہ ای، شہید قاسم سلیمانی اور شہید رضا شاہ سحوری جیسے لوگ اس الٰہی تدبیر کا حصہ ہیں۔ ان کے پاس نہ دنیا کی دولت، نہ میڈیا، نہ فوجی ساز وسامان، مگر ان کے پاس وہ نور ہے جو قلوب میں اترتا ہے، جو زمانے کو تبدیل کرتا ہے۔

اہل روحانیت کو اس جنگ میں کچھ اصولوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ سب سے پہلے یہ کہ وہ اپنی نیت کو ہر دم پاکیزہ رکھیں۔ دنیا میں اثر، قیادت، حکومت، اور بالا دستی کا ہدف ذاتی نفسانیت نہ بنے بلکہ رضائے الٰہی، اقامتِ حق، اور نصرتِ مستضعفین کا مقصد ہو۔ دوسرے، ان کے اندر اتحاد ہو، یعنی سچے اہل باطن و اہل ولایت باہم لڑنے کی بجائے ایک محاذ پر یکجا ہو جائیں، کیونکہ مادہ پرست قوتیں انہیں آپس میں تقسیم کر کے کمزور کرتی ہیں۔

تیسری بات یہ کہ اہل روحانیت دنیاوی علوم، ٹیکنالوجی، سماجی نظام، ابلاغی طاقت، اور سیاسی شعور سے بے بہرہ نہ رہیں۔ یہ سب "امانت" ہیں جو اگر اہل حق کے ہاتھ میں آئیں تو خدا کی زمین پر عدل قائم کر سکتی ہیں۔ جیسے امام علیؑ نے فرمایا: "الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم"۔ تو اہل روحانیت کو چاہیے کہ وہ ٹیکنالوجی میں، معیشت میں، صحت میں، تعلیم میں، دفاع میں، ابلاغ میں، ہر میدان میں حق کی نمائندگی کریں، مگر اپنی روحانیت اور تقویٰ کو ہر حال میں مقدم رکھیں۔

چوتھی بات یہ کہ اہل روحانیت ہر وقت دشمن کی چالوں کو پہچانیں، ان کے پروپیگنڈا، میڈیا مہم، فلسفیانہ ہتھکنڈوں اور نفسیاتی حملوں سے واقف رہیں۔ اب دشمن صرف ہتھیار سے نہیں لڑتا بلکہ الفاظ، نغمے، کلچر، اور سوچ سے لڑتا ہے۔ اس لیے ایک عارف و مجاہد کو "شناخت" اور "بصیرت" کا قلعہ کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

پانچویں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ "انتظار" کو صرف کسی غیبی نجات کا تصور نہ سمجھیں بلکہ اسے ایک "حرکت"، "تیاری"، "مزاحمت" اور "تبدیلی" کا نظام بنائیں۔ امام مہدیؑ کے ظہور کا منتظر وہی ہے جو ظلم کے خلاف کھڑا ہو، جو حق کا علم بلند کرے، جو معاشرے میں عدل کے بیج بوئے، اور جو خود کو الٰہی لشکر کا سپاہی سمجھے۔

اگر اہل روحانیت ان اصولوں کو تھام لیں، تو وہ نہ صرف مادہ پرستوں کی چالوں کو ناکام بنا سکتے ہیں بلکہ خدا کے اذن سے دنیا کے حقیقی حاکم بن سکتے ہیں۔ وہ دنیا کو اس کے موجودہ انحراف، ظلم، فریب، سرمایہ داری اور شہوت پرستی سے نکال کر ایک الٰہی تمدن کی طرف لے جا سکتے ہیں۔ یہ وعدہ خدا کا ہے: "ونرید أن نمن علی الذین اسـ متضـ عفوا فی الأرض و نجعلھم أئمۃ و نجعلھم الوارثین"۔ اور خدا کا وعدہ سچا ہے۔

ایران اسرائیل جنگ اور پاکستان کا کردار

پاکستان کی حکومت کی ایران اور اسرائیل کے درمیان ممکنہ جنگ میں ایران کی مدد کرنے کی صلاحیت اور آمادگی ایک پیچیدہ اور کئی جہتی سوال ہے، جسے صرف جذبات یا اخباری بیانات کی روشنی میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مسئلہ داخلی سیاسی حالات، عسکری توازن، خارجہ پالیسی، عالمی دباؤ، معاشی حالت، اور پاکستان کے خطے میں اسٹریٹیجک مقاصد جیسے عناصر سے گہرائی سے جڑا ہوا ہے۔

اگر ایران اور اسرائیل کے درمیان براہِ راست جنگ چھڑتی ہے، تو پاکستان کی حکومت فوری طور پر کھل کر ایران کی عسکری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوگی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں توازن کا وہ اصول ہے جس کے تحت پاکستان سعودی عرب، امریکہ، چین، ترکی، اور ایران جیسے مختلف اور بعض اوقات باہم متضاد ممالک کے ساتھ بیک وقت تعلقات کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایران کی کھلی عسکری حمایت کرنے کا مطلب سعودی عرب، امریکہ اور مغربی بلاک کے ساتھ ممکنہ تصادم ہوگا، جو کہ پاکستان کی موجودہ اقتصادی حالت اور سیاسی غیر استحکام کو دیکھتے ہوئے انتہائی مہنگا سودا ہوگا۔

پاکستان کی حکومت کی جانب سے ایران کے اسرائیل مخالف بیانیے کی عمومی تائید اکثر علامتی اور بیاناتی سطح پر محدود رہتی ہے۔ جب ایران پر حملہ ہو یا اسرائیل کے مظالم میں

شدت آئے، تو پاکستان کی حکومت کی جانب سے عمومی طور پر ایک روایتی سا بیان جاری کیا جاتا ہے جس میں "امت مسلمہ کے اتحاد"، "فلسطینی عوام کے حقوق" اور "مشرق وسطیٰ میں امن" کی بات کی جاتی ہے۔ ان بیانات میں ایران کی واضح اور مخصوص حمایت نہیں کی جاتی، بلکہ زبان ایسی اختیار کی جاتی ہے کہ سعودی عرب اور امریکہ جیسے ممالک کو ناراض نہ کیا جائے۔ بعض مواقع پر پاکستانی دفتر خارجہ کے بیانات اس قدر مبہم ہوتے ہیں کہ یہ طے کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ ایران کے بیانیے سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔

اگر عوامی اور مذہبی سطح پر دیکھا جائے تو پاکستان کی عام شیعہ آبادی اور بعض مذہبی جماعتیں جیسے تحریک بیداری، مجلس وحدت المسلمین، اور اہل تشیع کے دیگر حلقے ایران کی اسرائیل مخالف پوزیشن کے حامی ہوتے ہیں اور فلسطین کی حمایت میں بھی سرگرم ہوتے ہیں۔ البتہ حکومتی ادارے ان جذبات کی نمائندگی کرنے میں ہچکچاتے ہیں تاکہ ملکی و بین الاقوامی سطح پر توازن برقرار رہے۔ جب کبھی ایرانی جنرل قاسم سلیمانی جیسے افراد کو شہید کیا گیا، تب بھی پاکستان کی حکومت نے محتاط اور غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیا، حالانکہ عوامی سطح پر شدید غم و غصہ دیکھا گیا۔

پاکستان کی فوجی اور خفیہ پالیسی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی بھی مشرق وسطیٰ کی جنگ میں براہ راست جھونکنے سے گریز کرتی ہے۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ اگر وہ ایران کے ساتھ کھل کر کھڑی ہوتی ہے تو اس کے نتیجے میں پاکستان کو سفارتی اور معاشی محاذوں پر دباؤ کا سامنا ہوگا، خاص طور پر ان ملکوں سے جو اسرائیل کے اتحادی ہیں۔

حتیٰ کہ پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے کی پالیسی تو اپنائی ہوئی ہے، مگر کئی بار "بیک چینل ڈپلومیسی" اور اسرائیل کے ساتھ غیر رسمی رابطوں کی خبریں بھی منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ پاکستان کی حکومت ایران کی اسرائیل مخالف جنگ میں کھلے عام عسکری مدد کرنے کی نہ تو پوزیشن میں ہے، نہ ارادہ رکھتی ہے، اور نہ ہی موجودہ عالمی اسٹریٹیجک ماحول میں اس کی کوئی گنجائش ہے۔ سرکاری بیانات اکثر علامتی ہوتے ہیں، جن کا مقصد عوامی جذبات کو وقتی طور پر مطمئن کرنا اور بین الاقوامی برادری کے سامنے توازن برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ ایران کے لیے حقیقی حمایت یا عملی مدد پاکستان کی پالیسی میں فی الوقت موجود نہیں، اور اس کے امکانات بھی تبھی پیدا ہو سکتے ہیں جب پاکستان کی خارجہ پالیسی میں بنیادی نوعیت کی تبدیلی آئے، جو کہ موجودہ عالمی نظام میں نہایت مشکل ہے۔

پاکستان کی جانب سے ایران کی اسرائیل کے خلاف ممکنہ جنگ میں حمایت کے امکانات کو جب معاشی تناظر میں دیکھا جائے تو تصویر مزید واضح اور حقیقت پسندانہ ہو جاتی ہے۔ پاکستان اس وقت شدید معاشی بحران کا شکار ہے، جس میں زرمبادلہ کے ذخائر کی کمی، آئی ایم ایف کے قرضوں پر انحصار، درآمدات و برآمدات کا غیر متوازن توازن، اور سیاسی غیر یقینی صورتِ حال جیسے عناصر شامل ہیں۔ ان حالات میں کسی بین الاقوامی تنازع، خاص طور پر ایک ایسی جنگ جو اسرائیل جیسے امریکہ نواز ریاست کے خلاف ہو، میں عملی شمولیت یا مدد ایک غیر معمولی معاشی خودکشی کے مترادف ہو گی۔

پاکستان کا معیشتی ڈھانچہ اس وقت سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، چین، اور مغربی مالیاتی اداروں جیسے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی مدد پر قائم ہے۔ اگر پاکستان کھل کر ایران کی عسکری مدد کرے، تو سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک کے ساتھ مالیاتی تعلقات شدید متاثر ہوں گے، خاص طور پر remittances ، تیل کی رعایتی فراہمی، اور بیل آؤٹ پیکجز کے حوالے سے۔ ان عرب ممالک نے کئی بار پاکستان پر یہ واضح کر دیا ہے کہ ایران کے ساتھ بڑھتی ہوئی قربت ان کے مفادات سے متصادم ہے۔ پاکستان اگر ان ممالک کی ناراضی مول لیتا ہے تو فوری طور پر معاشی امداد رک سکتی ہے، جو معیشت کے لیے تباہ کن ہو گا۔

اسی طرح امریکہ اور مغربی دنیا جن پر پاکستان کی برآمدات، بین الاقوامی ترسیلات زر اور قرضوں کی ری شیڈولنگ کا بڑا دارومدار ہے، ایران کے ساتھ کھلی حمایت کو ایک سخت پیغام کے طور پر لیں گے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کو FATF کی گرے یا بلیک لسٹ میں دوبارہ دھکیلنے، مالیاتی پابندیوں اور تجارتی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ ان پابندیوں کا مطلب بین الاقوامی ادائیگیوں، قرضوں کے سود، درآمدی ضروریات، اور ڈالر کی دستیابی کے میدان میں مزید پیچیدگیاں ہوں گی، جو پہلے سے خستہ حال معیشت کو زمین بوس کر سکتی ہیں۔

پاکستان کے اندر معاشی ڈھانچہ ایک بڑے تجارتی خسارے کا شکار ہے، اور صنعتی پیداواری صلاحیت بھی بجلی، ایندھن اور خام مال کی درآمد پر منحصر ہے۔ جنگی تعاون یا ایران کے لیے

دفاعی ولاجسٹک سپورٹ کی فراہمی ان وسائل کی مزید قلت پیدا کرے گی، جبکہ مہنگائی، بیروزگاری اور غربت میں اضافہ ہو گا۔ پاکستانی عوام کی اکثریت جو پہلے ہی معاشی دباؤ میں ہے، ایران کی حمایت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اقتصادی بحران کو قبول نہیں کرے گی، بلکہ اس پر ردعمل آئے گا جس سے داخلی سیاسی عدم استحکام میں اضافہ ہو گا۔

پاکستانی سرمایہ کار، تاجر، اور کاروباری طبقہ بھی کسی ایسی پالیسی کو قبول نہیں کرے گا جو ملک کو بین الاقوامی تجارتی اور مالیاتی نظام سے کاٹ دے۔ ملک میں سرمایہ کاری کا ماحول انتہائی نازک ہے، اور ایران جیسے عالمی پابندیوں کے شکار ملک کے ساتھ عسکری اتحاد کی صورت میں پاکستان بھی انہی پابندیوں کی زد میں آ سکتا ہے، جس کا مطلب ہو گا کہ کوئی غیر ملکی سرمایہ کاری، بینکنگ چینل یا کاروباری اعتماد باقی نہیں رہے گا۔

لہٰذا معاشی زاویے سے دیکھا جائے تو پاکستان کے لیے ایران کی کھلی اور عملی حمایت کرنا ایک ایسا بوجھ ہو گا جسے اس کی کمزور معیشت اٹھا ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی حکومت صرف علامتی حمایت، روایتی بیانات اور "امت مسلمہ" کے اتحاد جیسے مبہم الفاظ پر اکتفا کرتی ہے تا کہ عوامی جذبات کی تسکین بھی ہو جائے اور بین الاقوامی نظام کی ناراضگی بھی مول نہ لی جائے۔ اس توازن کی پالیسی درحقیقت معاشی مجبوریوں کا نتیجہ ہے، نہ کہ خالص سفارتی حکمت عملی۔

ایران کی اسلامی حکومت اور عوام کا اسرافی رویہ

ایران میں 1979 کے اسلامی انقلاب نے محض سیاسی نظام کی تبدیلی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس انقلاب نے ایک ہمہ جہت فکری، روحانی، اقتصادی اور تمدنی بیداری کی بنیاد رکھی۔ اس کے اثرات نہ صرف سیاسی خودمختاری اور عالمی استعمار سے نجات کی صورت میں سامنے آئے بلکہ ایرانی عوام کی روزمرہ زندگی میں روحانی و مادی اعتبار سے غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آج ایرانی معاشرہ ایسے ثمرات سے بہرہ مند ہے جن کی بنیاد صداقت، خودداری، دینی وابستگی، اور قومی خودانحصاری پر رکھی گئی ہے۔

اسلامی جمہوریہ ایران میں اقتصادی شعبہ انقلابی قیادت کی واضح ترجیحات میں شامل رہا ہے۔ ریاست نے یہ اصول طے کیا کہ اسلامی نظام حکومت میں فقر و افلاس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایران میں عام شہری اپنی عمر، قابلیت اور حالات کے مطابق کسی نہ کسی معاشی سرگرمی یا تعلیم و تربیت میں مصروف نظر آتا ہے۔ حکومت نے بنیادی سہولیات جیسے بجلی، پانی، گیس، پیٹرول، ادویات، خوراک، ٹرانسپورٹ اور رہائش پر ایسی مربوط سبسڈی پالیسیاں اپنائی ہیں جو نہ صرف قیمتوں کو قابو میں رکھتی ہیں بلکہ معیار کو بھی متاثر نہیں ہونے دیتیں۔ ان سہولیات میں کوئی کمی یا تعطل عوامی احتجاج یا اضطراب کا سبب نہیں بنتا، کیونکہ ان کی فراہمی کو انقلابی نظام کی بنیادی ذمہ داری سمجھا گیا ہے۔

اسی کے ساتھ ہی ریاستی سطح پر فلاحی نظام بھی مکمل طور پر فعال ہے۔ مستحقین کی مدد، بے سہارا افراد کی سرپرستی، اور کم آمدنی والے طبقات کے لیے مفت یا سستی سہولیات کی فراہمی ریاست کی ترجیحات میں شامل ہے۔ انقلابی ادارے، مساجد، خیراتی تنظیمیں اور نجی افراد مل کر ایک ایسا فلاحی نیٹ ورک تشکیل دیتے ہیں جو معاشرتی ہم آہنگی اور اسلامی اخوت کی عملی تصویر بن چکا ہے۔ تعلیم کا شعبہ خاص طور پر انقلاب کے بعد بہتری کی جانب بڑھا۔ یونیورسٹیاں، دینی مدارس، سائنسی تحقیقی مراکز، اور اسکولز کی کثرت نے نوجوانوں کو دینی و دنیاوی علم سے روشناس کرایا ہے۔

تاہم اس سب کے باوجود ایرانی معاشرے میں بعض ایسے منفی رجحانات بھی سر اٹھا چکے ہیں جو اس روحانی اور انقلابی نظام کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان میں سب سے نمایاں مسئلہ اسراف اور نعمتوں کی ناشکری ہے۔ اگرچہ ریاست نے سہولیات کو سبسڈی کے ذریعے عام کیا، مگر یہ مشاہدہ کیا جارہا ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد ان سہولیات کو غیر ذمہ داری سے استعمال کرتی ہے۔ بجلی، گیس، پانی، پیٹرول، کھانے پینے کی اشیاء اور دیگر وسائل کو ضائع کرنا اب ایک عمومی مزاج بن چکا ہے۔ یہ اسراف صرف معاشی نقصان نہیں بلکہ دینی اعتبار سے بھی ایک قبیح اور ناپسندیدہ عمل ہے جس پر قرآن و سنت میں بارہا تنبیہ کی گئی ہے۔

ایرانی عوام آج جس آسائش و رفاہ کے ماحول میں زندگی گزار رہی ہے، وہ درحقیقت اسلامی انقلاب کی مرہونِ منت ہے جس نے عوامی فلاح و بہبود کو اولین ترجیحات میں شامل رکھا۔ لیکن وقت کے ساتھ جب سہولتیں مستقل، معیاری اور سستے داموں عوام کی پہنچ میں آگئیں تو ان کے ساتھ ایک خطرناک رویہ بھی جنم لینے لگا—اور وہ تھا اسراف، ناشکری اور غفلت۔

آج ایران میں بجلی کا استعمال اس حد تک بے محابا ہو چکا ہے کہ دن ہو یا رات، گھروں میں اکثر کمروں کی تمام لائٹس جلتی رہتی ہیں، ایئر کنڈیشنز اور ہیٹر ہر وقت چلتے ہیں خواہ ان کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اسی طرح گیس کا اسراف سردیوں میں شدید نظر آتا ہے۔ اکثر گھروں میں گیس ہیٹرز بغیر کسی احتیاط کے پورے دن اور رات جلتے ہیں، کھڑکیاں دروازے کھلے ہونے کے باوجود کوئی یہ زحمت گوارا نہیں کرتا کہ توانائی کو محفوظ کیا جائے۔ پانی کی صورتحال بھی اسی طرح کی ہے۔ گاڑیاں روزانہ پانی کے بہاؤ کے ساتھ دھوئی جاتی ہیں، گارڈن اور سڑکوں پر ایسے پانی کا استعمال ہوتا ہے گویا یہ ایک لا محدود وسیلہ ہو، نہ کوئی قحط کا خوف، نہ خشک سالی کی پرواہ۔

پیٹرول، جو ایران میں دنیا کے کم ترین نرخوں پر دستیاب ہے، اس کا استعمال بھی حیرت انگیز حد تک غیر ذمہ دارانہ ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے سفر کے لیے گاڑی نکالنا، ٹریفک میں کھڑے کھڑے انجن چلانا، فالتو ڈرائیو پر جانا معمول بن چکا ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا ہے جب ملک کو سخت ترین عالمی پابندیوں کا سامنا ہے اور تیل و گیس کی برآمدات شدید متاثر ہو چکی ہیں۔ خوراک کا معاملہ بھی مختلف نہیں۔ گھروں میں روزانہ اتنا کھانا بنایا جاتا ہے جو اکثر ضائع ہوتا ہے، تقریبات میں میزوں پر اتنا کھانا سجایا جاتا ہے جو بعد میں کچرے کا حصہ بن جاتا ہے، جبکہ انھی دنوں ہمسایہ ملکوں میں لوگ روٹی کے ایک ٹکڑے کو ترس رہے ہیں۔

ان تمام رویوں نے عوامی فکری ساخت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ قناعت، احساسِ نعمت، شکر گزاری، اور اجتماعی ذمہ داری جیسے اسلامی و انقلابی اقدار بتدریج کمزور ہو چکے ہیں۔ عوام

کی اکثریت اب آسائشوں کو اپنا حق سمجھتی ہے نہ کہ ایک الٰہی نعمت، اور یہی سوچ انہیں سست، مصلحت اندیش اور راحت پسند بناتی جا رہی ہے۔ نتیجتاً معاشرہ اب وہ انقلابی فکر کھو بیٹھا ہے جو قربانی، مزاحمت اور خود انحصاری پر مبنی تھی۔

یہ فکری زوال ہی وہ عنصر ہے جس نے اصلاح پسند کہلانے والی مغرب زدہ جماعتوں کو دوبارہ اقتدار میں آنے کا موقع دیا۔ یہ جماعتیں اپنے قول و فعل سے بارہا یہ ثابت کر چکی ہیں کہ ان کے دل مغرب کے لیے دھڑکتے ہیں، ان کی نگاہیں مغرب سے امیدیں وابستہ رکھتی ہیں، اور وہ اسلامی انقلاب کے بنیادی اصولوں کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہیں۔ اس جماعت نے عوام کو یہ باور کرایا کہ اگر ایران کو ترقی کرنی ہے، تو اسے مغرب کی اطاعت کرنی ہوگی، ان کی ثقافت، معیشت اور سیاست کی نقالی کرنی ہوگی۔ عوام جو پہلے ہی سہولتوں اور آرام طلبی کے خوگر ہو چکے تھے، اس مغرب زدہ بیانیے سے متاثر ہوئے اور فریب خوردہ امیدوں کے تحت ایک بار پھر ان لوگوں کو ووٹ دیا جنہوں نے ماضی میں بھی نہ صرف ملکی وقار کو ٹھیس پہنچائی بلکہ معیشت کو بحرانوں میں جھونک دیا۔

ایران کی موجودہ حالت، جہاں ایک طرف انقلابی نظام کی برکات واضح ہیں اور دوسری طرف عوامی رویوں میں غفلت اور دنیا پرستی نمایاں ہو چکی ہے، اس بات کی متقاضی ہے کہ فکری بیداری پیدا کی جائے۔ جب تک عوام سہولت کو نعمت نہ سمجھیں، اور جب تک وہ اسراف اور غفلت کو ترک نہ کریں، تب تک وہ ایسے مغرب پرست دھوکابازوں کے چکر میں آتے رہیں گے جو صرف تسلط پسند طاقتوں کے ایجنڈے کو تقویت دیتے ہیں اور انقلاب کے خالص اصولوں کو مصلحت کے نام پر قربان کرتے ہیں۔ اس وقت ایران کو جس چیز کی

سب سے زیادہ ضرورت ہے، وہ فکری انقلاب ہے، ورنہ مادی انقلاب کے ثمرات رفتہ رفتہ زائل ہوسکتے ہیں۔

اسلامی نظام کی قیادت، بالخصوص رہبر معظم سید علی خامنہ ای اور دیگر علمانے بارہا اپنے خطبات اور پیغامات میں اسراف کے خلاف خبردار کیا ہے۔ حکومت کی جانب سے بھی ٹیلیویژن، اخبارات، اسکولوں اور مساجد کے ذریعے مہمات چلائی جاتی ہیں تاکہ عوام کو اسراف کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔ لیکن سہولیات کی کثرت اور ایک حد تک ریاستی کفالت نے عوام میں ایک قسم کی عافیت طلبی، آرام پرستی اور غیر شعوری غفلت کو جنم دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف ان نعمتوں کی قدر کھو بیٹھے ہیں بلکہ پڑوسی ممالک میں پائی جانے والی غربت و افلاس سے بھی غافل ہو چکے ہیں۔

یہ روش نہ صرف مادی وسائل کا نقصان ہے بلکہ روحانی پستی کا بھی اشاریہ ہے۔ اگر ایک انقلابی ملت جو دنیا کی مظلوم اقوام کے لیے نمونہ بننے کی دعویدار ہے، وہ خود اپنی نعمتوں کی حفاظت نہ کرسکے تو یہ نہ صرف اخلاقی بلکہ فکری شکست کے مترادف ہے۔ ریاستی اداروں اور علما کی کاوشیں اپنی جگہ مگر حقیقی تبدیلی تب ہی آئے گی جب عوام خود شعوری طور پر اپنی ذمہ داری کو محسوس کریں گے۔

ایران میں انقلاب کی برکتیں آج بھی جاری ہیں، مگر ان کی پائیداری اس بات سے مشروط ہے کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر نعمتوں کی قدر، دینی احکام کی پابندی اور اسراف و غفلت سے اجتناب کیا جائے۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہی نعمتیں، آزمائش میں بدل جائیں۔ چنانچہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ایرانی عوام اس فکری تنبیہ کو سنجیدگی سے لیں، اپنی انقلابی شناخت کو عملی کردار میں ڈھالیں اور ان تمام شعبہ جات میں اعتدال و قناعت کو اپنائیں جن میں سہولتوں

کی فراوانی نے غفلت کو جنم دیا ہے۔یہی اسلامی تمدن کی اصل روح ہے،یہی انقلاب کی بقا کی ضمانت۔

بقر عید منانے کا مقصد کیا ہے؟

عید الاضحی، جسے بقر عید کے نام سے جانا جاتا ہے، محض جانور قربان کرنے کا رسمی دن نہیں بلکہ ایک عظیم شعور، فکری بیداری اور عملی جدوجہد کا عالمی پیغام اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس دن کی اصل روح حضرت ابراہیمؑ کی اس عظیم سنت کی یادگار ہے جس میں انہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو خدا کے حکم پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو کر ایک ایسا معیار قائم کیا جو قیامت تک ہر موحد، ہر مجاہد، اور ہر خدا پرست انسان کے لیے مشعل راہ ہے۔ عید قربان کی روح فقط جانوروں کے ذبح میں نہیں بلکہ ایک ایسی معنوی قربانی میں مضمر ہے جو انسان کو باطل قوتوں کے خلاف قیام اور خدا کی راہ میں ہر قیمت پر استقامت کی دعوت دیتی ہے۔

آج جب دنیا کی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی فضا پر صہیونی استعمار و سامراجیت کی گرفت ہے، جب انسانیت کو سرمایہ دارانہ مفادات کے نیچے روند دیا گیا ہے، اور جب مسلم دنیا کو داخلی اختلافات، فرقہ واریت، اور فکری جمود میں الجھا کر عالمی نظام کے شکنجے میں جکڑا جا رہا ہے، تو ایسے ماحول میں عید قربان کا پیغام پہلے سے زیادہ اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی کا اصل سبق یہ ہے کہ جب باطل کا سامنا ہو، جب خدا کی حاکمیت اور اس کے دین کی بقاء کا سوال ہو، تو ہر عزیز ترین چیز کو — حتی اپنی اولاد کو بھی — خدا کی راہ میں قربان کر دینا لازم ہو جاتا ہے۔

قربانی کا مفہوم در حقیقت اس ذات کی طرف رجوع ہے جس کی اطاعت انسان کے ہر ذاتی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی مفاد سے بلند تر ہو۔ یہ قربانی دراصل ایک فریاد ہے کہ "میرا سب کچھ تیرا ہے، اے اللہ! جو کچھ تو چاہے، لے لے"۔ یہی وہ روح ہے جسے اگر مسلمان دنیا اپنی فردی اور اجتماعی زندگی میں زندہ کریں تو وہ استعمار کے تمام شکنجوں کو توڑ سکتے ہیں۔ لیکن یہ تب ممکن ہے جب وہ بقر عید کو صرف تہوار، گوشت کی تقسیم اور ظاہری رسومات تک محدود نہ رکھیں، بلکہ اس کو ایک عالمی انقلابی پیغام سمجھیں جو ابراہیمی تحریک کے احیاء کا تقاضا کرتا ہے۔

صہیونی سامراجیت جس نے جدید دنیا کو میڈیا، معیشت، سیاست اور علم کے میدان میں اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، در حقیقت وہی نمرودی و فرعونی قوتیں ہیں جن کے خلاف ابراہیمی تحریک ہمیشہ سے اٹھتی رہی ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے جبر کو چیلنج کیا، حضرت عیسیٰؑ نے یہودی مذہبی اشرافیہ کی ریاکاری کے خلاف بغاوت کی، اور حضرت محمد صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کے سرمایہ دارانہ اور ظالمانہ نظام کو للکارا۔ اسی تسلسل میں آج کے مسلمان پر بھی واجب ہے کہ وہ استعمار کے خلاف کھڑا ہو، اس کے فکری، نظریاتی، سیاسی، عسکری اور ثقافتی محاذ پر مقابلہ کرے۔

عید الاضحیٰ ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اسلامی جدوجہد کا راستہ محض زبان کی حد تک نعرہ بازی سے نہیں بلکہ ایثار، قربانی، شہادت، اور مسلسل جہاد سے عبارت ہے۔ یہ ہمیں یہ بھی سکھاتی ہے کہ خدا کا دین دنیاوی مصلحتوں اور استعماری نظاموں کے ساتھ سمجھوتے کا نہیں بلکہ ان کی جڑیں کاٹ کر ایک الٰہی نظام قائم کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے اندرونی اصلاح، فکری آزادی اور خودی کا شعور لازمی ہے۔

آج کے دور کا استعمار فقط بیرونی تسلط نہیں بلکہ ایک فکری و نفسیاتی یلغار بھی ہے۔ صہیونی طاقتیں ہمیں ہماری تاریخ، ہمارے مجاہدین، ہمارے شہداء، اور ہماری ثقافتی شناخت سے کاٹ کر ایک بے روح امت میں تبدیل کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے ایجنڈے کا مقابلہ صرف ہتھیار سے نہیں بلکہ ایک ہمہ جہتی قربانی سے کیا جا سکتا ہے — قربانی مال کی، وقت کی، آرام کی، اور سب سے بڑھ کر اپنی خواہشات کی۔ جس دن امت مسلمہ اس قربانی کو اپنا وطیرہ بنا لے، وہ دن ہو گا جب ابراہیمی راستہ ایک بار پھر استعمار کے بتوں کو توڑنے والا راستہ بنے گا۔ لہٰذا عید الاضحی کی اصل روح اس وقت بیدار ہوتی ہے جب ہم جانوروں کی قربانی کو اپنے نفس کی قربانی کا آغاز سمجھیں، جب ہم سامراجی نظام کے خلاف قیام کو ایک دینی فریضہ تسلیم کریں، اور جب ہم اپنی ذاتی و اجتماعی زندگی میں خدا کی حاکمیت کو ہر چیز پر مقدم رکھیں۔ یہی ابراہیمی سنت ہے، یہی اسلامی تحریک کا جوہر ہے، اور یہی بقر عید کا صہیونی استعمار و سامراجیت کے خلاف جہاد میں اصل پیغام ہے۔

بنی ھاشم و بنی اسرائیل اور امام قائمؑ

دنیا میں مذاہب کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، لیکن اگر ہم اس زاویے سے دیکھیں کہ کون سے مذاہب دنیا پر حکمرانی کا عالمی نظریہ رکھتے ہیں، تو ہمیں دو قوتیں نمایاں نظر آتی ہیں: ایک شیعہ اثناعشری اسلام، جو امام مہدیؑ (جو بنی ھاشم سے تعلق رکھتے ہیں) کے ظہور کے ذریعے عدلِ الٰہی کا نظام پوری دنیا میں نافذ کرنے کا عقیدہ رکھتا ہے، اور دوسری یہودیت (بنی اسرائیل)، جو صہیونی سیاسی نظریہ کی شکل میں دنیا بھر میں ایک خفیہ اور منظم غلبے کی کوشش میں مصروف ہے اور اپنے متوقع مسیحا کی آمد کے ذریعے عالمی حکمرانی کا خواب دیکھتی ہے۔

شیعہ اثناعشری عقیدہ، جو امام علیؑ کے بعد امامت کے تسلسل کو بارہ آئمہؑ کی صورت میں مانتا ہے، اپنے آخری امام یعنی امام مہدیؑ کے ظہور کو نہ صرف عقیدہ بلکہ دنیا کی نجات کا واحد راستہ سمجھتا ہے۔ یہ عقیدہ محض ایک روحانی امید نہیں بلکہ ایک فعال نظریہ ہے، جس میں ظلم کے خلاف جہاد، فتنہ و فساد کے خلاف قیام، اور طاغوتی نظاموں کے خلاف فکری و عملی مزاحمت شامل ہے۔ اسی لیے شیعہ مکتب ہر دور میں ظلم کے خلاف کھڑا ہوا ہے، چاہے وہ عباسی ہو یا اموی، عثمانی ہو یا جدید سامراجی نظام۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی رہبر معظم سید

علی خامنہ ای، آیت اللہ سیستانی، اور دیگر مراجع عظام کے فتاویٰ اور ہدایات پوری شیعہ دنیا کو امامِ وقت کی نیابت میں حرکت اور شعور دے رہے ہیں۔

دوسری طرف یہودی نظریہ، خاص طور پر صہیونی تحریک، جو ایک سیاسی و استعماری تحریک ہے، اپنے آپ کو اللہ کی چُنی ہوئی قوم کہتی ہے اور اس زعم میں مبتلا ہے کہ وہ دنیا کی مادی، مالیاتی اور سیاسی باگ ڈور سنبھالنے کا حق رکھتی ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایک مسیحا آئے گا جو ہیکل سلیمانی کو دوبارہ تعمیر کرے گا اور بنی اسرائیل کو عالمی بادشاہت دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیت المقدس پر قبضے، فلسطینی نسل کشی، عالمی مالیاتی نظام پر کنٹرول، میڈیا کے ذریعے ذہن سازی، اور سیاسی بلیک میلنگ کے ذریعے اپنا اثر و رسوخ بڑھاتے چلے آ رہے ہیں۔

یہودی تاریخ انبیاء الٰہی کے قتل سے بھری ہوئی ہے۔ قرآن نے خود یہ گواہی دی کہ انہوں نے حضرت یحییٰؑ کو قتل کیا، حضرت زکریاؑ کو شہید کیا، حضرت موسیٰؑ کو تکالیف پہنچائیں، اور حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ یہ ان کا مزاج بن چکا ہے کہ جب کوئی نبی ان کے مفادات کے خلاف بات کرتا ہے تو وہ اسے ختم کر دیتے ہیں یا اس کا انکار کر کے اسے بے اثر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کا "دین" دراصل دنیا پر قبضے کا آلہ بن چکا ہے، جس میں ربّ کی حاکمیت کے بجائے اپنی قوم کو خدا کے برابر کھڑا کر دیا گیا ہے۔

شیعہ عقیدہ اور صہیونی عقیدہ کے درمیان بظاہر چند مماثلتیں موجود ہیں، جیسے دونوں ایک نجات دہندہ کے منتظر ہیں، دونوں کا عقیدہ ہے کہ وہ نجات دہندہ آئے گا اور دنیا کے نظام کو بدل دے گا، اور دونوں کے ماننے والے ایک عالمی حکومت کے قیام کے لیے اپنے تئیں آمادگی میں مصروف ہیں۔ لیکن ان مماثلتوں کے پیچھے جو فرق ہے، وہی ان دونوں نظریات کو زمین و آسمان کی طرح الگ کرتا ہے۔

شیعہ نظریہ عدلِ الٰہی، قسط، مساوات، مظلوم کی حمایت، اور فطرت کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اس کا مرکز امام مہدیؑ ہیں جو اللہ کی جانب سے معین امام ہیں، جن کا ظہور ظلم کے خلاف آخری قیام ہے۔ ان کا نظام انسانی فلاح، روحانی پاکیزگی اور توحید پر مبنی ہے۔ جبکہ صہیونی نظریہ دنیا پر مادی غلبہ، نسل پرستی، سودی نظام، طاقت کا استعمال، اور فریب پر استوار ہے۔ ان کا مسیحا، جس کا تصور انہوں نے اپنی خواہشات کی بنیاد پر گھڑا ہے، دراصل ایک ایسا "بادشاہ" ہو گا جو دنیا کو بزورِ طاقت ان کے تابع کرے گا۔

شیعہ نظریہ امام مہدیؑ کے ظہور کو اخلاقی و فکری تربیت، اجتماعی بیداری، اور ظلم سے انکار کے ذریعے ممکن بناتا ہے، جب کہ صہیونی نظریہ اپنے مسیحا کے لیے خونریزی، فتنہ، دنیاوی کنٹرول، اور تباہی کے راستے ہموار کر رہا ہے۔ ایک طرف نور ہے، دوسری طرف ظلمت۔ ایک طرف عدلِ الٰہی کا قیام ہے، دوسری طرف شیطانی عالمی تسلط۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ مستقبل کا معرکہ ان دونوں قوتوں کے درمیان فیصلہ کن ہو گا۔

اسی وجہ سے اسلام کے احکامات اور شیعہ مکتب کی رسوم و روایات محض عبادات یا ثقافتی مظاہر نہیں بلکہ ایک گہرا روحانی، اخلاقی، اور سیاسی فلسفہ رکھتے ہیں، جو انسان کو ظلم سے نجات، عدل کی طرف رجوع، اور معاشرے میں شعور و انقلاب کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ ان احکامات کا بنیادی مقصد انسان کو فطرت سے ہم آہنگ، حق کے تابع، اور باطل کے خلاف قیام پر آمادہ کرنا ہے۔ نماز، روزہ، زکات، حج، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے احکام محض انفرادی تطہیر کے ذرائع نہیں، بلکہ ایک الٰہی تمدن کی تشکیل کا ذریعہ ہیں، جس میں انسان اپنی خودی کو پہچانتا ہے اور کائناتی عدل کا حصّہ بنتا ہے۔ نماز بندے کو طاغوت کے سامنے جھکنے سے محفوظ رکھتی ہے، روزہ اسے خواہشات کے جال سے نکالتا ہے، زکات و خمس معاشرتی توازن قائم کرتے ہیں، اور حج انسانیت کو عالمی اخوت کی مشق کرواتا ہے۔

اسی طرح شیعہ عزاداری اور ماتم کی رسومات کا فلسفہ بھی گہرائی اور شعور سے لبریز ہے۔ یہ رسومات صرف رونے یا غم منانے کا ذریعہ نہیں بلکہ یادداشتِ کربلا کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہیں۔ کربلا انسانیت کی تاریخ کا وہ مرکزی واقعہ ہے جہاں حق و باطل کی لکیر ابدی طور پر کھینچ دی گئی۔ عزاداری حسینؑ انسان کو یاد دلاتی ہے کہ اگر کربلا میں یزید کامیاب ہو جاتا تو دین کا چہرہ مٹ جاتا۔ اس لیے ہر سال عزاداری محض ایک یادگار نہیں بلکہ مزاحمتی تربیت، فکری تحریک، اور ظلم کے خلاف اجتماعی شعور کی تجدید بن جاتی ہے۔ یہ تربیت فرد کو سکھاتی ہے کہ کیسے حق کے لیے کھڑا ہوا جائے، کیسے قربانی دی جائے، اور کیسے وقت کے یزیدوں کو للکارا جائے۔

شیعہ مکتب کی دیگر رسوم، جیسے زیارات، دعائیں، مناجات، اور مجالس بھی ایک زندہ اور جہاد آموز مکتب کی علامت ہیں۔ زیارت عاشورا محض ایک دعا نہیں بلکہ ایک اعلانِ برائت ہے، جو ہر زمانے کے طاغوتوں سے انکار اور امامِ حق سے وفاداری کا تجدیدی معاہدہ ہے۔ دعائے کمیل، دعائے ندبہ، اور دیگر مناجات انسان کو رب سے جڑنے کا وہ وسیلہ فراہم کرتی ہیں جو اسے مادیت پرستی سے بچا کر روحانیت کے جہان میں داخل کرتی ہیں۔ یہ ساری عبادات اور رسومات دراصل ایک مرکز کی طرف دعوت دیتی ہیں، اور وہ مرکز ہے: امامِ وقت کا ظہور اور عدل کا قیام۔

اسی تناظر میں شیعہ فکری و عملی حیات کا ہر گوشہ امام مہدیؑ کے ظہور سے جڑا ہوا ہے۔ عزاداری، احکامِ شریعت، جہاد، مرجعیت، ولایتِ فقیہ، سب امام مہدیؑ کی طرف راہ ہموار کرتے ہیں۔ گویا شیعہ رسوم، عبادات اور احکامات ایک مسلسل تربیتی عمل ہیں، جو فرد کو مہدوی انقلاب کے سپاہی میں تبدیل کرتے ہیں۔ ان کا مقصد انسان کو صرف عبادت گزار نہیں بلکہ باخبر، باکردار، اور باعمل مجاہد بنانا ہے جو ظہور کے وقت لشکرِ عدل کا حصّہ بن سکے۔

دوسری طرف صہیونی نظام، جس کا مرکز دنیا پر قبضہ، مال و زر کی پوجا، اور ظلم کے تسلسل کو برقرار رکھنا ہے، وہ ان تمام احکامات و رسومات کا دشمن ہے۔ کیونکہ یہ احکام فرد کو آزاد اور حریت پسند بناتے ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جو طاغوت کو سب سے زیادہ کھلتی ہے۔ اسی لیے استعمار نے ہمیشہ عزاداری کو ممنوع قرار دیا، ولایت فقیہ کو دہشت گردی قرار دیا، اور

اسلامی احکام کو دقیانوسی کہہ کر رد کیا۔ دراصل وہ جانتے ہیں کہ یہ احکام دنیا میں وہ نظم پیدا کر سکتے ہیں جو ان کی شیطانی اجارہ داری کو توڑ دے گا۔

پس اسلامی احکام اور شیعہ رسوم ایک مسلسل اور بامقصد جہاد کا مظہر ہیں۔ یہ جہاد تلوار سے شروع ہوتا ہے لیکن دل، فکر، زبان اور قلم تک پھیلتا ہے۔ ان کا مقصد زمین پر اللہ کا نظام نافذ کرنا، طاغوت کو مٹانا، اور امام مہدیؑ کی راہ ہموار کرنا ہے۔ یہی ان احکامات کا حقیقی فلسفہ ہے: ایک زندہ، بیدار، اور مزاحم امت کی تشکیل، جو وقت کے فرعونوں کے خلاف خندقِ کربلا میں سینہ سپر ہو۔

شیعہ امت، جو آج دنیا کے مختلف حصوں میں بیدار، سرگرم اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہے، وہ امام حسینؑ کے وارث کے ظہور کی تیاری میں مشغول ہے۔ اور یہ تیاری محض انتظار کا نام نہیں، بلکہ قربانی، بصیرت، مزاحمت، اور شعور کی مسلسل تربیت ہے۔ یہی وہ روح ہے جو دشمن کے ہر سازش کو ناکام بناتی آئی ہے اور جو مستقبل میں بھی عالمی طاغوت، صہیونیت اور ان کے سارے نیٹ ورک کو نیست و نابود کر دے گی۔ ان شاء اللہ۔

پاکستان اور امت مسلمہ

پاکستان بلاشبہ عالم اسلام کی واحد ایٹمی طاقت ہے اور دفاع کے شعبے میں ایک مضبوط اور منظم فوج رکھتا ہے جسے دنیا کی چوتھی بڑی فوج کے طور پر جانا جاتا ہے۔ لیکن اس عسکری طاقت، ایٹمی صلاحیت، اور جغرافیائی اہمیت کے باوجود پاکستان نہ صرف فلسطین اور کشمیر جیسے دیرینہ اسلامی مسائل میں کوئی مؤثر کردار ادا کرنے سے قاصر رہا ہے بلکہ امت مسلمہ کے دیگر مظلومین، جیسے یمن، شام، عراق یا افغانستان میں بھی ایک فیصلہ کن حیثیت اختیار نہیں کر سکا۔ اس تناظر میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر اس قدر دفاعی طاقت اور قربانیوں کی تاریخ رکھنے والا ملک ان مسائل میں عملی طور پر اتنا کمزور اور پسپائی کا شکار کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب محض ایک پہلو میں نہیں بلکہ سیاسی، معاشی، فکری، روحانی، جغرافیائی اور بین الاقوامی عوامل کے ایک وسیع تر مجموعے میں پوشیدہ ہے۔

سب سے پہلی اور بنیادی وجہ پاکستان کا شدید معاشی انحصار اور مالی کمزوری ہے۔ ایک ایٹمی طاقت ہونے کے باوجود پاکستان کی معیشت قرضوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے، جیسے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک، پاکستان کی پالیسی سازی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ پاکستان جب تک معاشی طور پر آزاد نہیں ہوتا، وہ سیاسی یا عسکری طور پر آزادانہ فیصلے نہیں کر سکتا۔ یہ معیشت ہی ہے جو ریاست کو دفاع سے لے کر خارجہ پالیسی

تک سب میں محتاط، مصالحت پسند اور اکثر اوقات خاموش رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان نے فلسطین پر اسرائیلی بمباری کے خلاف بھرپور سیاسی احتجاج تو کیا، مگر کبھی کسی عملی قدم، مثلاً اسرائیل کا تجارتی یا سفارتی بائیکاٹ، کے قریب بھی نہیں گیا۔ سیاسی میدان میں پاکستان مسلسل عدم استحکام، انتشار اور وقتی مفادات کی سیاست کا شکار رہا ہے۔ خارجہ پالیسی کا کوئی طویل المدتی وژن موجود نہیں رہا۔ کسی ایک حکومت نے بھی پاکستان کو ایسی نظریاتی قیادت فراہم نہیں کی جو امت مسلمہ کی قیادت کا خواب دیکھ سکے یا اس کے لیے عملی اقدامات کرے۔ سیاسی قیادت اکثر مغرب کی خوشنودی، اندرونی اقتدار کے تحفظ اور مخالفین کو زیر کرنے کے چکر میں الجھی رہی ہے۔ فلسطین یا کشمیر جیسے معاملات صرف تقریروں، یومِ یکجہتی یا قراردادوں تک محدود رہے۔ پارلیمانی نظام نے قومی عزت و وقار کو محض ووٹ بینک، فنڈنگ، اور کرسی تک محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ پاکستان کا روحانی بحران بھی اس صورت حال کا ایک اہم عنصر ہے۔ ایک ایسی قوم جو نظریۂ اسلام پر قائم ہوئی، وقت کے ساتھ ساتھ اپنے فکری و روحانی تشخص سے دور ہوتی گئی۔ نہ تو تعلیمی نظام میں اسلام کو ایک زندہ، انقلابی، اور متحرک نظریے کے طور پر پیش کیا گیا، نہ ہی ذرائع ابلاغ نے اسلام کو امتِ واحدہ کی وحدت، مظلوموں کی حمایت اور ظالم کے خلاف قیام کی علامت بنایا۔ نتیجتاً عوامی شعور اس قدر زوال کا شکار ہو گیا کہ مظلوموں کے حق میں آواز اٹھانا ایک "سیاست" اور "سوشل میڈیا کمپین" بن کر رہ گیا، جبکہ عملی اقدام کو محض انتہا پسندی یا غیر ضروری مداخلت قرار دیا جانے لگا۔

جہالت، فکری غلامی اور تفرقہ بازی نے بھی پاکستان کو عالمی سطح پر غیر مؤثر بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کی تقسیمِ در تقسیم میں پاکستان نہ صرف شریک رہا بلکہ بعض اوقات اسے ریاستی پالیسیوں میں پروان چڑھایا گیا۔ فرقہ وارانہ تعصبات، مذہبی منافرت اور مدرسہ و یونیورسٹی کے درمیان فکری جنگ نے قوم کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا۔ جب ایک ملک کے اندر ہی شیعہ، سنی، بریلوی، دیوبندی، اہلحدیث، لبرل اور سیکولر ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھیں گے تو وہ قوم عالمی سطح پر امت کے مشترکہ مسائل پر کیسے متحد ہو سکتی ہے؟ یہی حال کشمیر کے مسئلے پر بھی ہے جہاں پاکستان کی داخلی کمزوریوں نے اسے اتنا محتاط بنا دیا ہے کہ وہ اپنی پوزیشن سے پیچھے ہٹتا جا رہا ہے اور مسئلہ کشمیر محض عالمی اداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

بین الاقوامی سیاست اور عالمی نظام بھی پاکستان کی مجبوریوں کا بڑا سبب ہیں۔ دنیا کی موجودہ طاقتوں کا عالمی نظم مغرب کے زیرِ اثر ہے اور جو بھی ملک اس نظم کے خلاف کھڑا ہوتا ہے، اسے یا تو اقتصادی طور پر مفلوج کر دیا جاتا ہے، یا اس کی سیاسی تنہائی کو بڑھا دیا جاتا ہے۔ پاکستان چونکہ ایک ایٹمی ریاست ہے، اس پر دباؤ پہلے ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ فلسطین یا یمن کے حق میں کھل کر کھڑا ہو جائے تو اسے مغربی طاقتوں کے مکمل بائیکاٹ اور دشمنی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، جس کی سکت شاید پاکستانی ریاست یا معیشت میں فی الوقت موجود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان اکثر احتیاط، سفارتی زبان اور "نیوٹرل" بیانیے کا سہارا لیتا ہے، جسے بزدلی یا بے عملی بھی کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں ایک انتہائی اہم لیکن نظر انداز شدہ سبب، خود عوام کی بے حسی اور غفلت ہے۔ جب قوم اپنے مظلوم بھائیوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف نہ سمجھے، جب فلسطین، کشمیر، برما، شام، یمن صرف خبروں، ٹرینڈز اور سوشل میڈیا تک محدود رہیں، تو ریاست بھی انہی عوام کی ترجیحات کا عکس بن جاتی ہے۔ اگر قوم خود لاتعلق، تقسیم شدہ اور فکر سے عاری ہو تو حکمران کیسے جدوجہد کریں گے؟ نہ عوامی دباؤ ہو، نہ شعوری بیداری، تو حکومتی اقدام محض نعرے، قراردادیں اور اقوام متحدہ کی دہلیز پر خاموشی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس سب کے باوجود یہ کہنا غلط ہوگا کہ پاکستان کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر پاکستان اپنی داخلی صفوں کو درست کرے، اپنے تعلیمی، روحانی، اور سیاسی دھارے کو اسلام کی حقیقی تعلیمات سے ہم آہنگ کرے، معاشی خود کفالت کی طرف بڑھے، عوامی شعور کو بیدار کرے، اور قیادت کو نظریاتی بنائے تو وہ نہ صرف امت مسلمہ کے مسائل میں ایک قائدانہ کردار ادا کر سکتا ہے بلکہ عالمی سطح پر ایک مزاحمتی بلاک کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جب پاکستان کو فقط طاقتور فوج یا ایٹمی اسلحہ نہیں بلکہ ایک زندہ، متحد، اور بیدار قوم کی ضرورت ہے۔ وگرنہ، خاموشی، بے عملی اور مصالحت کا یہ سفر ہمیں بھی ان اقوام کی صف میں کھڑا کر دے گا جن کے پاس طاقت تو تھی مگر تاریخ میں صرف مایوسی کی علامت بن کر رہ گئے۔

پاکستان کے زوال پذیر حالات

پاکستان کا معاشی بحران ایک ایسا سوال ہے جو محض اقتصادی پالیسیوں کی ناکامی سے نہیں بلکہ قومی وژن، انتظامی اخلاقیات، طبقاتی تفاوت، اور استعماری ڈھانچوں کی موجودگی سے جڑا ہوا ہے۔ ایک ایٹمی طاقت، زرعی خودکفالت رکھنے والا ملک، اور لاکھوں باصلاحیت افراد کی موجودگی کے باوجود پاکستان آج بھی قرضوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اور عام شہری کی زندگی روز بروز بدحال ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک المیہ ہے جو صرف وسائل کی کمی کا نہیں بلکہ ان وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم، بدانتظامی، سیاسی بدنظمی، اور فکری بانجھ پن کا نتیجہ ہے۔

پاکستان کے دیہی علاقوں میں بسنے والے تقریباً ۶۵ سے ۷۰ فیصد لوگ بنیادی سہولیات سے محروم ہیں۔ ان کے پاس تعلیم، صحت، صاف پانی، اور روزگار جیسی بنیادی انسانی ضروریات تک مناسب رسائی نہیں۔ زراعت جیسے شعبے میں کام کرنے والے لاکھوں افراد محنت تو کرتے ہیں، مگر نظام زر اور جاگیرداری کی گرفت نے ان کو خودکفیل بننے کی اجازت کبھی نہیں دی۔ شہروں کی طرف ہجرت کا دباؤ، زرعی زمینوں کا کمرشل تبادلہ، اور دیہی معیشت کی مسلسل کمزوری ایک ایسا منظر نامہ پیدا کر چکی ہے جہاں بڑے شہروں کی مصنوعی چمک باقی ملک کے اندھیرے کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف چند شہروں کی ترقی،

بلند عمارتیں، میٹرو بسیں اور انڈر پاسز عام آدمی کی غربت، مایوسی اور تنگدستی کو کم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

دوسری طرف ریاستی مشینری کی کارکردگی اور نیت بھی سوالیہ نشان ہے۔ پاکستان میں ٹیکس نیٹ محدود ہے، بڑے تاجر، زمیندار، اور صنعت کار ٹیکس سے بچ نکلتے ہیں جبکہ متوسط اور غریب طبقہ غیر مستقیم ٹیکسز جیسے پیٹرول، بجلی، اشیائے خورد ونوش کی قیمتوں کے ذریعے نظام کو چلاتا ہے۔ عوام کا اعتماد ریاستی اداروں پر اس حد تک ٹوٹ چکا ہے کہ وہ زکوٰۃ تو دیتے ہیں مگر ٹیکس دینا گناہ سمجھتے ہیں، کیونکہ اُنہیں یقین ہے کہ وہ پیسہ یا تو حکومتی عیاشیوں، یا کرپشن، یا غیر ضروری پروجیکٹس کی نذر ہو جائے گا۔ یہی نظام ایک ایسی منافقانہ معیشت کو جنم دیتا ہے جہاں کاغذوں میں ترقی، اشاریوں میں استحکام اور تقریروں میں خود کفالت کی نوید سنائی جاتی ہے، مگر ایک معمولی کمانے والا شہری دن بھر کام کرنے کے باوجود مہینے کے آخر میں بچوں کی فیس، بجلی کے بل، راشن اور دوائیوں کے اخراجات کے سامنے بے بس ہوتا ہے۔

ایٹمی طاقت ہونا بلاشبہ ایک اہم اسٹریٹیجک کامیابی ہے، مگر یہ قوم کی معاشی خودمختاری کی ضمانت نہیں دے سکتا جب تک اندرونی نظام کرپشن، نااہلی اور خودغرضی سے پاک نہ ہو۔ پاکستان نے ہمیشہ اپنی سلامتی کو بیرونی امداد اور سٹریٹیجک بیلنس کے ساتھ جوڑے رکھا ہے۔ امریکہ، چین، سعودی عرب اور اب آئی ایم ایف جیسے ادارے ہمارے بجٹ، پالیسی، اور حتیٰ کہ ترقیاتی پروگراموں تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ انحصار صرف معیشت کو کمزور

نہیں کرتا بلکہ ہماری خودی، غیرت، اور آزادی کو بھی گروی رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم فلسطین، کشمیر یا کسی عالمی معاملے پر اس وقت تک کھل کر بول نہیں سکتے جب تک ہمارے "معاون" ممالک کی مرضی نہ ہو۔ اور یہ مرضی اُسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب ہم انہیں اپنے ہوائی اڈے، اپنی زمین، اپنے مزدور اور اپنے خواب گروی رکھ چکے ہوتے ہیں۔

تعلیم کی زبوں حالی اس تمام بحران کی جڑ ہے۔ ملک کی بڑی آبادی، جو دیہی علاقوں میں مقیم ہے، مناسب تعلیم، ہنر، اور سیاسی شعور سے محروم ہے۔ نہ تو انہیں اپنے حقوق کا ادراک ہے، نہ ہی وہ اپنے ووٹ کی طاقت کو جانتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ووٹ برادری، وڈیرے، فرقہ یا وقتی مفاد کے تحت دیا جاتا ہے، اور وہی پرانے چہرے اقتدار میں آکر نظام کو اسی دائرے میں گھماتے رہتے ہیں۔ جب تک تعلیم محض سند، روزگار، اور امتحان کی حد تک محدود رہے گی، وہ کوئی فکری انقلاب نہیں لا سکتی۔ اور جب تک فکری انقلاب نہیں آئے گا، نہ عوام جاگیں گے، نہ حکمران بدلیں گے، نہ نظام۔

روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ صرف عالمی منڈی نہیں بلکہ مقامی ذخیرہ اندوزی، بدانتظامی اور حکومت کی غیر سنجیدہ مالیاتی حکمت عملی ہے۔ پاکستان کی معیشت کے اہم شعبے —زراعت، صنعت، توانائی— کسی مربوط پالیسی کے تحت نہیں چل رہے۔ درآمدات کا انحصار بڑھتا جا رہا ہے، مقامی پیداوار کم ہوتی جا رہی ہے، اور کرپٹ عناصر پیٹرول، آٹا، چینی، بجلی، گیس ہر چیز کو منافع کمانے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ عام شہری کے

لیے ایک باعزت زندگی گزارنا ایک خواب بن چکا ہے، اور حکومت کے پاس اس خواب کی تعبیر کے لیے نہ ارادہ ہے نہ صلاحیت۔

یقیناً پاکستان جیسے ملک کے زوال اور معاشی، سیاسی، تہذیبی انحطاط کو صرف بیرونی سازشوں کی عینک سے دیکھنا نہ صرف سادگی بلکہ خود فریبی بھی ہے۔ بیرونی قوتیں ہمیشہ ان قوموں کو کمزور کرتی ہیں جو اندر سے پہلے ہی کھوکھلی ہو چکی ہوں۔ پاکستان کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ بیرونی مداخلت کو روکنے والا داخلی ڈھانچہ —جو اخلاقیات، قیادت، اور شعور سے جنم لیتا ہے —وہ مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے۔

اخلاقیات، جو کہ کسی بھی قوم کے ارتقاء میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، پاکستان میں اپنی بنیاد کھو چکی ہیں۔ یہ اخلاقیات مذہب سے پروان چڑھتی ہیں، مگر ہمارے ہاں مذہب کو یا تو رسموں میں جکڑ دیا گیا یا مسلکی، سیاسی اور مفاداتی ہتھیار بنا دیا گیا۔ دین جس کا بنیادی پیغام عدل، دیانت، اخوت، امانت، اور قربانی تھا، وہ اب مسجدوں، مجلسوں، جلسوں اور سوشل میڈیا پر صرف زبان کی حد تک باقی ہے۔ عمل میں دیانت مر چکی، امانت ضائع ہو چکی، اور حرام و حلال کا تصور دھندلا چکا۔ یہی وہ اخلاقی انحطاط ہے جو کرپشن، جھوٹ، ملاوٹ، دو نمبری، اور مفاد پرستی جیسے رویوں کو سماجی معمول بنا چکا ہے۔

سیاسی اشرافیہ اس اخلاقی بحران کا نہ صرف عکاس ہے بلکہ اس کی سرپرست بھی۔ پاکستان کی سیاست میں ایسی قیادت ناپید ہو چکی ہے جس کا براہِ راست رشتہ عوام کے دکھ درد سے جڑا ہو۔ عوامی رہنما، جو زمین سے جڑے ہوتے ہیں، انقلابی فکر رکھتے ہیں، اور قربانی دینے کی

مثال بنتے ہیں — اب کتابوں میں رہ گئے ہیں۔ موجودہ سیاسی طبقہ اشرافیہ کا نمائندہ ہے جو مراعات، پروٹوکول، دبئی، لندن، امریکہ، اور بیرون ملک جائیدادوں تک محدود ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو نہ کبھی بس میں سفر کرتا ہے، نہ بجلی کے بل دیتا ہے، نہ بچوں کو سرکاری اسکول میں بھیجتا ہے، نہ ہسپتال میں لائن میں کھڑا ہوتا ہے، اور نہ ہی مہنگائی یا بے روزگاری کے کرب کو جانتا ہے۔ اس طبقے کے مفادات کا محور عوام نہیں، اقتدار، سرمایہ، اور بین الاقوامی منظوری ہے۔

اسی کا ایک فطری نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے نوجوان، باصلاحیت دماغ، ہنرمند مزدور، تعلیم یافتہ خواتین و حضرات، اور یہاں تک کہ ڈاکٹر، انجینیئر اور اساتذہ تک ملک چھوڑنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ بیرون ملک ہجرت میں ہر سال بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے، کیونکہ یہاں مواقع نہیں، انصاف نہیں، تحفظ نہیں، عزت نہیں، اور ترقی کا کوئی شفاف راستہ نہیں۔ جو محنت کرے گا وہ مہنگائی، ٹیکس، اور استحصال کا شکار ہو گا، جو چالاکی کرے گا وہ گاڑی، گھر، اور سفارش لے اڑے گا۔ اس ظلم اور ناانصافی کے نظام میں لوگوں کو امید ختم ہو چکی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو محفوظ مستقبل دینا چاہتے ہیں — چاہے وہ اپنے وطن سے بچھڑنے کی قیمت پر ہو۔

حکومت اس ہجرت کو روک نہیں پا رہی کیونکہ اس کی ترجیحات میں یہ مسئلہ شامل ہی نہیں۔ جو اربابِ اقتدار خود اپنے بچوں کو بیرون ملک پڑھاتے ہوں، علاج وہاں کرواتے ہوں، کاروبار وہاں رکھتے ہوں، ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ عوام کو یہیں روکنے کے

لیے کوئی دیرپا نظام بنائیں گے؟ الٹا حکومت اس "برین ڈرین" کو زرمبادلہ کے ایک ذریعہ کے طور پر دیکھتی ہے، کیونکہ جب یہ لوگ باہر کام کرتے ہیں تو اپنے گھر پیسہ بھیجتے ہیں اور حکومت کے زرمبادلہ ذخائر وقتی طور پر بڑھ جاتے ہیں۔ مگر یہ سوچ قلیل مدتی، استحصالی، اور قومی خودداری کے منافی ہے۔

پاکستان کی اصلاح کا آغاز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم خود کو قربانی، عدل، اور خدمت پر مبنی نظریہ پر واپس نہیں لاتے۔ وہ اخلاقیات جو مسجد اور محراب سے لے کر دفتر اور عدالت تک غالب ہوں، وہ تعلیم جو صرف ڈگری نہ ہو بلکہ کردار سازی کا عمل ہو، اور وہ سیاست جو اشرافیہ کا کھیل نہیں بلکہ عوام کی امانت ہو—جب تک یہ بنیادیں قائم نہیں ہوں گی، تب تک ہم بیرونی سازشوں کو کوستے رہیں گے، اشرافیہ کی منافقت سہتے رہیں گے، اور ہمارے قابل بیٹے بیٹیاں اس وطن کو چھوڑتے رہیں گے۔

اگر کوئی تبدیلی ممکن ہے تو وہ تبھی ہو گی جب قوم خود جھوٹ کو جھوٹ کہنے، حرام کو حرام سمجھنے، اور حق کے ساتھ کھڑا ہونے کا حوصلہ پیدا کرے گی۔ جب عوام اشرافیہ سے سوال پوچھیں گے، جب مسجد منبر پر غیر جانبدار بات ہو گی، جب استاد دیانت داری سکھائے گا، اور جب ہر شخص دوسروں کے لیے وہی پسند کرے گا جو اپنے لیے پسند کرتا ہے—تب شاید ہم اس زوال کو عروج میں بدلنے کے قابل ہو سکیں گے۔ وگرنہ یہ سرزمین صرف ہجرت کی گزرگاہ اور یادوں کی قبرستان بنتی جائے گی۔

اگر پاکستان کو اس بحران سے نکالنا ہے تو صرف قرضہ لینا، مہنگائی کم کرنا یا نئے منصوبے شروع کرنا کافی نہیں۔ یہ ایک قومی تحریک کا مطالبہ ہے، جس میں عوام، خواص، فوج، سیاست، مذہب، تعلیم اور میڈیا سب کو اپنے اپنے کردار کا تجزیہ کرنا ہو گا۔ انصاف، علم، دیانت اور خودی کو بنیاد بنا کر اگر ہم آگے نہیں بڑھتے تو یہ ایٹم بم، یہ فوجی طاقت، اور یہ سرکاری دعوے فقط عارضی فریب بن کر رہ جائیں گے۔ پاکستان کو اپنی معاشی بحالی کی جدوجہد، اپنی روحانی و فکری اصلاح اور اپنی سیاسی بیداری کے ساتھ از سرِ نو آغاز کرنا ہو گا۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر ایک زندہ، خوددار، اور باوقار قوم کی تعمیر ممکن ہے۔ وگرنہ، قرض، مہنگائی، غربت اور ذلت ہمارا مقدر بنتے چلے جائیں گے اور ہم صرف یہی کہنے پر مجبور ہوں گے: "ہمارے پاس سب کچھ تھا، مگر ہم نے خود کو کھو دیا۔"

پاکستان کے مسائل اور اُن کا حل

پاکستان کی سیاسی تاریخ اگرچہ جمہوریت کے نعروں، مذہبی قیادت کے فتووں، اور عسکری اداروں کی "محب وطن" مداخلتوں سے بھرپور ہے، لیکن جب اسے اسلامی سیاست اور عوامی حقوق کی ادائیگی کے تناظر میں پرکھا جائے تو یہ ایک ایسی محرومیوں سے بھری داستان بن جاتی ہے جس میں نعرے تو اسلامی ہیں مگر عمل سراسر دنیاوی، دعوے تو عوامی ہیں مگر ایجنڈے طبقاتی اور رویے استبدادی۔ اسلام ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں حکومت، سیاست، قضاء، معیشت، اور معاشرت سب عوام کی بھلائی، عدل و مساوات، اور شفافیت پر قائم ہوتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں اسلامی سیاست کے دعوے دار مذہبی سیاسی گروہ ہوں یا "منتخب" جمہوری قوتیں، سب نے اسلام کو محض جذباتی وابستگی، انتخابی ہتھیار اور مذہبی سرمایہ کاری کا ذریعہ بنایا ہے۔

مذہبی سیاسی جماعتیں، جو رسول اللہؐ اور خلفائے راشدینؓ کی حکومت کو نمونہ قرار دیتی ہیں، جب خود اقتدار کے قریب آتی ہیں تو نہ ان میں عدلِ عمرؓ دکھائی دیتا ہے، نہ فقرِ علیؓ، نہ علمِ حسنؓ، نہ حریتِ حسینؓ۔ دین کو فقہی اور فرقہ وارانہ خانوں میں قید کر کے، عوام کے دینی جذبات کو اپنی سیاست کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان جماعتوں نے اسلامی اخلاق، دیانت، شفافیت، مساوات، عدلیہ کی آزادی، عورتوں، اقلیتوں اور غریبوں کے حقوق کو اپنی

عملی سیاست میں جگہ دینے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ نہ ہی انہوں نے سرمایہ دارانہ جکڑ بندیوں سے نکلنے کی کوشش کی بلکہ اکثر انہی سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور مقتدر حلقوں سے اتحاد کیا جنہوں نے پاکستان کے وسائل کو لوٹا اور عوام کو محکوم رکھا۔

جمہوری جماعتیں جو بظاہر "عوام کے ووٹ سے" برسر اقتدار آتی ہیں، ان کے کردار میں بھی اسلامی سیاست کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ ان کی جمہوریت، مفادات کی گٹھ جوڑ، الیکٹیبلز کی خرید و فروخت، اور پارلیمانی ہارس ٹریڈنگ کے گرد گھومتی ہے۔ ان کے جلسوں میں عوامی خوشحالی کے وعدے کیے جاتے ہیں مگر اقتدار میں آکر وہی پرانے خاندان، وہی کرپشن، وہی اقربا پروری، اور وہی طاقت کے آگے جھکنے کی روش دہرائی جاتی ہے۔ تعلیم، صحت، انصاف، اور روزگار کے وہ بنیادی حقوق جن کی ادائیگی اسلامی حکومت کی پہلی ذمہ داری ہے، ان کے دورِ حکومت میں مسلسل بدتر ہوتے گئے۔ وہ دین کی اصل روح کو عوام کے اندر منتقل کرنے کے بجائے کبھی مغرب کی پیروی، کبھی لبرل ازم، اور کبھی سیکولرزم کے نعرے لگا کر دین و سیاست کے رشتے کو مصنوعی تضاد میں بدلنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس سارے منظر نامے میں اسٹیبلشمنٹ وہ خفیہ قوت رہی ہے جس نے نہ صرف جمہوریت کو غیر مستحکم کیا بلکہ مذہبی جماعتوں کو محدود، تقسیم اور کبھی کبھار "پراکسی" کے طور پر استعمال کرکے انہیں عوامی سیاست سے دور کر دیا۔ اسٹیبلشمنٹ نے ریاستی اداروں کے توازن کو بگاڑ کر آئین و قانون کو اپنی مصلحتوں کا غلام بنا دیا۔ اسلامی سیاست جو عدل،

شفافیت، عوامی احتساب اور فلاح کے اصولوں پر قائم ہونی چاہیے تھی، اسے اسٹیبلشمنٹ نے قومی سلامتی، دفاعی مفادات اور علاقائی پالیسیوں کے پردے میں دبا دیا۔ عوامی سیاست کی روح یعنی مشاورت، شفافیت، اور جوابدہی کا کلچر کبھی پنپنے ہی نہ دیا گیا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ عوام آج بھی اپنے بنیادی حقوق کے لیے دربدر ہیں۔ آئینی طور پر ایک جمہوری ریاست، نظریاتی طور پر ایک اسلامی جمہوریت، مگر عملی طور پر ایک اشرافیائی، استبدادی، اور مفاداتی بندوبست جو کبھی مذہب کے لبادے میں، کبھی جمہوریت کے نقاب میں اور کبھی سلامتی کے عنوان میں لپٹا ہوا ہے۔ اسلامی سیاست کا تقاضا تھا کہ عوام کو ان کا حق ان کے بغیر سوال کیے دیا جاتا، کہ حکمران عوام کے خادم ہوتے، کہ نظامِ عدل دولت کی بنیاد پر نہ چلتا، کہ تعلیم، صحت، انصاف اور رزق ہر فرد کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا۔ مگر اس کے برعکس پاکستان میں سیاست کا اصل مرکز اقتدار کا حصول رہا، نہ کہ عوام کی خدمت یا اللہ کی حاکمیت کا قیام۔

اسلامی سیاست محض نفاذِ شریعت کے نعرے سے ممکن نہیں، بلکہ عدل، امانت، شفافیت اور عوامی فلاح کے ساتھ اپنی عملی شکل میں قائم ہوتی ہے۔ اگر مذہبی جماعتیں، جمہوری قوتیں، اور ریاستی ادارے اپنے اصل دائرہ کار میں واپس آکر عوام کے لیے جوابدہ ہو جائیں، تو پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست بن سکتا ہے۔ بصورت دیگر یہ تضاد، یہ جھوٹے دعوے، اور یہ دوغلا نظام نہ صرف عوام کا اعتماد کھوتے رہیں گے بلکہ اسلام کے سیاسی و اجتماعی تصور کو

بھی مسخ کرتے رہیں گے۔ یہی وہ المیہ ہے جس سے پاکستان کی روحانی اور سماجی شناخت مسلسل زخم خوردہ ہے۔

سیکولر اور سوشلسٹ طرزِ فکر نے پاکستان کو اس کی نظریاتی بنیادوں سے کاٹ کر ایک بے سمت، تذبذب کا شکار، اور خود سے بیگانہ ریاست میں تبدیل کر دیا۔ سیکولر سوچ نے دین کو سیاست، معیشت اور ریاستی فیصلوں سے بے دخل کر کے اسے صرف نجی عبادات تک محدود کرنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں قوم کی روحانی اساس، اخلاقی بصیرت اور اجتماعی شعور کمزور ہوا۔ سوشلسٹ نظریہ، جو بظاہر غریبوں کے حقوق کا دعوے دار تھا، اس نے بھی طبقاتی نفرت کو ابھارا، محنت کے بجائے ریاستی بھیک، اور جدوجہد کے بجائے نعرہ بازی کو فروغ دیا۔ دونوں نظریات نے اسلام کی متوازن، فطری اور ذمہ دارانہ اجتماعی فکر کو دبایا اور مغربی، نقالی شدہ نظاموں کو نافذ کرنے کی کوشش کی جنہوں نے نہ عدل دیا، نہ خوشحالی، نہ روحانی ارتقاء۔ نتیجتاً پاکستان ایک ایسی ریاست بن گیا جو نہ مکمل دینی بن سکی، نہ کامیاب سیکولر، بلکہ فکری خلفشار، معاشی انحطاط، اور سیاسی تماشوں کا شکار ہو گئی۔

پاکستان کی سیاسی و سماجی زخم خوردگی میں اسٹیبلشمنٹ کا کردار سب سے زیادہ باریک، پیچیدہ اور فیصلہ کن رہا ہے۔ یہ کردار کبھی کھلے مارشل لا کی صورت میں ظاہر ہوا، کبھی پس پردہ "سیاسی انجینئرنگ" کے روپ میں، کبھی عدالتوں کے ذریعے فیصلوں پر اثر اندازی، اور کبھی میڈیا اور رائے عامہ کی تشکیل کے راستوں کو اپنے مفاد میں موڑ کر۔ اسٹیبلشمنٹ نے خود کو ہمیشہ "ریاستی مفاد" اور "قومی سلامتی" کے محافظ کے طور پر پیش کیا، لیکن جب ان کے

اقدامات کا جائزہ اسلامی سیاست اور عوامی حقوق کی روشنی میں لیا جائے تو حقیقت یہ عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے دراصل ریاست کو چند مقتدر طبقات کے مفاد میں یرغمال بنائے رکھا۔ انہوں نے عوام کی رائے، ووٹ، اور منتخب قیادت کو اکثر غیر معتبر بنایا، مذہبی طبقے کو تقسیم در تقسیم کا شکار کیا، اور جمہوری اداروں کو اتنا کمزور رکھا کہ وہ صرف علامتی نمائندے بن کر رہ گئے۔

اسٹیبلشمنٹ نے بارہا نظریۂ پاکستان کو محض ایک جغرافیائی اور عسکری تحفظ کے مفہوم میں محدود کر کے اسے اسلام کے روحانی، اخلاقی، اور فلاحی پیغام سے جدا کر دیا۔ وہ نظام جو قرآن کی روشنی میں عدل، مساوات، اور شفافیت کا علمبردار ہونا چاہیے تھا، وہ اسٹیبلشمنٹ کے زیرِ اثر اشرافیہ کی سازشوں، مغرب کی طفیلیانہ پیروی، اور اندرونی خوف کی سیاست میں دفن ہو گیا۔ عدلیہ کو اپنا تابع بنایا گیا، تعلیمی نصاب کو سیاسی ترجیحات کے تحت ترتیب دیا گیا، اور وہ لوگ جو اسلام، آزادی، اور خود انحصاری کی بات کرتے تھے، یا تو غدار قرار دیے گئے یا منظر سے ہٹا دیے گئے۔ اسٹیبلشمنٹ نے کبھی عوامی شعور کی طاقت سے ڈر کر، اور کبھی غیر ملکی ایجنڈوں کو خوش کر کے اس ملک کو ایک مستقل عبوری، نیم خود مختار، اور غیر شفاف نظام میں قید رکھا۔

اس تمام صورتحال میں ایک سوال مسلسل ابھرتا ہے: کہ جب سب ادارے کرپٹ، کمزور یا مصلحت پسند ہو چکے ہوں، اور جب عوام مسلسل دھوکہ، غربت، اور محرومی کا شکار ہوں، تو ایک عادلانہ نظام، ایک منصف گروہ یا ایک نجات دہندہ قیادت کہاں سے آئے؟ اس کا

جواب فوری، سطحی اور جذباتی نہیں بلکہ گہرا، تدریجی اور فکری ہے۔ ایک حقیقی اسلامی اور عادلانہ نظام اوپر سے مسلط نہیں کیا جاتا، وہ نیچے سے، عوام کے اندر سے، ایک فکری و اخلاقی بیداری کے نتیجے میں اٹھتا ہے۔ یہ بیداری تعلیمی انقلاب، فکری تطہیر، روحانی روشنی، اور اجتماعی خود احتسابی سے پیدا ہوتی ہے۔ عوام جب دین کو صرف عبادات تک محدود کرنے کے بجائے اس کے عدالتی، معاشی، اور اخلاقی نظام کو سمجھیں گے، جب وہ لیڈر کے چہرے سے زیادہ اس کی سیرت، حکمت اور دیانت کو معیار بنائیں گے، تب ایک نئی قیادت ابھرے گی۔

یہ قیادت وہ ہوگی جو اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھے، جس کی فکری بنیاد قرآن، اخلاقی بنیاد سنت، اور عملی بنیاد شفافیت ہو۔ یہ قیادت میڈیا کے شور سے نہیں، مسجد کے منبر سے نہیں، بلکہ فکری و عملی جدوجہد کے تربیتی مراکز سے نکلے گی۔ وہ اکیلا شخص نہیں ہوگا جو محض کرشماتی ہو، بلکہ وہ ایک تربیت یافتہ گروہ ہوگا جو فرد کی تطہیر سے لے کر نظام کی اصلاح تک ایک مکمل منصوبے کے ساتھ آگے بڑھے گا۔ اس کا مقصد صرف اقتدار نہیں، بلکہ نظام کی جڑوں کو عدل، دیانت، اور فلاح سے سیراب کرنا ہوگا۔

اگرچہ اس راہ میں استبداد، اسٹیبلشمنٹ کی رکاوٹیں، عالمی دباؤ، اور مقامی مفادات مزاحم ہوں گے، لیکن اگر عوامی فہم، شعور، اور اخلاقی بیداری مستحکم ہو جائے تو کوئی قوت ایسی تحریک کو زیادہ دیر دبا نہیں سکتی۔ اس ملک کو ایک نیا لیڈر چاہیے، لیکن اس لیڈر سے پہلے ایک نئی قوم درکار ہے۔ ایک ایسی قوم جو نہ کسی فوجی کا اندھا اتباع کرے، نہ کسی مولوی کے

فتوے سے مرعوب ہو، اور نہ کسی سیاستدان کے وعدوں پر فریب کھائے۔ ایک ایسی قوم جو علم، شعور، اور ایمان کی بنیاد پر فیصلے کرے، جو اسلام کو محض جذبات نہیں بلکہ عدل، حکمت، اور ذمہ داری کی شکل میں سمجھے۔ تبھی اس زخم خوردہ ریاست میں شفا کی امید پیدا ہو سکتی ہے۔ تبھی وہ وقت آسکتا ہے جب نہ اسٹیبلشمنٹ کو سیاست کا داروغہ بننے کی ضرورت رہے، نہ مذہب کو سیاست کا ہتھیار بنایا جائے، اور نہ جمہوریت کو محض انتخابی ڈھونگ بنا کر عوام کی بے بسی پر پردہ ڈالا جائے۔ تب ہی پاکستان اپنی حقیقی روح یعنی ایک فلاحی، خوددار اور عادل اسلامی ریاست کی طرف بڑھ سکتا ہے۔

پاکستان میں شیعہ قیادت, ایرانی قیادت اور ائمہؑ کی حکمت عملیوں میں مماثلت

علامہ ساجد علی نقوی کی حکمت عملی درحقیقت پاکستان جیسے نازک اور متنوع معاشرتی، سیاسی اور فرقہ وارانہ پس منظر رکھنے والے ملک میں تشیع کے تحفظ، تشخص اور تدریجی ارتقاء کے لیے ایک گہری فکری بصیرت پر مبنی ہے۔ یہ وہ طرزِ عمل ہے جسے اگر سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو سادگی، خاموشی یا کمزوری کا تاثر دے سکتا ہے، مگر جب اس کے پیچھے موجود تدبر، صبر، تحمل، دور اندیشی، اور وقت کی نزاکتوں کا فہم سمجھا جائے تو یہ انداز اس جغرافیے میں عملیت پسندی اور حکمتِ دین کا نہایت مدبرانہ نمونہ نظر آتا ہے۔

پاکستان کے سیاسی، انتظامی اور سیکیورٹی تناظر میں ایک ایسی تحریک کو قیادت دیناجو صرف اپنے مسلک کے دفاع کی ذمہ دار نہ ہو بلکہ پورے ملی تشخص، قومی وحدت اور اسلام کی جامعیت کی ترجمان ہو، اس کے لیے فکری بلندی اور دینی غیرت کے ساتھ ساتھ بہت گہرا صبر، مستقل مزاجی اور توازن درکار ہوتا ہے۔ علامہ ساجد نقوی نے اس کردار کو محض احتجاج، ردعمل یا وقتی جوش کی بنیاد پر نہیں نبھایا، بلکہ انہیں اس بات کا بخوبی ادراک ہے کہ پاکستان جیسے ریاستی ڈھانچے میں جہاں مختلف قومی ادارے گاہے گاہے تشیع کے وجود کو

محدود کرنے یا کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، وہاں کوئی بھی بے وقت، جذباتی یا تند اقدام صرف دشمن کو طاقتور کرے گا، اور تشیع کی ساکھ کو نقصان پہنچائے گا۔

علامہ صاحب کی اسٹریٹیجی کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ داخلی سطح پر تشیع کی فکری تربیت، سماجی تنظیم، اور آئینی شعور کو بڑھایا جائے، تاکہ قوم خود اپنی ذمہ داریوں کو سمجھے اور خود اپنی طاقت بنے۔ وہ کسی سہارے پر انحصار کرنے کے بجائے ملت کے داخلی بیداری پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی تقریریں، پیغامات اور بیانات ہمیشہ وحدتِ امت، آئینی جدوجہد، پرامن مزاحمت اور اجتماعی نظم و ضبط کی تاکید کرتے ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ جس قوم میں شعور ہو، تعلیم ہو، تنظیم ہو، اور اپنے دشمن کی چالوں کا فہم ہو، اُسے دشمن کی ہر سازش سے نمٹنے کے لیے بندوق سے پہلے تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے۔

انہوں نے کبھی قومی سیاست سے علیحدگی اختیار نہیں کی، بلکہ تشیع کو پاکستان کے قومی دھارے میں ایک باوقار، باشعور، باعمل قوت کے طور پر قائم رکھا۔ اُن کی قیادت نے ہمیشہ قانونی دائرے کے اندر رہ کر ہر ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی، مگر کبھی ایسا نہیں کیا کہ جس سے پاکستان کی ریاستی ساخت، وحدتِ ملت یا بین المسالک امن خطرے میں پڑے۔ یہی وہ طریقہ ہے جسے بعض لوگ کمزوری سمجھتے ہیں، مگر یہ دراصل اُس حکمت عملی کا حصہ ہے جو دشمن کے فریب، اشتعال انگیزی اور داخلی انتشار پیدا کرنے کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

علامہ ساجد علی نقوی کا تصور قیادت، تشیع کو ایک مزاحمتی مگر مہذب، پرامن مگر بیدار، خاموش مگر فکری، اور کمزور نظر آنے والا مگر باطن میں مضبوط ترین مکتب بنانے کا نمونہ ہے۔ انہوں نے ملت کو صرف مظلومیت میں جینا نہیں سکھایا، بلکہ قانونی، آئینی اور اجتماعی دائرے میں اپنے وجود کو منوانے کا سلیقہ دیا۔ وہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں اگر تشیع کو حقیقی قیادت دینی ہے تو وہ قیادت نعرے، شور یا تصادم سے نہیں بلکہ صبر، نظم، اور حقیقت شناسی سے پیدا ہوگی۔ ان کے نزدیک قیادت کا کام صرف جذبات کو ہوا دینا نہیں بلکہ ان جذبات کی تربیت کرنا ہے تاکہ ملت ردعمل میں بکھرے نہیں بلکہ مقصد کی طرف بڑھے۔

اس حکمت عملی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ علامہ ساجد علی نقوی صرف موجودہ حالات پر نہیں بلکہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ آج جو بنیاد رکھ رہے ہیں وہ ملت کے آنے والے نسلوں کے لیے ایک فکری و عملی راستہ تیار کر رہی ہے، جس میں پاکستان کے اندر ایک باشعور، مہذب، متحد، باصلاحیت اور نظریاتی تشیع ابھر رہی ہے جو وقت آنے پر صرف اپنے دفاع کی نہیں بلکہ اصلاحِ ملت اور نجاتِ امت کی قیادت کر سکتی ہے۔

یہی ان کی اسٹریٹیجی کا حسن ہے، یہی اس کی پختگی ہے، اور یہی وہ عملی مہدویت کا پہلا قدم ہے جس میں انتظار کا مفہوم محض ظہور کا منتظر ہونا نہیں بلکہ ایک منظم، پرعزم اور باشعور امت کا تیار ہونا ہے۔

علامہ ساجد علی نقوی کی داخلی حکمت عملی اگر گہرائی سے دیکھی جائے تو اس کی فکری جڑیں بعینہٖ اس رہنمائی سے جڑی ہوئی ہیں جو رہبر معظم سید علی خامنہ ای کی عالمی سطح پر پالیسی میں نظر آتی ہے۔ دونوں شخصیات بظاہر مختلف جغرافیوں اور دائرہ کار میں کام کر رہی ہیں، لیکن ان کی حکمت، اندازِ قیادت، بردباری، تدبر اور نظریاتی استقامت ایک ہی اصولی بنیاد پر استوار ہے: حق کا دفاع، باطل کے مقابل حکمت و صبر، اور ملت کو طویل مدتی بصیرت کے ساتھ تیار کرنا۔

رہبر معظم کی عالمی حکمت عملی کا ایک بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مزاحمت کو فقط ردعمل یا شورش کی صورت میں نہ برتا جائے بلکہ اُسے ایک منظم، فکری اور اخلاقی طاقت کی شکل دی جائے جو دشمن کے طوفان میں بھی اپنے قدموں پر ثابت رہے اور بگاڑ کے میدان میں اصلاح کا پرچم بلند رکھے۔ رہبر کا یہ نظریہ کہ "ہم اپنے اصولوں پر قائم رہ کر آگے بڑھیں گے" دراصل وہی حکمت ہے جو علامہ ساجد نقوی نے پاکستان کے محدود لیکن حساس تناظر میں اپنائی ہے۔ دونوں قیادتیں جانتی ہیں کہ کسی ملت کو بچانا فقط دشمن سے جنگ کرنے میں نہیں بلکہ اس کے اندر ایسی طاقت پیدا کرنے میں ہے جو دشمن کے ہر چال کو صبر، شعور اور اتحاد سے ناکام بنا سکے۔

امام حسن علیہ السلام کی صلح، جو تاریخ کی سب سے misunderstood حکمت عملی رہی، دراصل اسی اصول کی بلند ترین مثال ہے۔ امام حسن علیہ السلام نے بظاہر اقتدار کو چھوڑا، مگر درحقیقت انہوں نے امت کی جان، دین کا تشخص، اور اہل بیت علیہم السلام کے مشن کی

بقاء کے لیے وہ راہ چنی جو وقتی نظر میں پیچھے ہٹنا تھا لیکن حقیقت میں آنے والی نسلوں کو حق و باطل کی پہچان سکھانے کا ذریعہ بنا۔ ان کی صلح ایک ایسی تدبیر تھی جو وقتی جنگ نہ جیت سکی مگر تاریخ کی جنگ جیت گئی۔ یہ وہی اصول ہے جو رہبر اور علامہ ساجد علی نقوی کی حکمت عملی کا ستون ہے: جب دشمن طاقت کے نشے میں ہو اور امت پراگندہ، تو اس وقت بندوق اٹھانا بہادری نہیں بلکہ امت کو بے سر کر دینا ہے؛ مگر جب امت بیدار، متحد اور بصیرت مند ہو جائے، تو ہاتھ میں بندوق بھی ہو اور دل میں یقین بھی۔

رہبر معظم نے عالمی سطح پر فلسطین، لبنان، یمن، اور عراق کے مزاحمتی محاذ کو صرف اسلحہ دے کر نہیں بلکہ فکری تربیت، اخلاقی جواز، اور حکمتِ عمل کے ذریعے ایسی قیادت عطا کی جو ہر بحران میں اپنے پیروں پر کھڑی رہتی ہے۔ یہ عمل وہی ہے جو علامہ ساجد علی نقوی نے پاکستان میں اختیار کیا، جہاں انہوں نے کسی بھی سازش، اشتعال، یا داخلی تصادم سے تشیع کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک ایسی ملت کی بنیاد رکھی جو نہ صرف اپنا دفاع کر سکے بلکہ اصلاحِ ملت اور وحدتِ امت کی قیادت بھی کرے۔

امام علی علیہ السلام سے امام حسن علیہ السلام، اور پھر امام حسین علیہ السلام تک ہر امام نے وقت اور حالات کے مطابق حکمت اختیار کی۔ امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں شمشیر اٹھائی تو امام حسن علیہ السلام نے صلح کے ذریعے باطل کو بے نقاب کیا۔ امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام نے فکری تربیت کے ذریعے دشمن کے علمی نظام کو شکست

دی۔ یہ سب دراصل ایک مسلسل اور مربوط حکمت کا اظہار ہے: کہ قیادت کا کام وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر قوم کو بچانا اور اس کا مستقبل محفوظ بنانا ہے۔

لہٰذا علامہ ساجد علی نقوی کی حکمت عملی، رہبر معظم کی عالمی حکمتِ قیادت، اور ائمہ علیہم السلام کی سیرتِ معصومین دراصل ایک ہی دریا کے مختلف بہاؤ ہیں، جن کا ماخذ عقل، بصیرت، صبر، توکل، اور راہِ خدا میں استقلال ہے۔ یہ وہ قیادت ہے جو شور میں نہیں چلتی، شعور میں قدم رکھتی ہے۔ دشمن چاہے جتنا بڑا ہو، اگر قیادت صابر، حکیم، اور بیدار ہو تو نہ صرف دشمن کی چال ناکام ہوتی ہے بلکہ قوم وقت کے ساتھ ایک ایسی قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے جسے نہ جنگ روک سکتی ہے نہ فریب، نہ تحریف اور نہ ہی بظاہر وقتی تنہائی۔ اور یہی راہِ مہدویت ہے، جس کی بنیاد صلحِ حسن سے لے کر کربلا، عصرِ غیبت، اور آخر کار ظہور پر منتج ہوتی ہے۔

اس حکمت عملی کو اپنانے کی سب سے بنیادی اور عمیق وجہ امت کی مجموعی بے شعوری، افتراق، اور قیادت سے بدگمانی یا بے نیازی ہے۔ جب معاشرے میں باطل کے مقابل قیام کے لیے وہ شعور، وہ بصیرت، اور وہ عزم موجود نہ ہو جو کسی حقیقی انقلاب یا تحریک کا ایندھن بنتا ہے تو اس وقت اگر کوئی مخلص اور صادق قیادت فقط اس لیے میدان میں اتر جائے کہ دشمن موجود ہے، تو نتیجہ یا تو وہی ہو گا جو امام حسینؑ کے بعد کوفہ والوں کے ساتھ ہوا، یا وہی جو انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آیا کہ ایک فرد یا چند مخلصین تو کھڑے رہے

مگر امت پیچھے ہٹ گئی، یا خواب خرگوش میں سوئی رہی، یا مصلحت اور دنیا کے خوف میں مبتلا ہو کر قیادت کو تنہا چھوڑ دیا۔

تاریخ ہمیں بارہا بتاتی ہے کہ سچے انقلابات فقط جوش، ہتھیار یا نعرے سے نہیں بلکہ فکری و روحانی تیاری، اجتماعی شعور اور قیادت پر ایمان و اعتماد سے پروان چڑھتے ہیں۔ یہی وہ کمی ہے جو انبیاء علیہم السلام کو اپنی قوموں میں درپیش رہی۔ حضرت نوحؑ نے سینکڑوں سال تبلیغ کی مگر امت تیار نہ ہوئی، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے مقابل قیام کیا تو قوم نے سجدہ گاؤ پر اپنی عقیدت لگا دی، اور جب رسول خدا ﷺ نے بدر و احد سے کربلا اور ظہور تک کی تحریک کا آغاز کیا تو چند نفوس کے سوا پوری امت نہ ہجرت کے وقت ساتھ کھڑی ہوئی، نہ صلح الحدیبیہ کو سمجھا، نہ غدیر کے اعلان کو محفوظ رکھا۔

یہی اصول ائمہ اہل بیتؑ کی حیات میں نظر آتا ہے۔ امام علیؑ نے اس وقت خلافت سنبھالی جب امت فتنوں میں الجھ چکی تھی اور وہ ان سے جنگ کرنے کی بجائے ان کے ساتھ سازباز چاہتی تھی۔ امام حسنؑ نے صلح اس وقت کی جب فوج میں منافقین اور دنیاپرست اس حد تک غالب آ چکے تھے کہ جنگ کی صورت میں نتیجہ نہ فقط شکست ہوتا بلکہ امامت کی توقیر بھی مٹ جاتی۔ امام حسینؑ نے قیام اسی وقت کیا جب یہ سمجھ لیا کہ خاموشی دین کی موت ہے اور قربانی دینا زندگی کی علامت۔ امام جعفر صادقؑ نے خونریزی کے بجائے علمی تربیت کو ترجیح دی کیونکہ امت کی فکری کمزوری انقلابی اقدام کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ تھی۔

آج کے دور میں جب عالمی سطح پر ظالم قوتیں متحد ہیں، سرمایہ، میڈیا، ادارے، اور افکار سب ایک شیطانی نظام کے تحت انسانیت کو گمراہی، فحاشی، ظلم، اور ناانصافی کی طرف دھکیل رہے ہیں، تو اس کا مقابلہ محض ہتھیار سے نہیں بلکہ ایسا شعور، ایسی بصیرت، اور ایسی امت کے قیام سے ممکن ہے جو دشمن کی شناخت رکھتی ہو، اپنے ولی کی اطاعت کرتی ہو، اور باطل کی چالوں میں الجھنے کے بجائے صبر و حکمت کے ساتھ اپنی صفیں منظم کرے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں حکیم، صابر، اصولی قیادتوں نے جیسے رہبر معظم سید علی خامنہ ای یا علامہ ساجد نقوی نے صرف دشمن کے وجود کو دیکھ کر جذباتی ردعمل کا راستہ اختیار نہیں کیا بلکہ امت کے داخلی احوال، نفسیاتی سطح، شعوری کمزوری، فکری پراکندگی، اور آپسی افتراق کو مد نظر رکھتے ہوئے تدریجی، حکیمانہ، اور دانشمندانہ حکمت عملی اپنائی تاکہ امت کو پہلے سنوارا جائے، پھر اٹھایا جائے، اور جب اُٹھے تو قیامت کی طرح اثر کرے۔

یہ بات بھی باعث عبرت ہے کہ اسرائیل اور امریکہ جیسی طاقتیں جب کسی خطے پر حملہ کرتی ہیں، تو اکثر مسلم ممالک خاموش رہتے ہیں، یا مصلحت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ فلسطین ہو یا یمن، افغانستان ہو یا شام، مزاحمت صرف چند محاذوں تک محدود رہتی ہے، اور بقیہ امت یا تو تماشائی بنی رہتی ہے یا دشمن کے ساتھ تجارتی و سیاسی تعلقات کو فوقیت دیتی ہے۔ اسی لیے جو قیادت اصولی طور پر امت کی بیداری، فکری تربیت، اور اخلاقی استقامت پر کام کر رہی ہے وہ جانتی ہے کہ ابھی میدان جنگ کا نہیں، بلکہ میدانِ شعور کا وقت ہے۔ کیونکہ اگر یہ مرحلہ عبور نہ کیا جائے تو جو بھی جنگ لڑی جائے گی، وہ ظاہری طور پر ممکن ہے جیتی جائے،

مگر باطنی طور پر قوم کو یا تو مزید ٹوٹ پھوٹ میں مبتلا کرے گی یا پھر دشمن کے پروپیگنڈے کے زیر اثر نئی نسل کو کنفیوژن، مایوسی یا تنقید کی راہ پر ڈال دے گی۔

پس یہ حکمت عملی کسی کمزوری کی علامت نہیں بلکہ اس حقیقت کا ادراک ہے کہ اگر دشمن متحد اور چالاک ہے تو حق کی قیادت کو اس سے بھی زیادہ صابر، دور اندیش اور متحد ہونا پڑے گا۔ اور یہی وہ راستہ ہے جو ظہور امام مہدیؑ کی تیاری کا راستہ ہے، کیونکہ آپ کا ظہور اُس وقت ہو گا جب زمین پر ایسی بصیرت مند اور استوار امت موجود ہو گی جو اُن کے ساتھ کھڑی ہو، نہ صرف عشق میں بلکہ ادراک میں بھی، نہ صرف جذبے میں بلکہ فہم میں بھی۔ اور یہ امت راتوں رات نہیں بنتی، اس کے لیے دہائیوں کی فکری، روحانی اور اخلاقی تربیت درکار ہوتی ہے، جو صرف حکمت والے رہنماؤں کی قیادت میں ممکن ہے۔

اگر علامہ ساجد علی نقوی یا کسی بھی شعور پر مبنی قیادت نے حکمت، صبر، تدبر اور تدریجی تنظیم سازی کو اپنایا ہے تو اس کی ایک اہم اور لازمی وجہ وہ قانونی، ریاستی اور معاشرتی ماحول ہے جو اس ملک میں موجود ہے، جو بظاہر اسلامی جمہوریہ کہلاتا ہے مگر عملاً بعض اوقات ایسے فیصلوں اور پالیسیوں کا گڑھ بن جاتا ہے جو عدل اور مساوات کے تقاضوں کے برخلاف ہوتے ہیں، خاص طور پر جب معاملہ اہل تشیع یا دیگر پس ماندہ مکاتب فکر کی آئینی اور مذہبی آزادی کا ہو۔

پاکستان کے آئین میں اگرچہ ہر شہری کو برابر کے حقوق دیے گئے ہیں، اور ہر مذہبی طبقے کو اپنی عبادات، عقائد اور اظہارِ مذہب کی آزادی حاصل ہے، لیکن زمینی حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں ریاستی ادارے، بعض حکومتیں، اور بااثر مذہبی گروہ اس مساوات کو ہمیشہ اپنی پسند، مفاد اور اکثریتی دباؤ کے تحت توڑتے رہے ہیں۔ یہ رویہ صرف پالیسی سازی تک محدود نہیں بلکہ تعلیمی نصاب، میڈیا کے بیانیے، داخلی سیکیورٹی پالیسی، اور مذہبی تقاریب کے اجازت ناموں تک میں نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اقلیتوں اور خاص طور پر اہلِ تشیع سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی شناخت چھپائیں، اپنے مطالبات ترک کریں اور صرف "ملی وحدت" کے نام پر اپنی تاریخی و عقائدی حقیقت کو قربان کریں، جبکہ دوسری طرف فرقہ واریت پھیلانے والے گروہوں کو نہ صرف تحفظ حاصل ہوتا ہے بلکہ وہ کھلے عام تشیع کے خلاف نفرت انگیزی کو "آزادیِ رائے" کے پردے میں قانونی جواز بھی فراہم کرتے ہیں۔

اس ماحول میں اگر کوئی قیادت ملت کو کھڑا کرنا چاہے، تو اسے ایک تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے۔ ایک طرف ملت کے اندر اضطراب، مظلومیت، اور ردعمل کا جذبہ ہوتا ہے، جو چاہتا ہے کہ کھل کر بولا جائے، سڑکوں پر آیا جائے، اور ریاست سے ٹکرا کر اپنی شناخت کا اعلان کیا جائے، لیکن دوسری طرف ریاستی تعصب، خفیہ اداروں کی مانیٹرنگ، اور اکثریتی گروہوں کی تشدد پر مبنی تاریخ، قیادت کو اس نتیجے پر لے آتی ہے کہ جو اقدام وقتی طور پر جرات یا دلیری سمجھا جائے گا، وہ ملت کو دائمی ریاستی دباؤ، دہشت گردی کے خطرات، یا قانونی گھیراؤ میں مبتلا کر دے گا۔

پاکستان میں "بیلنس پالیسی" کے نام پر اکثر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اگر ایک طرف کسی شدت پسند گروہ کو روکا جائے گا تو دوسری طرف شیعہ عزاداری یا مذہبی سرگرمیوں پر بھی قدغن لگانا "ضروری" ہے تاکہ فریقین کو یکساں سمجھا جائے۔ یہ رویہ نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جو گروہ دفاعی اور آئینی جدوجہد کر رہے تھے وہ بھی ریاستی نظر میں "مشکوک" بن گئے، اور حقیقی شدت پسندوں کو یہ پیغام ملا کہ ریاست ان سے خوفزدہ ہے اور ان کے نفوذ کو محدود کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔

علامہ ساجد نقوی جیسے رہنما اس حقیقت کو بخوبی جانتے ہیں۔ انہوں نے ریاستی ڈھانچوں کے اندر رہتے ہوئے، قانونی ذرائع کے استعمال سے، اور عوامی سطح پر شعور بیدار کر کے ایک ایسی قیادت قائم رکھی ہے جو ریاست سے ٹکرائے بغیر اپنی موجودگی منواتی ہے، اور جو نفرت و تشدد کے مقابل صبر، فہم اور تنظیم کی طاقت سے کام لیتی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس ملک میں اگر ملت جعفریہ کو عزت کے ساتھ جینا ہے تو اسے قانونی میدان میں لڑنا ہوگا، تعلیمی اداروں میں فکر پیدا کرنی ہوگی، اور داخلی وحدت کے ذریعے اپنی طاقت کو غیر جارحانہ مگر مؤثر انداز میں اجاگر کرنا ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ آج اگر پاکستان میں تشیع کے تحفظ کی کوئی صورت باقی ہے تو وہ صرف اس حکمت عملی کی بدولت ہے جس نے فوری ردعمل کو پس پشت ڈال کر تدریجی طاقت کی بنیاد رکھی، اور جو ریاستی تعصبات کے باوجود آئینی میدان میں مضبوط اور باوقار انداز میں اپنا مقدمہ لڑ رہی ہے۔ اسی تدبر نے پاکستان کے مشکل ترین حالات میں ملت کو محفوظ بھی رکھا

اور منظم بھی، اور یہی وہ حکمت عملی ہے جو اگرچہ سست نظر آتی ہے مگر اس کی جڑیں گہری ہیں، اور جو آنے والے وقت میں قوم کو ایک خود مختار، باوقار اور بصیرت مند اجتماعی قوت کی شکل دے سکتی ہے۔

علامہ ساجد علی نقوی کی حکمت عملی کا گہرا تعلق صرف داخلی فرقہ وارانہ اور ریاستی تعصبات سے ہی نہیں بلکہ اس عالمی منظر نامے سے بھی ہے جہاں صہیونی سرمایہ دار استعمار ایک منظم، گہری اور ہمہ جہت سازش کے تحت دنیا بھر میں مزاحمتی افکار، دینی قیادت، اور بیدار ملتوں کو کمزور کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہے۔ یہ استعمار محض فوجی یا اقتصادی تسلط سے کام نہیں لیتا بلکہ شعور، ثقافت، نظریات اور ریاستی اداروں کے اندر گُھس کر ملتوں کی خودی کو مفلوج کرنے کی چالاکی سے کام لیتا ہے۔ پاکستان کی گہرائی میں بیٹھا ہوا ڈیپ اسٹیٹ سٹرکچر اس بین الاقوامی منصوبے کا ایک خاموش مگر مؤثر آلہ ہے، جو بظاہر قومی سلامتی، داخلی استحکام اور ریاستی وقار کی حفاظت کے نام پر بعض ایسی پالیسیاں بناتا ہے جن کا اصل ہدف ان حلقوں کو دبانا ہوتا ہے جو فکری آزادی، مذہبی تشخص اور نظریاتی استقامت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ایسے ماحول میں اگر کوئی قیادت مزاحمت، احتجاج یا بغاوت کا نعرہ لگا کر کھڑی ہو جائے تو وہ صرف ریاستی شکنجے میں نہیں آتی بلکہ عالمی صہیونی بیانیے کو مزید مواد مہیا کر دیتی ہے کہ تشیع کو دہشتگرد، انتشار پسند یا تخریبی سوچ کا حامل بنا کر پیش کیا جائے۔ یہی وہ نکتہ ہے جسے علامہ ساجد علی نقوی نے گہرائی سے سمجھا۔ انہوں نے جان لیا کہ اگر ملت کو زندہ رکھنا ہے تو

صرف دشمن سے جنگ نہیں بلکہ دشمن کی چالوں کو سمجھ کر ان سے بچنا بھی ایک جہاد ہے۔ عالمی استعمار تشیع کو کبھی اپنے ساتھ نہیں جوڑ سکتا کیونکہ تشیع، عدل، توحید، آزادی اور مظلوم کی حمایت کی علامت ہے۔ اس لیے وہ صرف فوجی یا میڈیا کے ذریعے نہیں بلکہ ان ریاستی اداروں کو بھی استعمال کرتا ہے جو سکیورٹی یا بیلنس پالیسی کی آڑ میں ملت کے فکری ارتقاء کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاکستان میں ڈیپ اسٹیٹ کے نظریاتی رجحانات، بین الاقوامی دباؤ، اور خلیجی ریاستوں کے ساتھ اس کے مفادات بھی اکثر اہل تشیع کے آئینی حقوق کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ چنانچہ جب ملت جعفریہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھتی ہے، جب وہ سیاسی طور پر منظم ہوتی ہے، جب وہ قانونی و آئینی بنیاد پر اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہے تو اسے ایک خطرہ سمجھا جاتا ہے، اور عالمی سامراج کے اشارے پر اندرونی ریاستی عناصر اسے محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جذباتی ردعمل، نعرے، احتجاج اور ٹکراؤ نہ صرف ملت کو کمزور کرتے بلکہ دشمن کو مزید مضبوط کرتے ہیں۔

علامہ صاحب کی حکمت عملی دراصل اس فکری انقلاب کا آغاز ہے جو دشمن کی ظاہری طاقت سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی چالوں کو بے نقاب کرتا ہے، جو مزاحمت کو بندوق کی گولی سے نہیں بلکہ شعور، تربیت، تنظیم اور حکمت کے ساتھ دشمن کے منصوبے پر ضرب لگاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ملت کو زندہ رکھنا ہے تو اسے نہ صرف باہر کے دشمن سے بچانا ہے بلکہ اندر کے مکار، موقع پرست، اور دین فروش عناصر سے بھی محفوظ رکھنا

ہے، جو دین کے نام پر ملت کو تقسیم کرتے ہیں اور سامراج کی خدمت میں اپنی قربانی پیش کرتے ہیں۔

یہ حکمت عملی ایک ایسا قلعہ ہے جس کے اندر ملت کو شعور دیا جا رہا ہے، جس کے دروازے حکمت سے پر نور ہیں اور جس کی دیواریں اخلاص، صبر اور فہم سے بلند کی گئی ہیں۔ یہ ایک فکری مزاحمت ہے جو ظاہری خاموشی میں دشمن کی سازشوں کو بے اثر بنا رہی ہے، اور جو وقت کے ساتھ ایک ایسی ملت کو جنم دے رہی ہے جو نہ صرف پاکستان بلکہ عالمی سطح پر استکبار کے خلاف ایک روشن مثال بن سکتی ہے۔ یہ حکمت وہی فلسفہ ہے جو غیبتِ امام کے دور میں اپنی جگہ بناتا ہے، دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں بلکہ اُس کی آنکھ سے پہلے اُس کے منصوبے کو دیکھ کر اُسے ناکام بناتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو امام مہدیؑ کے ظہور کی زمین ہموار کرتا ہے، اور یہی وہ راہ ہے جو ہر فکری امام، ہر صادق قیادت، اور ہر باشعور ملت کا اصل ہتھیار ہے۔

تدبیر یا تقدیر؟!!

انسان کو ہر چیز پر مسلسل تدبیر، پلاننگ اور کیلکولیشن مسلط کرنے کے بجائے، زندگی کے کچھ پہلوؤں کو فطری بہاؤ کے ساتھ چلنے دینا چاہیے۔ بعض اوقات عقل سے زیادہ سکون فطرت کے خاموش بہاؤ میں ملتا ہے۔

انسان فطرتاً کنٹرول پسند مخلوق ہے۔ وہ ہر شے کو قابو میں لانا چاہتا ہے: وقت، حالات، رشتے، نتائج، حتیٰ کہ خود تقدیر کو بھی۔ ہم صبح آنکھ کھولتے ہیں تو چیک لسٹ کے ساتھ، کیلنڈر کے پیچھے دوڑتے ہیں، گھنٹوں منصوبہ بندی کرتے ہیں، اور ہر عمل کو کسی نتیجے، ہدف یا فتوحات کے پیمانے پر پرکھنے لگتے ہیں۔ ہمیں گمان ہوتا ہے کہ اگر ہم نے ہر چیز کو پہلے سے طے کر لیا، منصوبہ بنایا، ہر خطرے کا اندازہ لگا لیا، اور ہر ممکنہ موڑ کو کیلکولیٹ کر لیا تو ہم ناکامی، تاخیر یا نقصان سے بچ جائیں گے۔ لیکن کیا زندگی واقعی ایسے چلتی ہے؟

زندگی ایک دریا کی مانند ہے، جس کا فطری بہاؤ ہے، جس کے پیچ و خم، اتار چڑھاؤ اور رفتار اپنی جگہ طے شدہ ہے۔ اگر آپ اس دریا کے ساتھ چلیں، تو وہ آپ کو بہا کر کنارے تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ اس کے خلاف پیڈل چلانے لگیں، مسلسل ڈائریکشن بدلنے کی کوشش کریں، یا ہر لمحہ اس کے بہاؤ کو کنٹرول کرنا چاہیں، تو نہ صرف آپ تھک جائیں گے، بلکہ بعض اوقات ڈوبنے کے قریب بھی جا پہنچیں گے۔

ہر موقع پر تدبیر، پلاننگ اور کیلکولیشن کی ضد کرنا اکثر زندگی کو پیچیدہ بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات ہم کسی رشتے کو اتنا تجزیاتی انداز میں دیکھنے لگتے ہیں کہ محبت اور خلوص کی اصل روح ہی مر جاتی ہے۔ کسی کام میں اتنا حساب کتاب لے آتے ہیں کہ اخلاص اور توکل کا مقام ختم ہو جاتا ہے۔ ہم ہر قدم پر فائدہ، نقصان، وقت، قیمت، موقع، اور نتیجے کا سوال اٹھاتے ہیں —یہاں تک کہ دل کا سکون خود ہم سے روٹھ جاتا ہے۔

کبھی کبھی زندگی میں کچھ چیزوں کو بس فطری رفتار سے بہنے دینا بہتر ہوتا ہے۔ کچھ فیصلے خاموش رہ کر کیے جائیں، کچھ وقت بے سمت گزارنے دیا جائے، کچھ رشتے بغیر قاعدے کے پنپنے دیے جائیں، کچھ کام بغیر حساب کے کیے جائیں —نہ اس لیے کہ ہم لاپرواہ ہیں، بلکہ اس لیے کہ ہم سمجھ گئے ہیں کہ ہر عمل کو کیلکولیٹ کرنے کی ضد اکثر اس کے حسن کو مار دیتی ہے۔

یہی حکمت ہمیں قرآن اور سنت میں بھی نظر آتی ہے۔ نبی کریم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں تدبیر کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں، وہیں وہ ان مقامات پر بھی ہمیں نظر آتے ہیں جہاں معاملے کو وقت کے ساتھ فطری طور پر چلنے دیا گیا۔ فتح مکہ ہو یا طائف کی حکمتِ عملی، صلح حدیبیہ ہو یا ہجرت کا وقت — ہر جگہ ہر چیز پلاننگ سے نہیں، بلکہ بعض اوقات صبر، خاموشی اور فطری بہاؤ کے مطابق ہوئی۔ رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں یہ سکھایا کہ عقل، تدبیر اور توکل —تینوں میں توازن ہی اصل کامیابی ہے۔

حضرت خضرؑ اور موسیٰؑ کے واقعے میں بھی یہی سبق ہے: جو چیز فوری طور پر سمجھ میں نہ آئے، اُسے زبردستی سمجھنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ وقت اور حکمت پر چھوڑ دو۔ دنیا کا ہر راز عقل سے نہیں کھلتا، کچھ راز خاموشی اور تسلیم سے ہی کھلتے ہیں۔

اکثر اوقات ہم اتنی پلاننگ کر لیتے ہیں کہ وہی پلاننگ ہمارے عمل کی دشمن بن جاتی ہے۔ ہم اتنا سوچتے ہیں کہ عمل کی ہمت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہم ہر رستے کے نتائج سے ڈر کر چلنا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کیفیت میں تدبیر، ترقی کا وسیلہ نہیں بلکہ تاخیر کا سبب بن جاتی ہے۔

اسی لیے ضروری ہے کہ ہم زندگی کو مکمل کنٹرول کرنے کی خواہش چھوڑیں۔ کبھی کبھار کچھ فیصلے خدا پر چھوڑ دیجیے، کچھ راہوں کو وقت کے سپرد کر دیجیے، کچھ تعلقات کو خلوص کے سہارے پر چلنے دیجیے۔ اور خود کو اس یقین کے ساتھ آزاد کیجیے کہ اگر نیت سچی ہو، دل صاف ہو، اور ارادہ نیک ہو، تو بہت سی چیزیں بغیر حساب و کتاب کے بھی بہترین طریقے سے ہو جاتی ہیں — بلکہ زیادہ خوبصورتی سے ہو جاتی ہیں۔

انسان کی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ وہ تدبیر کرے، لیکن تقدیر پر یقین رکھے۔ وہ سمجھے کہ ہر موقع تدبیر کا نہیں، کبھی کبھی بس خاموشی سے دریا کے بہاؤ میں بہنا بہتر ہوتا ہے۔ تدبیر اور تقدیر کے درمیان توازن ایک نہایت نازک اور اہم مقام رکھتا ہے۔ تدبیر انسان کا فطری اختیار ہے، جبکہ تقدیر اللہ کی مشیت اور علمِ ازلی کا مظہر۔ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی حد فاصل ہے، جسے عبور کرنے سے انسان یا تو گھمنڈی ہو جاتا ہے یا مکمل مایوس۔ اس

درمیانی مقام کو اگر ہم "ریڈ لائن" کہیں تو بے جا نہ ہو گا، کیونکہ یہ وہ حد ہے جہاں عقل، اختیار اور ایمان کا تصادم ہوتا ہے، اور اگر اس توازن کو نہ سمجھا جائے تو زندگی کے بڑے بگاڑ پیدا ہو سکتے ہیں۔

جب انسان تدبیر میں افراط کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ سب کچھ اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے کنٹرول میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر فیصلہ، ہر نتیجہ، ہر تبدیلی اُس کے پلاننگ بورڈ پر ہونا چاہیے۔ اس کی دعائیں بھی، اس کی نیند بھی، اس کے رشتے بھی اور اس کے جذبات بھی، سب کسی نہ کسی "تار" سے بندھے ہوتے ہیں جنہیں وہ خود کھینچتا اور چھوڑتا ہے۔ ایسا انسان رفتہ رفتہ ایک "خود ساختہ خدائی" کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، جہاں وہ کسی ناپسندیدہ نتیجے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر کچھ ویسا نہ ہو جیسا اس نے چاہا تھا تو وہ ٹوٹ جاتا ہے، چونک جاتا ہے، یا خود پر اور دوسروں پر الزام تراشی شروع کر دیتا ہے۔ یہ مسلسل تناؤ، بے چینی، نیند کی کمی، فیصلوں کا خوف، اور بے تحمل مزاجی کو جنم دیتا ہے۔ ایک مرحلے پر آ کر ایسا شخص زندگی کو بوجھ سمجھنے لگتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز کو اپنے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے۔

دوسری طرف جب انسان تقدیر کے نام پر ہر شے کو مکمل طور پر چھوڑ دیتا ہے، تو وہ خود کو لاچار محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ نہ سوچتا ہے، نہ پلان بناتا ہے، نہ کوشش کرتا ہے، اور ہر ناکامی کا جواز صرف ایک جملے میں پیش کر دیتا ہے: "تقدیر میں یہی لکھا تھا۔" یہ تفریط اس کے عمل، ہمت اور ارادے کو مفلوج کر دیتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بے عملی، جمود اور قسمت

کے بہانے میں پناہ لینے لگتا ہے۔ ایسا شخص کسی کامیابی کا اصل مزہ نہیں لے سکتا کیونکہ وہ اپنی کوشش کو کبھی تسلیم ہی نہیں کرتا، اور کسی ناکامی سے کچھ سیکھ نہیں سکتا کیونکہ وہ خود کو کبھی ذمہ دار نہیں سمجھتا۔ ایسے لوگ یا تو اپنی ذات سے مایوس ہو جاتے ہیں یا دوسروں سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ ان کا نفسیاتی مزاج مسلسل خالی پن اور بے سمتی کا شکار رہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تدبیر و تقدیر کی ریڈ لائن وہ مقام ہے جہاں انسان کو رک کر یہ سمجھنا ہوتا ہے کہ میرا کام کوشش کرنا ہے، نتیجہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ مجھے عقل اور اختیار اللہ نے دیا ہے تاکہ میں قدم اٹھاؤں، مشورہ کروں، منصوبہ بناؤں، لیکن میں یہ نہ بھولوں کہ آخری فیصلہ میرے رب کا ہوتا ہے۔ مجھے تقدیر پر ایمان رکھنا ہے، لیکن سستی اور جمود کے لیے اسے بہانے کے طور پر نہیں لینا۔

ان دونوں کے درمیان توازن ایک بالغ اور باایمان شخصیت کی پہچان ہے۔ ایسا شخص کوشش کرتا ہے، مگر اس میں تکبر نہیں آتا۔ وہ دعا کرتا ہے، مگر سستی نہیں آتی۔ وہ فیل ہو جائے تو ٹوٹتا نہیں، کامیاب ہو جائے تو اڑتا نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میرا ہر قدم میری نیت اور سعی سے ہے، لیکن میرا ہر انجام اللہ کی حکمت اور علم سے ہے۔

اس توازن کی عدم موجودگی ہمارے معاشروں میں شدید نفسیاتی، جذباتی اور روحانی بیماریوں کو جنم دیتی ہے۔ انسان یا تو پرفیکشنزم کا مریض بن جاتا ہے یا مایوسی کا شکار۔ یا تو ہر وقت الجھن، دباؤ اور خوف میں جیتا ہے، یا ہر بات کو قسمت کہہ کر اپنی کمزوریوں کی پردہ پوشی

کرتا ہے۔ ایک طرف سختی ہے، دوسری طرف غفلت — اور دونوں کا علاج ایک ہی ہے: توکل اور توازن۔

تقدیر کو ماننا، اس پر ایمان رکھنا اور تدبیر کے دائرے میں رہ کر عمل کرنا ہی وہ راستہ ہے جو انسان کو بے چینی، افسردگی، مایوسی اور غرور، سب سے بچا کر رکھتا ہے۔ یہ راستہ نہ محض عقلی ہے نہ محض روحانی، بلکہ یہ دونوں کا امتزاج ہے — اور یہی اسلام کی اصل روح بھی ہے۔

ترقی کا حقیقی پیمانہ

دنیا میں ترقی یافتگی کا جو پیمانہ آج رائج ہے، وہ زیادہ تر معاشی ترقی، سائنسی اختراعات اور شہری انفراسٹرکچر کی بنیاد پر طے کیا جاتا ہے۔ کسی ملک کے جی ڈی پی، اس کی صنعتی طاقت، سڑکوں، پلوں، اسپتالوں اور تعلیمی اداروں کی تعداد اور معیار کو دیکھ کر اسے ترقی یافتہ یا غیر ترقی یافتہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ایک مروجہ ماڈل ہے جو اقوامِ متحدہ سے لے کر عالمی مالیاتی اداروں تک تسلیم شدہ ہے۔ مگر اس ترقی کی بنیاد پر جو معاشرہ جنم لیتا ہے، اُس کی ثقافت اور تہذیب کی نوعیت کیا ہے؟ کیا واقعی یہ ترقی انسانی فطرت، اخلاقیات اور روحانی توازن کے ساتھ ہم آہنگ ہے، یا پھر یہ صرف ایک چمکتی ہوئی ظاہری دنیا ہے جس کے پردے کے پیچھے ایک تاریک، بے روح اور بے معنی زندگی پنہاں ہے؟ کیونکہ جب بھی ہم ترقی کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں بلند و بالا عمارات، چمکتی سڑکیں، تیز رفتار ریلیں، جدید اسپتال، اور ڈیجیٹل ٹیکنالوجی سے لیس معاشرے آتے ہیں۔ یہ سب بلاشبہ انسانی ذہانت کی بلندیاں ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی ترقی کا مکمل چہرہ ہے؟ کیا صرف مادی سہولتیں حاصل کر لینے سے انسان واقعی "ترقی یافتہ" ہو جاتا ہے؟ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ترقی کی اصل روح وہ ہے جو انسان کو اس کی فطرت کے مطابق ڈھالے، جو اس کے دل و دماغ، روح و جسم، اور فرد و معاشرہ سب کو ہم آہنگی کے ساتھ پروان چڑھائے۔ جب اخلاق ناپید

ہوں، رشتے بے معنی ہو جائیں، روحانیت مذاق بن جائے، اور خاندان بکھر جائیں، تو چاہے کتنی ہی ترقی ہو، وہ صرف ایک سراب رہ جاتی ہے، نہ کہ حقیقی کامیابی۔

مغربی دنیا نے بلاشبہ مادّی ترقی کی دوڑ میں ناقابلِ تردید کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ سائنس، ٹیکنالوجی، تعلیم، طب، ٹرانسپورٹ، اور شہری سہولیات میں ان کا مقام مثالی ہے۔ مگر جیسا کہ شاعر کہتا ہے کہ "خدا حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے"، ویسے ہی جب کسی معاشرے میں معاشی بہتری آتی ہے تو لازمی طور پر ایک تہذیبی اور ثقافتی نفاست بھی جنم لیتی ہے۔ مغرب میں انسانی رویوں میں شائستگی، قانون کی پاسداری، وقت کی قدر، دوسروں کے حقوق کا احترام، اور ادارہ جاتی نظم کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان معاشروں میں شہری اپنے فرائض سے واقف ہیں، حکومتیں عمومی طور پر جواب دہ ہیں، اور ادارے کسی حد تک میرٹ اور شفافیت پر کام کرتے ہیں۔ یہ وہ رخ ہے جس کی بنیاد پر مغربی تہذیب کو "ترقی یافتہ" کہنے میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ مغرب نے بلاشبہ سائنس، ٹیکنالوجی، تعلیم، اور سیاسی نظم و نسق میں حیران کن ترقی کی ہے، اور یہ قابلِ تحسین پہلو ہے۔ ان معاشروں میں قانون کی بالادستی، فرد کی آزادی، ادارہ جاتی شفافیت، اور فلاحی نظام کی موجودگی اُن بہت سے مسلم معاشروں کے لیے مثال بن سکتی ہے جہاں یہ چیزیں ابھی خواب معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن اس ظاہری ترقی کے نیچے ایک گہری خالی جگہ بھی ہے، ایک ایسا خلا جو نہ دولت بھر سکتی ہے، نہ سہولیات، اور نہ ہی آزادی۔ وہ خلا روحانیت کا ہے، خاندانی روابط کا ہے، وہ فطری

اصولوں سے دوری کا خلا ہے جس کی بنا پر فرد ایک اکیلا، منتشر اور الجھا ہوا وجود بن چکا ہے۔ یہ وہ زاویہ نگاہ ہے جسے دیکھنے سے اکثر لوگ گریز کرتے ہیں یا دانستہ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہی تہذیب جو بظاہر شائستگی، آزادی اور انسانی حقوق کی علمبردار دکھائی دیتی ہے، اندرونی طور پر اخلاقی زوال، روحانی خلا، خاندانی نظام کی بربادی، جنسی بے راہ روی، مادہ پرستی، اور نفس پرستی کی دلدل میں دھنسی ہوئی ہے۔ کلبنگ، شراب نوشی، منشیات کا استعمال، ہم جنس پرستی کو قانونی تحفظ، اور "خود کی پہچان" کے نام پر ہر فطری حد سے انکار، یہ سب کچھ اُس تہذیب کا حصہ ہے جو خود کو مہذب ترین سمجھتی ہے۔ آزادی کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے، وہ درحقیقت انسان کو اس کی اصل شناخت، یعنی اس کی روح، ضمیر، اور خاندانی وابستگی سے کاٹ کر ایک ایسے خود غرض، تنہا اور منتشر وجود میں بدل رہا ہے جو بظاہر آزاد ہے لیکن اندر سے کھوکھلا ہے۔ مغربی معاشرے میں افراد آزاد تو ہیں، مگر اس آزادی نے انہیں بے بنیاد کر دیا ہے۔ جب "میرا جسم، میری مرضی" کا نعرہ زندگی کی سب سے بڑی قدر بن جائے، جب خاندان کو محض ایک وقتی ضرورت سمجھا جائے، جب مرد و عورت کا رشتہ صرف "سہولت کی پارٹنرشپ" بن جائے، اور جب والدین اور اولاد کے تعلقات میں محبت کے بجائے قانونی حدود پر زور ہو، تو یہ آزادی انسان کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔ ایسے معاشرے میں ترقی کا ظاہری چمک دمک موجود ہوتا ہے، مگر انسان کے اندر ایک مسلسل اضطراب، بے چینی، اور تنہائی کا زہر سرایت کیے رہتا ہے۔ خودکشی کی شرح، ڈپریشن،

انزائٹی، اور بے مقصدیت کا احساس، مغربی دنیا میں اس قدر عام ہو چکا ہے کہ ماہرین اب اسے تہذیبی بحران کے طور پر دیکھنے لگے ہیں۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ مغربی دنیا میں حکومت اور عوام کے درمیان ایک واضح خلیج ہے۔ حکومتیں جہاں عالمی خفیہ طاقتوں کی نمائندہ بنتی ہیں، اور اکثر استعماری ایجنڈوں کو عملی جامہ پہناتی ہیں، وہیں عوام کی اکثریت اب بھی بنیادی انسانی اقدار، خاندانی روایات اور اخلاقی حدود کو اہمیت دیتی ہے۔ چنانچہ مغربی معاشروں کو یکسر رد کر دینا بھی حقیقت سے فرار ہے۔ وہاں انسانی رویے بعض پہلوؤں میں ہماری مسلم معاشروں سے زیادہ بہتر اور متوازن دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان رویوں کی جڑیں تاریخی مذہبی خصوصا اسلام کے سنہری دور کی تعلیمات میں پنہاں ہیں جنھوں نے غیر مہذب مغربیوں کو اخلاقیات یا روحانی تربیت دی اور انہوں نے اس میں کافی حد تک نکھار پیدا کر کے نظامی استحکام کو فروغ دیا، جس کا نتیجہ ایک حد تک ظاہری شائستگی کی صورت میں نکلتا ہے۔

تاہم یہ بھی سچ ہے کہ انہی معاشروں میں وہ سوچ بھی پنپ رہی ہے جو خدا، مذہب، خاندان، اور فطری تعلقات کو غیر ضروری اور بوجھ سمجھتی ہے۔ یہی وہ سوچ ہے جو "ترقی" کے نام پر دنیا کے دوسرے معاشروں کو بھی انہی راستوں پر ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے، جو آخر کار انسان کو حیوان سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔ یہ تہذیبی یلغار صرف ایک ثقافتی ماڈل نہیں، بلکہ ایک فکری استبداد ہے جو کمزور اور پسماندہ معاشروں میں اپنی مصنوعی چمک دمک کے ذریعے داخل ہو کر ان کی روحانی اساس کو ملیامیٹ کر دیتی ہے۔

مغرب کی تہذیب نے ایک پہلو میں کمال حاصل کیا ہے، لیکن دوسرے میں وہ زوال کی انتہائی سطح تک پہنچ چکی ہے۔ وہ جس "ترقی" پر نازاں ہے، وہ ایک ایسی عمارت ہے جس کی بنیاد ریت پر رکھی گئی ہے۔ جب بنیاد فطرت، اخلاق اور روحانیت سے کٹی ہوئی ہو، تو وہ جتنی بھی اونچی ہو، بالآخر گر ہی جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ حقیقی ترقی وہ ہے جو انسان کو انسان رکھے، جو نہ صرف اس کے جسم کو غذا دے بلکہ اس کی روح کو بھی سیراب کرے، جو اسے صرف صارف نہیں بلکہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنائے، جو اس کے ہاتھ میں ٹیکنالوجی دے مگر دل میں خوفِ خدا بھی پیدا کرے۔ اگر دنیا کو واقعی امن، سکون، اور انصاف درکار ہے، تو اسے صرف سڑکیں، اسکائی اسکریپرز، یا مصنوعی ذہانت نہیں بلکہ وہ اخلاقی و روحانی بنیادیں چاہئیں جو انسان کو فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کر سکیں۔ بصورتِ دیگر، یہ تمام ترقی انسان کو ایک ایسی گمشدگی کی طرف لے جائے گی جہاں وہ اپنی ذات کو ہی کھو بیٹھے گا۔ دنیا کے لیے سب سے بڑا چیلنج اب یہ ہے کہ وہ ترقی کے اس ماڈل کو دوبارہ دریافت کرے جو انسان کو اندر اور باہر دونوں سطحوں پر سنوارے—اور یہی ماڈل اسلام پیش کرتا ہے، جو مادی ترقی کے ساتھ روحانی نجات کا بھی ضامن ہے۔

لہٰذا دنیا میں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ کی جو تفریق ہے، وہ صرف معاشی یا سائنسی پیمانوں پر قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر ہم انسان کو صرف ایک معاشی یونٹ سمجھیں گے، تو مغرب کی تقلید قابلِ ستائش بن جائے گی۔ لیکن اگر انسان کو ایک روحانی، اخلاقی اور سماجی وجود مانیں، تو پھر ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ حقیقی ترقی صرف سڑکیں اور اسکائی اسکریپرز بنانے سے نہیں

آتی، بلکہ اخلاق، تہذیب، روحانیت، خاندانی ہم آہنگی، اور فطری اصولوں کی پاسداری سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ ترقی ہے جو دیرپا ہے، جو انسان کو انسان رکھتی ہے، اور جو زمین پر امن، انصاف اور سکون کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مغرب نے ایک پہلو میں ترقی حاصل کر لی، مگر دوسرے میں وہ بدترین زوال کا شکار ہے—اور اصل ترقی وہ ہے جو دونوں پہلوؤں میں توازن قائم رکھ سکے۔

دائمی ترقی کی بنیاد انسانی قدروں، اخلاقی اصولوں، روحانی سکون، خاندانی ہم آہنگی، اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ طرزِ زندگی پر ہونی چاہیے۔ یہی وہ ترقی ہے جو انسان کو اس کی اصل پہچان سے جوڑتی ہے، جو انسان کو صرف جسم نہیں بلکہ روح بھی مانتی ہے، اور جو دنیا میں امن، انصاف اور باہمی احترام کے ساتھ جینے کی راہیں فراہم کرتی ہے۔

اخلاقیات کسی بھی فرد یا معاشرے کی روح ہوتی ہیں۔ جس معاشرے میں جھوٹ، خیانت، لالچ، حسد، اور ظلم عام ہوں، وہ بظاہر کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو، درحقیقت وہ اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ اخلاق ہی وہ شفاف آئینہ ہے جس میں انسان اپنی شخصیت کو پہچانتا ہے، اپنی غلطیوں کا ادراک کرتا ہے، اور دوسروں کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ اخلاقی زوال معاشرتی انحطاط کی پہلی علامت ہوتا ہے، کیونکہ جب انسان دوسروں کے ساتھ انصاف کرنا چھوڑ دے، ان کے حقوق غصب کرے، اور صرف اپنے مفاد کی سوچے تو معاشرہ فرد فرد ٹوٹنے لگتا ہے۔ حقیقی ترقی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب انسان اپنے کردار میں سچائی، امانت، عدل، نرم مزاجی اور ایثار پیدا کرے۔

تہذیب ایک دوسرے کے ساتھ جینے کا ہنر سکھاتی ہے۔ یہ وہ نرمی، شائستگی، اور برداشت ہے جو انسانی رویوں کو مہذب بناتی ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں مختلف طبقات، نسلیں، مذاہب اور افکار کے لوگ تہذیب کے دائرے میں باہم جُڑ کر رہتے ہیں، وہی حقیقی معنوں میں ترقی یافتہ کہلانے کے قابل ہے۔ لیکن جب تہذیب صرف بیرونی مظاہر تک محدود ہو جائے، جب دلوں میں سختی، زبانوں میں زہر، اور رویوں میں نفرت آ جائے، تو ایسے معاشرے کے لیے تمام تر ترقی بے سود ہے۔

روحانیت، وہ باطنی روشنی ہے جو انسان کو اپنے خالق سے جوڑتی ہے، اسے اس کائنات میں اپنی حیثیت کا شعور دیتی ہے، اور اس کے اندر خوفِ خدا اور احتسابِ نفس کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ایک روحانی انسان نہ صرف اپنے خالق کے ساتھ تعلق قائم رکھتا ہے بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو بھی بھرپور انداز میں ادا کرتا ہے۔ روحانیت انسان کو خود پسندی سے نکال کر دوسروں کی بھلائی، خیر خواہی اور فلاح کی طرف مائل کرتی ہے۔ یہی روحانی توازن ترقی کا وہ ستون ہے جو صرف دنیا نہیں، آخرت کو بھی سنوارنے والا ہے۔

خاندانی ہم آہنگی کسی بھی معاشرے کی بنیاد ہے۔ خاندان انسان کی پہلی تربیت گاہ، محبت کا پہلا مرکز، اور سوشل سیکیورٹی کا بنیادی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ جس معاشرے میں خاندان بکھر جائیں، شوہر و بیوی کے رشتے ٹوٹ جائیں، والدین اور اولاد کے تعلقات بے معنی ہو جائیں، وہاں بے چینی، تنہائی، اور انتشار جنم لیتے ہیں۔ خاندانی نظام کا استحکام ہی وہ قوت ہے جو معاشرے میں نسل در نسل اقدار، تہذیب، اور انسانیت منتقل کرتی ہے۔

بندگانِ خدا کے حقوق کی ادائیگی، یعنی انسانوں کے ساتھ عدل، رحم، اور مساوات کا برتاؤ، کسی بھی مہذب و ترقی یافتہ معاشرے کی اصل جان ہے۔ چاہے وہ معاشی حقوق ہوں، سماجی احترام ہو، اقلیتوں کے تحفظ کی بات ہو، یا کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک—یہ سب اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان دوسرے انسان کو اللہ کی مخلوق سمجھ کر اس کا حق نہ پہچانے۔ جب انسان دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرتا ہے، ان کے دکھ درد بانٹتا ہے، اور اپنے مفادات کو پیچھے رکھ کر دوسروں کی فلاح کا سوچتا ہے، تب معاشرہ حقیقتاً امن کا گہوارہ بنتا ہے۔

فطری اصولوں کی پاسداری یعنی وہ قوانین جو انسان کی جبلت، اس کے جسم و روح کی ساخت، اور اس کے معاشرتی تقاضوں کے مطابق نازل کیے گئے ہیں، ترقی کا وہ راستہ ہے جو کبھی ناکامی سے دوچار نہیں ہوتا۔ مغرب کی جدید تہذیب نے ان فطری اصولوں کو رد کر کے بظاہر آزادی تو حاصل کی، مگر اس آزادی نے انہیں نہ ختم ہونے والے اضطراب، روحانی بے چینی، اور معاشرتی انارکی کا شکار کر دیا۔ جب تک انسان اپنی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہوتا، وہ جتنی بھی ترقی کر لے، وہ ہمیشہ خلا کا شکار رہے گا۔

لہٰذا حقیقی ترقی وہ ہے جو انسان کو اس کی روحانی، اخلاقی، اور معاشرتی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔ وہ ترقی جو صرف مادّی ہو، وقتی ہو، اور فرد کو خود غرضی، تنہائی اور بے مقصدیت کی طرف دھکیل دے، وہ دراصل ایک دھوکہ ہے۔ دیرپا ترقی وہی ہے جو انسان کو انسان رکھے، جو اسے اس کے خالق سے جوڑ دے، جو زمین پر امن، عدل، محبت اور بھائی

چارے کی فضا قائم کرے، اور جو ہر فرد کو اس کی اصل پہچان واپس لوٹا دے — یعنی وہ اشرف المخلوقات ہے، نہ کہ صرف ایک صارف، ایک مشین، یا ایک معاشی پرزہ۔ یہ وہ ترقی ہے جو صرف اسلام جیسا متوازن اور فطری دین ہی پیش کر سکتا ہے، کیونکہ اس کا ماڈل دنیا و آخرت دونوں کی فلاح پر مبنی ہے۔

تقلید اور حکومت اسلامی کے قیام کیلئے حکم معصومؑ

اس دعوے کہ "آئمہ معصومینؑ نے زمانۂ غیبت میں نہ تقلید کا حکم دیا ہے اور نہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا" ایک طرف کچھ منتخب روایات کی مخصوص تاویلات سے استدلال ہے، لیکن جب ہم پورے قرآن، سیرتِ نبویؐ، اور احادیث اہل بیتؑ کو یکجا دیکھتے ہیں، تو یہ دعویٰ نہ صرف ناقص بلکہ گمراہ کن نتیجے پر لے جاتا ہے۔ آئمہ معصومینؑ نے ہمیں کسی بھی مسئلے کو ٹکڑوں میں دیکھنے کے بجائے، اصول دین و فروع دین کے جامع اور عقلی و نقلی بنیادوں پر تفصیلی فہم کے ساتھ سمجھنے کی تعلیم دی ہے۔

سب سے پہلے قرآن سے آغاز کرتے ہیں۔ سورۂ نساء آیت 59 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ

یعنی "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو"۔

یہ آیت اطاعتِ اولی الامر کو اطاعتِ رسول اور اطاعتِ خدا کے ساتھ جوڑ کر واجب کرتی ہے، اور اولی الامر کی تعریف میں اہل بیتؑ اور ان کے نائبین، یعنی علماء ربانی، داخل ہیں۔

زمانہ غیبت میں جب امامؑ براہ راست موجود نہیں، تو عقل، شریعت اور احادیث کے مطابق وہ ذمے داریاں ان کے نائبین یعنی فقہاء پر عائد ہوتی ہیں۔

امام حسن عسکریؑ سے ایک روایت ہے:

فأما من كان من الفقهاء، صائنا لنفسه، حافظا لدينه، مخالفا لهواه، مطيعا لأمر مولاه، فللعوام أن يقلدوه

(وسائل الشیعہ، ج27، ص 131)

یعنی جو فقہاء اپنے نفس کے قابو میں ہوں، دین کے محافظ ہوں، اپنی خواہشات کے تابع نہ ہوں اور اللہ کے امر کے تابع ہوں، عوام کے لیے ان کی تقلید کرنا لازم ہے۔ یہ روایت واضح طور پر تقلید کے جواز ہی نہیں بلکہ لزوم پر دلالت کرتی ہے۔ زمانۂ غیبت میں امامؑ کی نمائندگی انہی صفات والے فقیہ انجام دیتے ہیں، جیسا کہ امام مہدیؑ نے توقیع میں فرمایا:

وأما الحوادث الواقعة فارجعوا فيها إلى رواة حديثنا فإنهم حجتي عليكم وأنا حجة الله

(احتجاج طبرسی، ج2، ص283)

یعنی "نئے پیش آمدہ مسائل میں ہماری حدیث کے راویوں کی طرف رجوع کرو، وہ تم پر میری حجت ہیں اور میں اللہ کی حجت ہوں۔"

اب جہاں تک اسلامی حکومت یا ولایت فقیہ کی بات ہے، تو ہمیں دیکھنا ہو گا کہ "ولایت" کا تصور آیا کہاں سے ہے؟ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

من رأى منكم سلطانًا جائرًا مستحلًا لحرم الله، ناكثًا لعهد الله، مخالفًا لسنة رسول الله... فلم يغير عليه بفعل ولا قول كان حقًّا على الله أن يدخله مدخله
(بحار الانوار، ج100، ص84)

یعنی جو شخص ظالم حاکم کو اللہ کی حرمت توڑتا دیکھے اور پھر بھی اس کے خلاف کوئی عمل یا قول نہ کرے، تو وہ بھی اس کے ساتھ عذاب میں شریک ہو گا۔

یہ حدیث اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ حکومت اگر باطل ہو تو مومنین پر لازم ہے کہ اسے بدلیں، یا کم از کم اس کے خلاف جدوجہد کریں۔ یہ "سیاست" یا "حکومت" سے کنارہ کشی نہیں بلکہ "قیام للحق" کا فریضہ ہے۔

آئمہؑ نے اگرچہ تقیہ اور حالات کی بنا پر بعض ادوار میں خود عملی حکومت قائم نہ کی، لیکن اُن کا راستہ ہمیشہ "اللہ کی حکومت" کے قیام کی طرف اشارہ کرتا رہا ہے۔ امام حسینؑ کا قیام، امام صادقؑ کی تعلیمی تحریک، امام رضاؑ کا ولی عہدی قبول کرنا all had political— implications. اگر "غیبت" کا مطلب صرف دعائے غریق پڑھنا اور گھر بیٹھ کر سیرت امام کا مطالعہ کرنا ہوتا تو نہ توقیعات کی ضرورت تھی، نہ فقہاء کو رجوع کا حکم دیا جاتا، نہ تقلید کا اصول وضع کیا جاتا، اور نہ ہی امامؑ خود خلفاءِ وقت کے سیاسی نظام سے ٹکراتے۔

روایات میں جو "تمسکوا بالأمر الأول" یا "ما أنتم علیہ حتی یأتیکم اللہ بصاحبھا" جیسے الفاظ آئے ہیں، وہ "سیرت اہل بیتؑ" کو جاری رکھنے کے لیے ہیں، نا کہ اجتہاد و تقلید یا حکومت کے انکار کے لیے۔ اگر آپ ان روایات کی بنیاد پر یہ دعویٰ کریں کہ اجتہاد یا حکومت حرام ہے، تو پھر خود آئمہؑ کے عمل کو بھی روکنا پڑے گا جو خلفاء وقت سے علمی و سیاسی محاذ پر برسرِپیکار رہے۔

آخر میں یاد رکھنا چاہیے کہ عقل، قرآن اور سنت، تینوں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کو ہر دور میں "راہِ خدا" پر قائم رہنا ہے، اور جب امام معصومؑ پردہ غیبت میں ہیں، تو دین کی تفسیر، فتاویٰ، اور قیادت کے لیے ان کے نائبین یعنی عادل اور فقیہ علماء کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔ انکارِ تقلید یا انکارِ حکومت دراصل انکارِ اہل بیتؑ کی روشنی میں سوسائٹی کو چھوڑ دینا ہے اندھیروں کے حوالے۔

پس جو لوگ ان احادیث کو بنیاد بنا کر تقلید یا حکومت کا انکار کرتے ہیں وہ دراصل فقہی اصولوں کی بے ادبی، روایات کے سیاق و سباق کی خلاف ورزی، اور آئمہؑ کی حکمتوں سے لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسے میں تعجب نہیں کہ کسی ایک روایت کو پکڑ کر پورے دین کو محدود کرنے والا شخص آخرکار فرقہ پرستی، خودساختہ فقہ، اور مسلکی تعصب کا شکار ہو جائے۔

یاد رکھیں: جو بات اہل بیتؑ نے نہیں کہی، اسے ان سے منسوب کرنا بہت بڑا افتراء ہے، اور جو بات وہ کہہ چکے ہوں، اس پر خاموش رہنا خیانت۔ اس درمیان صرف اہل علم، فقیہ، اور منصف مزاج مومن ہی راہِ حق پر قائم رہ سکتے ہیں۔

تنقید پر تنقید اور تنقید کے تعمیری طریقے

معاشروں میں ایک مستقل رجحان رہا ہے کہ کسی بھی طبقے یا گروہ کو اس کے ظاہری خدوخال، لباس، یا کسی مخصوص پہچان کی بنیاد پر ایک ہی پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔ یہ ایک خطرناک اور سطحی رویہ ہے جو نہ صرف انصاف کے اصولوں سے متصادم ہے بلکہ اس سے معاشرے کی فکری گہرائی اور تنوع کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ مولوی طبقہ اس رویے کا ایک نمایاں شکار ہے۔ کچھ افراد مذہبی علما کو صرف ان کے لباس، داڑھی، یا طرزِ گفتگو کی بنیاد پر "پسماندہ" یا "رجعت پسند" قرار دے دیتے ہیں، گویا کہ دین سے جڑے تمام افراد نہ صرف متعصب بلکہ ترقی اور جدیدیت کے دشمن ہیں۔ اس عمومی سوچ کا جائزہ لیا جائے تو یہ ایک نوع کا فکری استبداد ہے جو خود کو روشن خیالی کا لبادہ اوڑھ کر پیش کرتا ہے مگر اس کی بنیاد جہالت، تعصب، اور استعماری ذہنیت کی باقیات پر ہے۔

مولوی طبقہ کوئی یکساں، روبوٹک گروہ نہیں۔ ان میں ہدایت کے چراغ بھی ہیں اور نفس پرست گمراہ بھی۔ جیسے ہر طبقے میں اچھے اور برے افراد ہوتے ہیں، اسی طرح علما اور دینی طبقات میں بھی مختلف النوع انسان پائے جاتے ہیں۔ اسلام کا تصور انسانیت اسی تنوع کو تسلیم کرتا ہے۔ کوئی بھی انسان محض کسی گروہ سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر نیک یا بد نہیں قرار

دیا جا سکتا۔ قرآن کی نظر میں فضیلت کا معیار تقویٰ ہے، نہ کہ ظاہری لباس یا کسی خاص طبقے سے تعلق۔

اشرافیہ، سیاسی رہنما، سائنس دان، اور تاجر طبقے میں بھی دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جو اپنی دولت سے خیر کے کام کرتے ہیں، غریبوں کو سہارا دیتے ہیں، اور دوسروں کی فلاح و بہبود کو مقصدِ حیات بناتے ہیں۔ اور پھر وہ بھی ہیں جو ذخیرہ اندوزی، دھوکہ دہی اور مفاد پرستی کی بدترین مثال بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی مذہبی طبقات میں بھی وہ علما موجود ہیں جن کی زندگی سچائی، علم، قربانی، اور تقویٰ سے عبارت ہے، اور وہ بھی جنہوں نے مذہب کو دکان بنا لیا ہے۔ لیکن محض ان چند غلط عناصر کی بنیاد پر پورے طبقے پر کیچڑ اچھالنا دانشمندی نہیں بلکہ زیادتی اور علمی خیانت ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز پہلو یہ ہے کہ وہ لوگ جو علما پر سب سے زیادہ تنقید کرتے ہیں، وہ خود کسی نہ کسی شکل میں دینی اداروں، مدارس، یا مذہبی فکر سے وابستہ رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ افراد شیعہ یا سنی مدارس سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، لیکن بعد از اں خود کو روشن خیال، عقلیت پرست یا صرف سائنس و ٹیکنالوجی سے مرعوب ظاہر کرتے ہیں۔ اس نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایک گہرا احساسِ کمتری اور ردعمل پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل مذہبی طبقے کے اندر کی خامیوں کو دیکھ کر اس حد تک رنجیدہ ہوتے ہیں کہ مذہب اور اس کی نمائندگی کرنے والے ہر فرد سے نالاں ہو جاتے ہیں۔ یہ رویہ ان کے اندر شدید داخلی خلفشار کو جنم دیتا ہے، جس کا اظہار وہ مذہبی طبقات پر غصے، طنز اور تمسخر

کے ذریعے کرتے ہیں۔ یہ رویہ محض علمی اختلاف نہیں بلکہ ذاتی اور جذباتی نوعیت رکھتا ہے، جسے وہ عقل اور ترقی پسندی کے نام پر جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان لوگوں کو جب کبھی صہیونی استعمار، مغربی میڈیا کے فکری حملے، یا اسلام دشمن بیانیے پر بات کرنے کو کہا جائے تو وہ یا تو خاموش ہو جاتے ہیں یا موضوع کو بدل دیتے ہیں۔ انہیں اسلامی تہذیب کی علمی میراث، قرآنی فکر، اور مسلم مفکرین کے کارناموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کی نگاہ صرف مغرب کے فلسفوں، سائنسی کامیابیوں، اور تہذیبی رجحانات پر ہے، جنہیں وہ حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ گویا مسلمان اگر ترقی کرے تو صرف مغرب کی پیروی سے، اور اگر دین کی روشنی میں آگے بڑھے تو وہ انہیں گوارا نہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ترقی صرف مادی پیمانوں سے ناپی جائے گی؟ کیا روحانی، اخلاقی، اور فکری ترقی کی کوئی اہمیت نہیں؟

بدقسمتی سے یہ طبقہ معاشرے میں فکری انتشار پیدا کرنے کا سبب بن رہا ہے۔ یہ نہ صرف خود تشکیک کا شکار ہیں بلکہ دوسروں کو بھی شک اور بے یقینی کی راہوں پر ڈالنے میں سرگرم ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہے جیسے وہ خود کو عقل و شعور کا محور سمجھتے ہوں اور باقی سب کو جاہل۔ حالانکہ وہ بھی ایک خاص فکری سانچے، تعصب، اور سابقہ ذاتی تجربات کے اسیر ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انصاف اور حقیقت پسندی کو اپنائیں۔ مولوی ہو یا سائنس دان، سرمایہ دار ہو یا فقیر، ہر انسان کو اس کے کردار، علم، اور نیت سے پرکھا جائے، نہ کہ

لباس، قوم، یا نظریاتی شناخت سے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے خود اپنے اندر یہ فکری پختگی پیدا کرنی ہے کہ وہ کسی بھی طبقے کو تعمیم کے ساتھ نہ دیکھیں، نہ ہی مغرب یا استعماری نظریات سے مرعوب ہو کر اپنی تہذیب کو کمتر سمجھیں۔ مسلمانوں کی پسماندگی کی وجہ دین نہیں، دین سے دوری ہے۔ اور یہ فرق تب ہی سمجھ آسکتا ہے جب ہم تنقید برائے اصلاح کریں، نہ کہ تنقید برائے توہین۔

صرف برائی کا راگ الاپنا، تنقید کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا، اور ہر چیز میں منفی پہلو تلاش کرنا نہ تو کوئی علمی رویہ ہے اور نہ اصلاحی۔ ایسے افراد جو مذہبی طبقے کی خرابیوں کو بنیاد بنا کر پوری امت پر مایوسی طاری کر دیتے ہیں، وہ خود بھی کسی حل کا حصہ نہیں ہوتے بلکہ ایک مستقل الجھن، اضطراب، اور فکری انتشار کو پھیلاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان مغرب کی ظاہر پرستی کو مثالی سمجھیں، ان کے ماڈلز، قوانین، اور اقدار کو حرفِ آخر مانیں، گویا مغرب کا ہر مسئلہ کا حل ہی عین ترقی ہے — اور یہی وہ نفسیاتی شکست ہے جو مسلمانوں کی فکری خودمختاری کو چاٹ گئی ہے۔

اسلام، اگرچہ دینِ فطرت ہے، مگر اس کی روح میں اعتدال، توازن، اور اصلاح کا عمل موجود ہے۔ قرآن اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ تنقید ضرور ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اصلاح، تعمیر، اور امید کا پہلو غالب ہے۔ صحابہ کرامؓ، تابعین، اور بعد ازاں مسلم مفکرین نے ہمیشہ "اندر" رہ کر اصلاح کی — نظام سے ٹکرائے بغیر، اسے مکمل رد کیے بغیر، بلکہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں اس کی اصلاح کی۔

یہی inhouse اپروچ تھی جس نے امت کو بارہا اندھیروں سے نکالا، چاہے وہ فکری جمود ہو یا سیاسی انتشار۔

آج کا دانشور طبقہ اگر واقعتاً امت کی اصلاح چاہتا ہے تو اُسے خود اسلام کے اندر رہ کر، اس کے اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے، اور اس کے مزاج کے مطابق تعمیری کردار ادا کرنا ہوگا۔ یہ رویہ نہ صرف فکری توازن فراہم کرے گا بلکہ نئی نسل میں اعتماد، مقصد اور امید کی روح بھی پھونکے گا۔ اصلاح کا مطلب کسی نظام کو جڑ سے اکھاڑ دینا نہیں، بلکہ اس میں موجود خامیوں کی نشاندہی کرکے بہتری کے لیے عملی قدم اٹھانا ہے — اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو "خود" کو اس نظام کا حصہ سمجھتا ہو، نہ کہ اس سے لاتعلق یا دشمن۔

آج ہمیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو تنقید کے ساتھ تحسین بھی کریں، جو مسئلے کے ساتھ حل بھی دیں، جو برائی کے ساتھ خیر کا پہلو بھی اجاگر کریں، اور جو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں معاشرے کی اصلاح کے لیے فکری، اخلاقی، اور عملی میدان میں متحرک ہوں۔ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا علاج مغربی نظریات کی پیروی نہیں، بلکہ اسلامی اصولوں کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق زندہ کرکے ایک متوازن ماڈل دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اور یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اسلام کے اندر رہ کر، خلوص نیت کے ساتھ، مثبت اور تعمیری انداز اپناتے ہیں — نہ کہ صرف تنقید برائے تنقید کرتے رہیں اور آخر کار دوسروں کے ایجنڈے کے ترجمان بن جائیں۔

پس، ہمیں اس فکری و عملی جدوجہد کا آغاز خود سے کرنا ہو گا۔ ہمیں خود فیصلہ کرنا ہو گا کہ ہم تماشائی بن کر دوسروں کی غلطیوں کو گنتے رہیں گے، یا خود میدان میں آکر ان کے ازالے کے لیے کردار ادا کریں گے۔ یہی شعور، یہی بیداری، اور یہی inhouse اصلاحی طرزِ فکر ہماری کامیابی کی بنیاد بن سکتی ہے۔

توحید و شرک کیا ہے؟!

توحید نظری اور توحید عملی دو ایسے پہلو ہیں جو اللہ کی وحدانیت کے تصور کو ایک جامع اور متوازن صورت میں سمجھنے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اسلامی عقائد میں توحید محض ایک زبانی اقرار یا فلسفیانہ نظریہ نہیں بلکہ ایک ایسا زندہ اور جاری نظامِ حیات ہے جو انسان کی سوچ، رویے، عمل، سیاست، معیشت، عدل، اخلاق اور روحانیت سب پر محیط ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب توحید صرف نظریات کی سطح تک محدود کر دی جائے اور اس کے عملی تقاضے ترک کر دیے جائیں تو دین کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، اور اگر توحید کو عمل میں لایا جائے مگر اس کی معرفت و فہم نہ ہو تو وہ عمل بے روح اور رسمی بن جاتا ہے۔

توحید نظری اس عقیدہ کا نام ہے کہ اللہ واحد ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، وہی خالق، رازق، مالک، مدبر اور حاکم مطلق ہے۔ اس عقیدہ میں اللہ کی ذات و صفات کو یکتا سمجھا جاتا ہے، اور انسان کسی مخلوق کو نہ عبادت میں، نہ ربوبیت میں، نہ حاکمیت میں، اور نہ تصرف کائنات میں شریک سمجھتا ہے۔ توحید نظری کا اظہار کلمۂ "لا إلٰہ إلا اللہ" میں ہوتا ہے، اور یہ انبیاء کا بنیادی پیغام رہا ہے۔

لیکن اگر یہی توحید صرف زبان تک محدود ہو جائے اور عملی زندگی میں اس کا اثر نظر نہ آئے تو یہ ایک ادھوری توحید رہ جاتی ہے۔ توحید عملی اس نظری توحید کو زندگی میں نافذ کرنے کا

نام ہے۔ یعنی جب انسان اللہ کو حاکمِ مطلق مانتا ہے تو وہ اس کی شریعت کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرنے کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ جب وہ اللہ کو رزق دینے والا مانتا ہے تو حرام ذرائع سے رزق کی تلاش نہیں کرتا۔ جب وہ اللہ کو عادل مانتا ہے تو خود بھی عدل و انصاف کا دامن تھامتا ہے۔ جب وہ اللہ کی بندگی کا قائل ہوتا ہے تو کسی غیر کی اطاعت میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ یہ ہے توحید عملی۔

اسی لیے اہل تشیع کا تصورِ توحید ایک متوازن و جامع تصور ہے، جو توحید نظری اور توحید عملی دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتا ہے۔ شیعہ مکتب میں نہ صرف اللہ کی وحدانیت پر عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے بلکہ اس ایمان کو عملی زندگی میں نافذ کرنا بھی واجب سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تشیع کے ہاں عقیدۂ توحید صرف فلسفۂ وجود یا علمِ کلام کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک زندہ، حرکی اور معاشرتی حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام علیؑ کے نہج البلاغہ میں توحید کی گفتگو جہاں دقیق فلسفیانہ سطح پر ہوتی ہے، وہاں ساتھ ہی ساتھ ان کے سیاسی و سماجی خطبات میں بھی توحید کی عملی تعبیرات موجود ہیں، جیسے ظلم کے خلاف قیام، عدلِ اجتماعی کی تاکید، اور طاغوتی قوتوں کی نفی۔

بالمقابل سلفی و وہابی مکتب فکر توحید کو محض نظریاتی بحثوں اور لفظی اصطلاحات تک محدود کر دیتا ہے۔ ان کے ہاں توحید کا مطلب ہے صرف شرکِ جلی یعنی بت پرستی سے بچنا، یا قبروں پر سجدہ نہ کرنا، یا نبی و ولی سے توسل کو ممنوع قرار دینا۔ ان کے نزدیک توحید بس چند ظاہری اعمال کی نفی کا نام ہے۔ چنانچہ وہ اللہ کی وحدانیت کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن

جب عمل کی باری آتی ہے تو انہی لوگوں کو استعمار کی گود میں بیٹھا پایا جاتا ہے، وہ امریکہ و اسرائیل سے مدد لیتے ہیں، ان کے مفادات کی حفاظت کے لیے فتوے جاری کرتے ہیں، اور عدل و انصاف کی بجائے طاقتور کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ شرک کو صرف مندر، قبر یا دعا سے توسل میں دیکھتے ہیں، مگر جب ایک کافر و طاغوتی طاقت کو ولی و مددگار بنا کر اس سے استعانت کی جاتی ہے تو اسے شرک نہیں مانتے۔

اسی فرق کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک شخص اللہ کی وحدانیت کا قائل ہے مگر ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا، تو وہ توحید کا صرف زبانی دعویدار ہے۔ جبکہ دوسرا شخص اللہ کو واحد حاکم سمجھتا ہے اور اسی بنیاد پر ظلم کے خلاف قیام کرتا ہے، جیسے حسینؑ ابن علی نے یزید کے باطل نظام کے خلاف قیام کیا۔ یہی قیام توحید عملی کی روشن ترین مثال ہے۔

قرآن نے بارہا صرف ایمان لانے والوں کی نہیں بلکہ "الذین آمنوا و عملوا الصلحات" کی بات کی ہے، یعنی ایمان کے ساتھ عمل صالح کو لازم قرار دیا ہے۔ سورہ یوسف میں حضرت یوسفؑ فرماتے ہیں کہ "إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ"، یعنی "حکم و قانون کا اختیار صرف اللہ کو ہے"۔ یہی توحید عملی کا منشور ہے۔ جب حاکمیتِ مطلقہ اللہ کے لیے مانی جائے تو کسی انسان یا گروہ کی خود ساختہ شریعت یا طاغوتی نظام کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اسی تصور کو تشیع نے اپنے ایمہ کے ذریعے واضح طور پر پیش کیا۔ امام علیؑ کی خلافت کے دوران عدل، مساوات، بیت المال کی شفاف تقسیم، اور طاغوت سے برسرپیکار رہنے کی روش، عملی توحید کی جھلک ہے۔

توحید نظری ایک درخت کی جڑوں کی مانند ہے، اور توحید عملی اس کی شاخوں، پتیوں، پھولوں اور پھلوں کی مانند ہے۔ اگر صرف جڑ ہو اور درخت نہ اُگے، تو نہ سایہ ملتا ہے، نہ پھل۔ اسی طرح اگر صرف عمل ہو مگر بنیاد میں صحیح عقیدہ نہ ہو، تو وہ ناپائیدار اور ضعیف درخت کی مانند ہے۔ اسلام ایک ایسا مکمل نظام حیات ہے جو نظریہ اور عمل کے امتزاج سے قائم ہوتا ہے، اور حقیقی توحید اسی امتزاج کا نام ہے۔

خلاصہ یہ کہ اہل تشیع کا تصور توحید نظریاتی سطح پر نہایت عمیق اور فلسفیانہ ہے، جیسا کہ صدرا، خواجہ نصیر، علامہ طباطبائی اور امام خمینیؒ کے افکار میں نظر آتا ہے، اور عملی سطح پر بھی مظلومین کی حمایت، عدل کے قیام، استعمار کی مخالفت، اور دین کے لیے جان و مال قربان کرنے کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ جبکہ سلفی یا وہابی فکر محض ظاہری شرک کی نفی پر مرکوز ہے، مگر استعمار کے ساتھ دوستی، ظلم پر خاموشی، اور معاشرتی عدل کے انکار نے ان کی توحید کو صرف لفظوں کا ایک خول بنا دیا ہے۔

اسلام کی توحید نہ لفظی ہے، نہ خاموش، بلکہ وہ ایک زندہ، متحرک، اور سماجی عدل پر مبنی حقیقت ہے، جس کا مقصد انسان کو ہر غیر کے بندگی سے نکال کر صرف اللہ کی بندگی میں داخل کرنا ہے، قولاً بھی اور عملاً بھی۔

جب ہم توحید کے مفہوم کو اس کی گہرائی سے سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں یہ جاننا ضروری ہوتا ہے کہ توحید کا مطلب صرف یہ نہیں کہ اللہ کو خالق مانا جائے یا یہ کہ زبان سے "لا إله إلا

اللہ" کا اقرار کیا جائے، بلکہ حقیقی توحید یہ ہے کہ انسان اپنے تمام امور میں، خواہ وہ روحانی ہوں یا مادی، خدا ہی کو حاکم، مرجع اور فیصلہ ساز سمجھے۔ اسی لیے توحید کی عملی صورت اس وقت واضح ہوتی ہے جب انسان مشکل حالات، جہادی آزمائشوں، اضطراب، خوف، یا ہدایت کی طلب میں اپنے طور پر نہیں بلکہ خدا کے بتائے ہوئے ذرائع سے رجوع کرے۔

قرآن مجید کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ساتھ رابطے کے لیے انبیاء، اولیاء اور آئمہ کو وسیلہ بنایا ہے۔ ان کی بعثت محض ایک رسمی یا اختیاری امر نہیں بلکہ یہ خدا کا مقرر کردہ نظامِ ہدایت ہے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں بنی اسرائیل خدا سے براہ راست بات نہیں کر سکتے تھے، بلکہ انہیں موسیٰؑ کے ذریعے ہی احکام ملتے، اور جب بھی کوئی آفت یا قحط آتا تو وہ موسیٰؑ سے درخواست کرتے کہ وہ خدا سے دعا کریں۔ یہی حال حضرت عیسیٰؑ، حضرت نوحؑ اور دیگر انبیاء کا تھا۔ اسی منہج پر خدا نے امت محمدیہؐ کے لیے بھی ایک خاص سلسلہ قائم کیا—وہ سلسلہ جسے قرآن نے "اولی الأمر"، "الراسخون فی العلم"، "الذین آمنوا وعملوا الصالحات" اور "الذین یقاتلون فی سبیل اللہ" جیسے عنوانات سے بیان کیا ہے۔

یہ اللہ کا اپنا منصوبہ ہے کہ وہ انسان کو براہ راست آسمان سے ہدایت دینے کے بجائے، انسانوں میں سے چنیدہ اور معصوم ہستیوں کو اپنا نمائندہ بناتا ہے۔ تو جب خدا خود کسی کو اپنا ولی، امام، خلیفہ یا حجت قرار دیتا ہے، تو اس کے ذریعے رابطہ رکھنا دراصل خود خدا سے رابطہ ہے۔ یہ رابطہ ایک ایسا نظامِ توسل ہے جو خدا نے اپنی حکمت سے خود مقرر کیا ہے، اور اس

سے رجوع کرنا ایمان، توحید اور عبودیت کی علامت ہے۔ قرآن میں اللہ نے نبی اکرمؐ سے فرمایا: ولو أنهم إذ ظلموا أنفسهم جاؤوک فاستغفروا الله واستغفر لهم الرسول لوجدوا الله توابا رحیما۔ اس آیت میں "جاؤوک" یعنی "وہ تمہارے پاس آئیں" کی تعبیر دراصل توسل کے اس تصور کو بیان کرتی ہے جس میں بندہ، نبیؐ اور پھر خدا سے مغفرت کی امید رکھتا ہے۔

توحید کی عملی روح اسی وقت محفوظ رہتی ہے جب انسان خدا کی نامزد کردہ ہستیوں سے رجوع کرے اور ان سے توسل کو عین اطاعت الٰہی سمجھے، نہ کہ خدا کے بالمقابل کوئی خود ساختہ نظام یا شخصیت تراشے۔ جب انسان کسی ایسے ولی، رہبر یا امام سے تعلق جوڑتا ہے جسے خدا نے نامزد نہیں کیا، بلکہ جو کسی سیاسی، جغرافیائی یا جذباتی وابستگی کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہو، تو وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر توحید کی عملی بنیادوں سے ہٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان، خدا کی بجائے اپنی خواہشات، مفادات یا روایات کی پیروی کرتا ہے، اور یہی درحقیقت شرکِ خفی کی ایک شکل ہے۔

توحید کا عملی مظہر یہ ہے کہ بندہ صرف اسی راستے سے خدا سے قرب چاہے جسے خدا نے متعین کیا ہے۔ جیسے کعبہ کے علاوہ کسی اور سمت کو قبلہ بنانا عملًا خدا کی ہدایت سے انحراف ہے، اسی طرح خدا کے منتخب کردہ وسیلوں کو چھوڑ کر کسی دوسرے وسیلے سے ہدایت، مغفرت یا مدد چاہنا بھی توحید سے انحراف ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خدا نے اولیاء کے توسط سے ہی اپنی مدد بھیجنے کا وعدہ کیا ہے، جیسے بدر میں ملائکہ کی مدد یا کربلا میں امام حسینؑ کی نصرت کو خدا کی راہ میں ایک نمونہ بنا دینا۔

توحید کا سچا اور عملی معنی یہ ہے کہ انسان، خواہ عبادت میں ہو یا ہدایت کے طلب گار، چاہے وہ استغاثہ کر رہا ہو یا جہاد میں مشکل کا سامنا، وہ ان دروازوں سے رجوع کرے جو خدا نے کھولے ہیں، نہ کہ وہ دروازے جو خود انسان نے تراش لیے ہوں۔ اس سے انکار کرنا دراصل توحید کی روح کا انکار ہے، اور ان سے انکار کرنا دراصل خدا کی حاکمیت، منصوبہ بندی اور حکمت کے انکار کے مترادف ہے۔

یہی توحید کی عملی معراج ہے کہ انسان اپنی خواہش، خوف، جہالت یا تعصب کو چھوڑ کر خدا کے نظام سے ہم آہنگ ہو جائے، اور خدا کے بتائے ہوئے وسیلوں کے ذریعے خود کو خدا سے جوڑ لے۔ یہی سچی بندگی، یہی اطاعت، یہی اسلام، اور یہی توحید ہے۔

توحید کے عملی ہونے میں کئی گہری اور پیچیدہ ممانعتیں ہوتی ہیں جو انسان کے باطن، معاشرت، تاریخ اور اجتماعی نفسیات سے جڑی ہوتی ہیں۔ سب سے پہلی رکاوٹ خود انسان کی نفسی ساخت اور اس کا اندرونی خوف ہے۔ انسان اپنی ذات، مفادات، تعلقات اور روایتوں سے ایسا جُڑ جاتا ہے کہ وہ توحید کے ان عملی تقاضوں کو اپنانے سے کتراتا ہے جن میں قربانی، سچائی اور عدل کی آزمائش آتی ہے۔ عملی توحید کا مطلب ہے ہر باطل طاقت کے سامنے "لا" کہنا، ہر ناحق کے خلاف کھڑے ہونا، ہر ظلم کی مذمت کرنا — مگر یہ سب کہنا یا کرنا آسان نہیں۔ انسان اپنی عزت، آرام، مفاد، خاندان، برادری یا اپنی چھوٹی سی حیثیت کے لیے جھوٹ کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتا ہے، مگر اللہ کی حاکمیت کا عملی اقرار نہیں کرتا۔ یہ نفسیاتی خوف اور سہولت پسندی سب سے پہلی رکاوٹ ہے۔

تاریخی طور پر بھی توحید کو صرف زبانی دعوے کی سطح پر محدود رکھنے کی روش غالب رہی ہے۔ جب معاشروں میں بادشاہت، قبائلی نظام، طبقاتی اقتدار یا مذہبی اجارہ داری قائم ہو جائے تو وہ ہر اس نظریے سے خائف ہو جاتے ہیں جو ان کی بالادستی کو چیلنج کرے۔ توحید عملی کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ بندہ صرف اللہ کو حاکمِ مطلق مانے، اور کسی انسانی قوت کو قانون سازی، عدالت یا بندگی میں خود مختار نہ سمجھے۔ لیکن جب بادشاہوں، حکمرانوں یا حتیٰ کہ بعض مذہبی طبقات نے اپنی بالادستی کو محفوظ رکھنے کے لیے دین کو ایک محدود رسمی دائرے تک محدود کر دیا، تو توحید کے انقلابی پہلو کو چھپا لیا گیا۔ تاریخ نے ایسے بے شمار نمونے دیکھے ہیں جب حاکم وقت نے "لا اِلٰہ اِلا اللہ" کا نعرہ لگایا مگر اللہ کی حاکمیت کو اپنی کرسی کے تابع کر دیا۔

ایک اور بڑی رکاوٹ فکری تعصب ہے۔ جب انسان کسی مخصوص فکر، مسلک، قبیلے یا لیڈر سے اس قدر جُڑ جائے کہ وہ ہر حق بات کو صرف اس لیے رد کر دے کہ وہ اس کے حلقے سے باہر سے آ رہی ہے، تو وہ لاشعوری طور پر توحید کے راستے میں دیوار بن جاتا ہے۔ توحید عملی کا تقاضا ہے کہ انسان حق کو قبول کرے چاہے وہ کسی غیر سے آ رہا ہو، مگر تعصب، ہٹ دھرمی اور ذہنی جمود انسان کو اس پر آمادہ نہیں ہونے دیتے۔ جو قومیں یا افراد پہلے سے قائم مفروضات، مسلکی انا اور برادری کے دباؤ کے قیدی بن جائیں، وہ اگرچہ توحید کا نام لیتے ہیں، مگر عملاً شرکِ خفی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کی بجائے اپنے تعصبات کو معیارِ حق بناتے ہیں۔

ایک اہم رکاوٹ یہ بھی ہے کہ توحید کے زندہ اور روشن کردار ہمارے سماجوں میں یا تو موجود نہیں، یا پھر دبائے گئے ہیں۔ جب افراد کو ایسے رول ماڈلز نظر نہیں آتے جو صرف اللہ کے لیے زندگیاں وقف کرتے ہوں، جو ظلم کے سامنے کھڑے ہوں، جو حق کی قیمت چکائیں، جو عملاً یہ دکھائیں کہ "لا اِلٰہ اِلا اللہ" کا مطلب صرف زبان کا اقرار نہیں بلکہ پوری حیات کا اللہ کے سپرد کرنا ہے، تو ایسی صورت میں توحید ایک جامد تصور بن جاتی ہے۔ جب کربلا جیسے واقعات کو محض تاریخی ماتم یا مذہبی رسم تک محدود کر دیا جائے، اور ان کی عملی پیروی کے لیے ماحول، تربیت اور حوصلہ نہ ہو، تو امت نظری توحید کی قائل رہتی ہے مگر عملی توحید سے دور ہو جاتی ہے۔

معاشی اور سیاسی دباؤ بھی توحید کے عملی نفاذ کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ جب کوئی فرد یا معاشرہ استعماری نظاموں کا محتاج ہو، جب رزق کا دروازہ ظالم طاقتوں سے وابستہ کر دیا جائے، جب فکری آزادی کو دبایا جائے، جب صداقت بولنے کی قیمت جان و مال ہو، تو ایسے ماحول میں صرف وہی لوگ توحید کو عملاً اپنا پاتے ہیں جو نہایت اعلیٰ درجے کی بصیرت، ہمت اور یقین رکھتے ہوں۔ اکثریت خاموش ہو جاتی ہے، اور توحید محض مسجد کی دیواروں میں بند ہو جاتی ہے۔

یہ تمام رکاوٹیں —نفسیاتی، تاریخی، تعصبی، تربیتی اور معاشی— اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ توحید ایک زندہ اور انقلابی حقیقت ہے جس کے نفاذ میں ہر وہ چیز مزاحم ہے جو انسان کو سہولت، طاقت، روایت یا خوف کے خول میں بند کر دے۔ حقیقی توحید اسی وقت زندہ ہو

سکتی ہے جب انسان خود سے، اپنے تعصبات سے، اور دنیا کی دھونس سے آزاد ہو کر صرف اللہ کو حاکم، مالک اور معبود ماننے پر راضی ہو — نہ صرف زبان سے، بلکہ عمل سے بھی۔

جدید غلامی اور اس سے نجات

دنیا نے غلامی کے طریقے بدل دیے ہیں۔ اب نہ بازار میں انسانوں کی نیلامی ہوتی ہے، نہ پیروں میں بیڑیاں، نہ گردنوں میں زنجیریں، نہ کوڑوں کی صدائیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ غلامی ختم ہو گئی ہے۔ وہ صرف شکل بدل گئی ہے، روح وہی ہے۔ پہلے جسم کو قید کیا جاتا تھا، اب ذہن کو۔ پہلے انسانوں کو رسیوں سے باندھا جاتا تھا، اب معاہدوں، قرضوں، تنخواہوں اور بلوں سے باندھا جاتا ہے۔ پہلے طاقتور افراد غلام بناتے تھے، آج پورے نظام، ادارے، معیشتیں اور کارپوریٹ سلطنتیں غلام بناتی ہیں۔

اس جدید غلامی میں سب سے پہلے انسان کو آزادی کا فریب دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تم آزاد ہو، تم جو چاہو بن سکتے ہو، جو چاہو پہن سکتے ہو، جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ مگر درحقیقت تمہارے ہر قدم پر قیمت رکھی جاتی ہے۔ تمہاری تعلیم، صحت، رہائش، روزگار، یہاں تک کہ تمہارے خواب بھی ایک مارکیٹ کا حصہ بن چکے ہیں۔ بچہ اسکول میں داخل ہوتا ہے تو قرض کی زنجیر پہنتا ہے، جوانی میں نوکری کرتا ہے تو تنخواہ کی بیڑی باندھتا ہے، اور بوڑھا ہو کر پنشن کے آسروں میں نفسِ آخری لیتا ہے۔ ہر قدم پر آزادی کا نام لیکر ایک نئی قید دی جاتی ہے۔ تمہیں بس اتنا دیا جاتا ہے کہ تم زندہ رہو، کام کرتے رہو، اور یہ سمجھتے رہو کہ تم

آزاد ہو۔ مگر کبھی اتنا نہیں دیا جاتا کہ تم سوال اٹھا سکو، خود مختار ہو سکو، یا اپنی زندگی کے فیصلے خود لے سکو۔

یہ جدید غلامی صرف غریب ملکوں میں نہیں، امیر ریاستوں میں بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں زنجیر زیادہ نرم، خوبصورت اور آرام دہ ہے۔ وہاں انسان ایک خوشنما جیل میں رہتا ہے۔ اس کے پاس گاڑی، فون، نیٹ، چھٹی، کافی شاپ، اور برانڈڈ لباس سب کچھ ہوتا ہے، مگر وہ ہر مہینے اپنے بل، قسط، ٹیکس، ریٹ، اور انشورنس کے بوجھ کے نیچے دبا ہوتا ہے۔ وہ روز کام پر جاتا ہے جیسے پہلے غلام روز مالک کی کھیتی پر جاتا تھا۔ اب صرف بیگار کو جاب، اور آقا کو باس کہا جاتا ہے۔ یہ غلامی تمہارے خوابوں، وقت، صلاحیت، تخلیق اور روح کو آہستہ آہستہ کھاتی ہے۔

اس نظام کی سب سے بڑی چال یہ ہے کہ یہ غلامی کو خود غلاموں کی نظر سے چھپا دیتا ہے۔ انسان اگر لوہے کی زنجیر میں ہو تو تڑپتا ہے، چیختا ہے، مگر جب وہ خود ہی اس زنجیر کو کامیابی، ترقی، اور سیلف-برینڈنگ کا نام دے، تو وہ تاحیات اسی میں جکڑا رہتا ہے۔ اس جدید نظام نے قناعت کو ناکامی، سادگی کو جہالت، روحانیت کو سستی، اور توکل کو بے عملی بنا کر پیش کیا۔ یہاں ہر چیز کی قیمت ہے، یہاں تک کہ وقت، سکون، تعلق، خواب اور محبت بھی "مارکیٹ ویلیو" سے ناپی جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی روح سے بیگانہ ہو جاتا ہے، اور اس کی زندگی کا ہدف صرف "کمانا" رہ جاتا ہے، "جینا" نہیں۔

یہ نظام چاہتا ہے کہ تم پڑھو، محنت کرو، کماؤ، خرچ کرو، ٹیکس دو، اور پھر مر جاؤ، بغیر اس کے کہ تم نے کبھی سوچا ہو کہ تم کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ اور کس کے بندے تھے؟ دنیا کا یہ مادی نظام خود کو اتنا ناقابلِ سوال بنا دیتا ہے کہ غلام اپنے مالک کی زنجیر کو ہی زیور سمجھنے لگتا ہے۔ میڈیا، اشتہار، تعلیم، انٹرنیٹ، اور کلچر اس غلامی کے محافظ ہیں۔ وہ تمہیں سکھاتے ہیں کہ تمہاری عزت برانڈ سے ہے، تمہاری پہچان جاب سے ہے، تمہارا وقار تمہاری تنخواہ سے ہے، تمہاری اہمیت تمہارے گھر اور گاڑی سے ہے۔ مگر تمہاری اصل پہچان وہ تھی جو تمہاری روح میں چھپی تھی، جو فطرتِ الٰہی سے جڑی ہوئی تھی، جو خدا سے محبت، سچائی، اخلاص، ایثار، اور آزادی کے جذبے سے بنی تھی۔

اب وقت آ گیا ہے کہ اس مصنوعی آزادی کو پہچانا جائے، اور اس خوشنما غلامی کے جال کو چاک کیا جائے۔ اس کا علاج صرف شعور اور معرفت ہے۔ وہی معرفت جو انسان کو اپنے خالق، اپنی روح، اپنی حقیقت اور اپنے مقصدِ تخلیق سے جوڑتی ہے۔ وہی شعور جو یہ بتاتا ہے کہ اصل آزادی، نہ تنخواہ میں ہے نہ پراپرٹی میں، بلکہ دل کے اطمینان میں ہے، ضمیر کی سلامتی میں ہے، اور اس احساس میں ہے کہ میں کسی انسان کا نہیں، صرف خدا کا بندہ ہوں۔

پس اگر انسان اس جدید غلامی سے نکلنا چاہتا ہے تو اسے مادہ پرستی کے خدا سے بغاوت کرنا ہو گی، اور روحانیت کے رب سے وفاداری کرنی ہو گی۔ اسے اپنا وقت، محنت، علم، خواب اور محبت ان کاموں میں لگانی ہو گی جو اسے حقیقی آزادی، بیداری، اور روح کی نجات کی طرف

لے جائیں۔ کیونکہ آزاد وہی ہے جو خود کو پہچان چکا ہو، اور غلام وہی ہے جو دوسروں کے پیمانوں پر اپنی زندگی کو ناپتا رہے، چاہے اس کے ہاتھ میں سونے کی زنجیر ہی کیوں نہ ہو۔

چاپلوسی اور کینہ گری ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے

چاپلوسی اور کینہ پروری دو ایسی نفسیاتی صفات ہیں جو بظاہر الگ الگ دکھائی دیتی ہیں، لیکن گہرائی سے مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت کے دو رخ ہو سکتے ہیں۔ ایک چاپلوس انسان بظاہر نرم گفتار، خوشامدانہ رویہ اور دوسروں کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے، مگر اس کے پیچھے چھپی حقیقت اکثر بہت تلخ ہوتی ہے۔ وہ جس انداز سے دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جھوٹی تعریفیں کرتا ہے، اسی شدت سے وہ ان لوگوں سے نفرت بھی رکھتا ہے جو اس کی خوشامد سے متاثر نہ ہوں یا جو اس کے مفادات کی راہ میں رکاوٹ بنیں۔ اس طرح وہ اپنے اندر ایک زہریلا کینہ پالتا ہے جو کبھی براہ راست ظاہر نہیں ہوتا، لیکن وقت آنے پر اس کا اثر دکھاتا ہے۔

چاپلوسی کی جڑیں دراصل کمزوری، عدمِ خود اعتمادی اور دنیا پرستی میں پیوست ہوتی ہیں۔ چاپلوس شخص دوسروں کے سامنے اپنی اصلیت چھپانے کے لیے جھوٹی تعریفوں اور بناوٹ کا سہارا لیتا ہے، تاکہ وہ اُن کا اعتماد حاصل کر سکے یا ان سے کوئی ذاتی فائدہ اٹھا سکے۔ مگر چونکہ یہ سارا عمل نفاق پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے دل کی گہرائیوں میں ایک اضطراب اور حسد پلتا رہتا ہے۔ جب کوئی دوسرا شخص اُس کی سازشوں یا خوشامد سے متاثر نہ ہو، یا اُسے نظر انداز

کر دے، تو وہ چاپلوس شخص کے دل میں ایک خاموش آگ بھڑک اٹھتی ہے جو کینہ، بغض اور حسد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

اس طرح چاپلوسی اور کینہ دراصل ایک ہی باطن کی دو علامتیں بن جاتی ہیں۔ چاپلوسی ایک ظاہری چہرہ ہے جو سماج یا کسی شخصیت کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، جبکہ کینہ وہ پوشیدہ چہرہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوتا ہے۔ دونوں کا تعلق ریاکاری، دنیا پرستی اور اخلاقی پستی سے ہے۔ ایسا شخص کبھی خالص محبت یا خلوص کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمیشہ اپنے مفادات کے لیے تعلقات قائم کرتا ہے۔ جب مفادات حاصل نہ ہوں، تو یہی تعلقات بغض و عناد میں بدل جاتے ہیں۔

قرآن و احادیث میں بھی منافقین کی یہی صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ زبان سے کچھ اور ہوتے ہیں اور دل سے کچھ اور۔ وہ جب اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں، مگر جب اپنے شیطانوں کے پاس جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو محض مذاق کر رہے تھے۔ یہ دوغلاپن اصل میں چاپلوسی اور کینہ پروری کی جڑ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک شخص اگر مسلسل جھوٹے لب و لہجہ کے ساتھ تعریفیں کرتا رہے تو اس کا دل خلوص اور سچائی سے خالی ہو جاتا ہے، اور وہ دوسروں کی عزت و کامیابی سے چڑنے لگتا ہے۔ یہ چِڑ اور حسد ہی بعد میں کینہ بن جاتی ہے۔

ایک مخلص انسان نہ کسی کی جھوٹی تعریف کرتا ہے اور نہ ہی دل میں کسی کے خلاف زہر پالتا ہے۔ وہ سچائی اور اصولوں پر قائم رہتا ہے، چاہے اس کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن چاپلوس شخص وقتی فائدہ کے لیے اپنے ضمیر کو بیچ دیتا ہے، اور جب فائدہ نہ ملے تو وہی شخص دشمنی کا روپ دھار لیتا ہے۔ اس لیے معاشرتی اور دینی سطح پر ان دونوں صفات کو نہایت خطرناک سمجھا گیا ہے، اور ان سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔

الغرض کہ چاپلوسی اور کینہ گری ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ایک ہی بیمار دل کی علامتیں ہیں۔ جس دل میں صداقت، خلوص اور خوفِ خدا ہو، وہ نہ چاپلوسی کرتا ہے اور نہ ہی دل میں کینہ پالتا ہے۔ جبکہ جس دل میں مفاد پرستی، دنیا کی محبت اور ریاکاری ہو، وہ بیک وقت خوشامد بھی کرتا ہے اور دل میں حسد اور بغض بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا ایک باضمیر انسان کو ان دونوں اخلاقی بیماریوں سے بچنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف خود کو پاک رکھ سکے بلکہ دوسروں کے لیے بھی رحمت اور بھلائی کا سبب بنے۔

ایسے اشخاص کے شر سے بچنے کے لیے سب سے پہلا قدم باطنی بصیرت کو بیدار کرنا ہے تاکہ انسان خوشامدانہ باتوں کے پیچھے چھپی حقیقت کو پہچان سکے۔ یہ لوگ بظاہر انتہائی مہذب، نرم گو اور ہمدرد دکھائی دیتے ہیں، مگر ان کی باتوں میں مصنوعی چاشنی ہوتی ہے اور رویوں میں ایک خاص بناوٹ نظر آتی ہے۔ ان کی باتوں سے فوری متاثر ہو جانا عقلمندی نہیں بلکہ ایک فریب میں آجانا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان صرف باتوں پر نہیں، بلکہ عمل

اور رویے کو بھی پرکھے۔ اگر کوئی شخص بار بار بے وجہ تعریف کرے، ہر بات پر تائید کرے اور ہر طرف سے جھک کر ملے، تو یہ ایک خطرے کی گھنٹی ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ایسے افراد سے محفوظ رہنے کا ایک مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک حد تک تعلق رکھ کر محتاط رویہ اپنایا جائے۔ حد سے زیادہ قربت، ذاتی رازوں کا انکشاف، یا ان پر اعتماد کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ ان کی فطرت میں چونکہ دوغلا پن ہوتا ہے، اس لیے وہ آپ کی باتوں کو دوسرے مقامات پر آپ ہی کے خلاف استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا دانائی اسی میں ہے کہ ان کے ساتھ نہ تو سختی اختیار کی جائے کہ دشمنی کھل کر سامنے آ جائے، اور نہ ہی اتنا اعتبار کیا جائے کہ وہ آپ کی کمزوریوں سے واقف ہو جائیں۔

انسان کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئے، مگر دل سے محتاط رہے۔ گفتگو اور میل جول میں نرمی ہو، لیکن اپنے حدود و دائرے کو ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ دینِ اسلام نے بھی ہمیں سکھایا ہے کہ کسی کے ساتھ ایسا تعلق رکھو کہ اگر وہ دشمن بن جائے تو تمہارے راز محفوظ رہیں، اور اگر دشمن کے ساتھ حسنِ سلوک کرو تو بھی اس میں عدل اور وقار برقرار رہے۔ یہ توازن ایک مؤمن کی نشانی ہے۔

ایسے افراد سے بچنے کے لیے روحانی تحفظ بھی بہت اہم ہے۔ دعا، ذکرِ الٰہی، اور سورۂ فلق و ناس جیسی قرآنی آیات کا ورد انسان کو نظروں کے شر، حسد، اور خفیہ عداوتوں سے محفوظ

رکھتا ہے۔ دل میں اللہ پر کامل بھروسہ ہو تو کوئی بھی انسان اس کا نقصان نہیں کر سکتا، خواہ وہ بظاہر دوست بن کر آئے یا دل میں زہر چھپائے بیٹھا ہو۔

آخر میں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی فطرت کے مطابق ہی عمل کرتا ہے۔ ہمیں ایسے لوگوں کو بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے بلکہ خود کو اس حد تک مضبوط بنانا چاہیے کہ ان کا شر ہم پر اثر نہ کر سکے۔ یہ مضبوطی صرف عقل سے نہیں، بلکہ روحانیت، اخلاص اور صبر سے حاصل ہوتی ہے۔ ایسے افراد کے وجود کو مکمل نظر انداز کرنا بعض اوقات اُن کے شر کو ختم کر دیتا ہے، کیونکہ یہ اپنی شناخت اسی وقت قائم رکھتے ہیں جب اُن کی خوشامد یا سازش کا ردِ عمل ظاہر ہو۔ خاموشی، حکمت اور فاصلے کا امتزاج ہی اُن کے شر سے بچنے کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔

حصول علم کی بنیاد

علم کی دنیا میں ہمیشہ یہ سوال باقی رہا ہے کہ اصل علم کیا ہے؟ وہ جو کتابوں سے حاصل ہوتا ہے یا وہ جو انسان کی فطرت سے پھوٹتا ہے؟ یہ سوال صرف فلسفہ و حکمت ہی نہیں بلکہ سوشیالوجی، نفسیات، اخلاقیات اور الٰہی ادراک جیسے میدانوں میں بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ انسان کے اندر ایک ایسانور، ایک باطنی صلاحیت موجود ہے جو کسی مدرسے، کسی استاد، کسی کتاب یا درسگاہ کا محتاج نہیں۔ یہ وہ علم ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہ علم محض معلومات یا ذخیرۂ الفاظ نہیں بلکہ ادراک، فہم، حکمت، اور سچائی کو پہچاننے کی وہ قدرت ہے جو انسان کو حق و باطل، خیر و شر، نفع و ضرر، اور عدل و ظلم کے فرق کو سمجھنے کے قابل بناتی ہے۔ یہ علم، قوانینِ فطرت کی طرح غیر متغیر اور ہمہ گیر ہے، جیسا کہ سورج کی روشنی، پانی کی روانی، یا کششِ ثقل کی قوت۔

جس طرح فطرت کے قوانین ہر جگہ یکساں اور ثابت رہتے ہیں، اسی طرح انسان کا باطنی شعور بھی ایک مستحکم بنیاد ہے جس پر علم کی ہر عمارت قائم ہوتی ہے۔ اگر زمین نہ ہو تو کوئی بھی عمارت کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو، قائم نہیں رہ سکتی۔ ایسے ہی اگر انسان کے اندر وہ فطری عقل، شعور، اور صداقت کو پہچاننے کی صلاحیت موجود نہ ہو تو سنی سنائی باتیں، کتابوں کی معلومات، یا دوسروں کے اقوال محض سطحی نقش و نگار رہ جاتے ہیں، جن میں جان نہیں

ہوتی۔ تجربہ بھی دراصل اسی فطری علم کی توسیع ہے، جہاں انسان سیکھتا نہیں بلکہ اس باطنی روشنی کو دنیا کے مظاہر پر منطبق کرتا ہے۔ ایک باخبر دل، ایک بیدار ضمیر، اور ایک حساس وجدان وہ بنیاد ہے جو تجربے کو معانی عطا کرتا ہے۔

دوسری طرف سنا ہوا علم، جو کہ تعلیم، تربیت، کتابیں، روایات اور گفتگو کے ذریعے انسان کے ذہن تک پہنچتا ہے، اپنی اصل میں فائدہ مند ضرور ہے لیکن مشروط۔ یہ علم اس وقت سود مند ہوتا ہے جب انسان کے اندر اسے سمجھنے، پرکھنے، اور جذب کرنے کی صلاحیت ہو۔ اگر یہ داخلی بنیاد موجود نہ ہو تو سننے والا صرف الفاظ کو یاد رکھتا ہے، مفہوم کو نہیں۔ وہ علم کو نقل کرتا ہے، اس پر عمل نہیں کر پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک شخص بے شمار کتابیں پڑھ چکا ہوتا ہے مگر زندگی کے مسائل کے سامنے عاجز ہوتا ہے، اور ایک دوسرا شخص جو شاید رسمی تعلیم سے محروم ہوتا ہے، مگر اس کا دل روشن، فطرت زندہ، اور شعور بیدار ہوتا ہے، وہ حالات کا بہتر تجزیہ کرتا، مسائل کو سلجھاتا اور حق و ناحق میں فرق کرتا دکھائی دیتا ہے۔

اسی تناظر میں دیکھا جائے تو دینی علوم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ اور فلسفہ سب سننے، پڑھنے، سیکھنے کے ذرائع ہیں، لیکن ان سب کا فائدہ صرف اس شخص کو ہوتا ہے جو ان کی سچائی کو اپنے اندر کی روشنی سے پہچان سکے۔ جس کے اندر وہ "نور بصیرت" ہو جو سچ کو محسوس کرے، نہ کہ محض دلیلوں میں الجھ جائے۔ ایسے ہی انسان جب سچ سنتا ہے تو دل اس کی تصدیق کرتا ہے، آنکھ اشک بار ہوتی ہے، عمل میں تبدیلی آتی ہے، اور وہ علم، نور بن کر

کردار میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اگر یہی سننے والا شخص اندر سے خالی ہو، تو وہ علم اس پر بوجھ بن جاتا ہے، یا غرور کا سبب، یا صرف دماغی مشق۔

یہی اصول ہمیں اس بات کی طرف بھی لے جاتا ہے کہ اصل تعلیم وہی ہے جو انسان کے فطری شعور کو بیدار کرے، نہ کہ صرف معلومات کا انبار ہو۔ استاد کا کام صرف علم منتقل کرنا نہیں بلکہ شعور جگانا ہے۔ اور طالب علم کا کمال صرف رٹنے میں نہیں بلکہ اپنے اندر اس روشنی کو جگانے میں ہے جو سچ کو محسوس کر سکے، جو سوال اٹھا سکے، جو اپنی ذات کو بہتر بنانے کی جستجو کرے۔

لہٰذا، جب ہم علم کی دنیا میں فطری علم کو بنیاد اور سنے ہوئے علم کو ذریعہ مان لیتے ہیں تو علم کی حقیقی ترتیب واضح ہو جاتی ہے۔ بنیاد کے بغیر ذریعہ بیکار ہے، اور ذریعہ کے بغیر بنیاد مکمل نہیں۔ علم کا زندہ ہونا اسی وقت ممکن ہے جب یہ فطرت کی زمین پر اگایا جائے، شعور کے پانی سے سینچا جائے، اور سچائی کے سورج سے منور ہو۔ اس توازن کے بغیر نہ علم، علم کہلائے گا، نہ انسان، انسان۔

امام علیؑ نے فرمایا: علم دو طرح کا ہوتا ہے: فطری اور سنا ہوا لہٰذا سنا ہوا علم فائدہ نہیں پہنچا سکتا اگر فطری علم موجود نہ ہو۔

حق کے راستے میں دیر سویر ہے, ناکامی نہیں۔۔۔

زندگی کا سفر جب حق کے راستے پر گامزن ہوتا ہے تو وہ ایک ہموار شاہراہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا پیچیدہ راستہ بن جاتا ہے جس میں آزمائشیں، رکاوٹیں، دھند، تھکن اور ناامیدی کے لمحے بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ راستہ اکثر ہمیں ایسے مقامات پر لے آتا ہے جہاں منزل بہت دور یا غیر واضح محسوس ہونے لگتی ہے۔ بعض اوقات انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ہی جگہ پر رکا ہوا ہے، نہ کوئی تبدیلی آ رہی ہے اور نہ ہی کوئی ثمر ظاہر ہو رہا ہے۔ لیکن درحقیقت، یہ سب مراحل اس "پروسس" کا حصہ ہوتے ہیں جو ہمیں ہمارے مقصود تک پہنچانے کے لیے ترتیب دیا گیا ہے۔

حق کی راہ دراصل ایک ایسا راستہ ہے جو انسان کو صرف نتیجے پر نہیں، بلکہ سفر کے ہر مرحلے میں تربیت دیتا ہے۔ یہ راستہ ہمیں صرف منزل نہیں دیتا بلکہ ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ جب ہم منزل پر پہنچیں تو ہم اس کے اہل ہوں۔ اگر انسان صرف کامیابی کے ظاہر ہونے کا منتظر رہے اور اس دوران ساکن ہو جائے، تو وہ اس عمل کا حق ادا نہیں کر پاتا۔ کیونکہ صرف انتظار کامیابی کی ضمانت نہیں، بلکہ مسلسل جدوجہد، خود کو بہتر بنانے کی کوشش، حالات کو سمجھنے اور ان میں مؤثر کردار ادا کرنے کی صلاحیت ہی کامیابی کے دروازے کھولتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ایک خاص نظم و نسق رکھا ہے جس کے تحت ہر چیز تدریجاً اپنے کمال کی طرف بڑھتی ہے۔ بیج زمین میں دفن ہوتا ہے، تاریکی اور تنہائی سے گزرتا ہے، پانی اور دھوپ کی شدت سہتا ہے، تب جا کر وہ پودا بنتا ہے، پھر درخت، اور پھر ثمر آور ہوتا ہے۔ اگر ہم بیج کے اس سفر کو سمجھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ ہر لمحہ، چاہے وہ کتنا ہی غیر واضح یا تکلیف دہ کیوں نہ ہو، اصل میں ایک ضروری قدم ہے اس مکمل ہونے والے عمل کا۔ اسی طرح، حق کا راستہ بھی ایک روحانی اور عملی ارتقاء کا سفر ہے۔ اس میں آنے ولی مشکلات، دھندلے لمحے، خاموشی کے طویل دور، یہ سب دراصل تربیت اور آزمائش کے مراحل ہیں جو ہمیں ہمارے اصل مقام تک پہنچانے کے لیے ضروری ہیں۔

ان مراحل میں اصل چیلنج یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی امید کو باقی رکھے، اللہ پر بھروسہ رکھے، اور اس کے بنائے ہوئے نظام پر یقین کے ساتھ عمل کرتا رہے۔ بعض لوگ جب فوراً نتائج نہیں دیکھتے تو تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، یا راہ بدل لیتے ہیں، یا شک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس پروسس کو "خدا کی حکمت" سمجھ کر قبول کرتے ہیں، وہی اس سفر کے اصل مسافر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ صرف انتظار کرتے ہیں بلکہ اس دوران خود کو نکھارتے ہیں، نئے مواقع تلاش کرتے ہیں، ذمہ داریاں نبھاتے ہیں، اور اپنی کوششوں سے راستے ہموار کرتے ہیں۔

توکل کا مطلب صرف ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا نہیں، بلکہ اس کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ انسان پورے شعور اور اخلاص کے ساتھ حق پر قائم رہے، حتیٰ کہ اگر سب کچھ دھندلا ہو

جائے، تب بھی اسے یقین ہو کہ روشنی کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ حق کا راستہ، اگرچہ مشکل ہوتا ہے، لیکن اس میں ملنے والی کامیابی محض ایک ظاہری فتح نہیں، بلکہ ایک داخلی اطمینان، ایک روحانی سکون، اور اللہ کی قربت کا ذریعہ ہوتی ہے۔

یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص حق کے راستے پر آنے والی مشکلات کو اسی پروسس کا حصہ سمجھ کر قبول کرتا ہے، اور ہر حال میں اپنے کردار کو ادا کرتا رہتا ہے، وہی حقیقی کامیاب انسان ہے۔ کیونکہ اس نے راستے کو فقط ایک ذریعہ نہیں، بلکہ ایک تربیت گاہ، ایک عبادت، اور ایک قربانی کے عمل کے طور پر دیکھا، جس کا ہر لمحہ اسے اس کے رب کے قریب لے جاتا ہے۔

حمایت و مخالفت میں حق پر قائم رہنا

انسان کی زندگی میں سب سے بڑا پیمانہ "حق" ہوتا ہے، نہ کہ لوگوں کی مدح و مذمت۔ اگر انسان کے اعمال صرف لوگوں کے رویوں اور آراء پر مبنی ہوں تو وہ کبھی بھی ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور روایات معصومینؑ نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ انسان کا معیار رضائے الٰہی ہو، نہ کہ دنیا کی تحسین یا مذمت۔ قرآن کریم واضح طور پر فرماتا ہے: فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (ہود: 112) یعنی "جیسے تمہیں حکم دیا گیا ہے، ویسے ہی استقامت اختیار کرو، تم اور وہ لوگ بھی جنہوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے، اور سرکشی نہ کرو، بے شک وہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔" یہ آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ استقامت حق کے ساتھ مشروط ہے، نہ کہ لوگوں کی پذیرائی سے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تعریفیں بعض اوقات انسان کو غرور، خودپسندی اور ریاکاری میں مبتلا کر دیتی ہیں، جس کے نتیجے میں عمل کی روح یعنی اخلاص ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے امام علیؑ نے فرمایا" : کسی کی مدح سے تمہاری قدر و قیمت میں اضافہ نہیں ہوتا، اور نہ ہی کسی کی مذمت سے تمہاری قدر میں کمی آتی ہے۔ " امام کا یہ فرمان اس نظریے کو بنیاد فراہم کرتا ہے کہ انسان کو اپنا تعلق صرف خدا کے ساتھ رکھنا چاہیے، کیونکہ اصل ناظر، محاسب اور

جزا و سزا دینے والا صرف وہی ہے۔ اگر دنیا تمہارے حق عمل پر تمہیں برا کہے، تب بھی حق سے نہ ہٹو، کیونکہ تمہاری رضا کا مرکز خدا ہونا چاہیے نہ کہ عوام۔

قرآن مجید میں حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور بالخصوص رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں پوری قوم ان کے مقابلے پر کھڑی ہوئی، لیکن وہ اپنے اصولوں سے نہ ہٹے۔ سورہ یٰسین میں بیان ہوتا ہے کہ ایک بندۂ مؤمن نے جب اپنی قوم کو حق کی دعوت دی تو انہیں قتل کر دیا گیا، مگر اس کی استقامت کا ذکر قرآن میں ایک نمونہ کے طور پر موجود ہے۔قِيلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۖ قَالَ يَا لَيْتَ قَوْمِي يَعْلَمُونَ، یعنی "کہا گیا: جنت میں داخل ہو جاؤ، اس نے کہا: کاش میری قوم جان لیتی!"۔ یہ اس بندے کی وہ سوچ تھی جو تعریف یا مذمت سے بالاتر ہو کر صرف حق پر قائم رہنے کی علامت ہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: مَنْ طَلَبَ رِضَى النَّاسِ بِسَخَطِ اللهِ وَكَلَهُ اللهُ إِلَى النَّاسِ، یعنی "جو شخص لوگوں کی رضا کو اللہ کی ناراضگی پر ترجیح دے، اللہ اسے لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔" یہاں حقیقت یہ آشکار ہوتی ہے کہ اگر انسان لوگوں کی خوشنودی کے پیچھے بھاگے گا تو وہ نہ صرف خدا سے دور ہو جائے گا بلکہ آخر کار لوگوں کی نظروں میں بھی ذلیل ہو گا، کیونکہ لوگ بھی وفا نہیں کرتے۔

حق کی راہ پر چلنے والے ہمیشہ تنقید اور طعنوں کا شکار رہے ہیں، مگر قرآن کریم فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ: 8) یعنی "اے ایمان والو! اللہ کے لیے قیام کرنے والے اور انصاف کے گواہ بنو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو، یہی تقویٰ سے قریب تر ہے۔"

یہی روح ہمیں کربلا میں امام حسینؑ کی شہادت میں نظر آتی ہے۔ جب پوری حکومت، علما، عوام، اور یہاں تک کہ قبائل بھی مخالفت میں آ گئے، تب بھی امام نے اپنی راہ نہ چھوڑی۔ اگر وہ عوام کی تائید کے منتظر ہوتے تو شاید مدینہ سے ہی نہ نکلتے۔ مگر چونکہ ان کا پیمانہ رضائے الٰہی تھا، اس لیے انہوں نے تنہا ہو کر بھی حق کی حفاظت کی۔

لہٰذا ایک مؤمن کو نہ دنیا کی واہ واہ پر مغرور ہونا چاہیے، نہ لوگوں کی مخالفت پر مایوس۔ کیونکہ نہ تعریف انسان کو جنت میں لے جاتی ہے اور نہ مذمت جہنم میں۔ آخری فیصلہ صرف اس ربّ العالمین کے ہاتھ میں ہے جو دلوں کے حال جانتا ہے، نیتوں کو دیکھتا ہے، اور اعمال کا اجر صرف اپنی رضا کی بنیاد پر دیتا ہے۔ دنیا کا شور جتنا بھی بلند ہو، اگر دل میں یقین، عمل میں اخلاص اور قدموں میں استقامت ہو تو کوئی طاقت حق کے راستے سے نہیں ہٹا سکتی۔

قرآن و سنت کی روشنی میں جب ہم دنیا کی مدح یا مذمت سے بے نیاز ہو کر صرف حق پر قائم رہنے کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس کے چند گہرے باطنی اور معاشرتی پہلو بھی سمجھنے چاہیے جو عموماً زیر بحث نہیں آتے۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ حق پر ثابت قدمی صرف عقل اور استدلال سے نہیں آتی بلکہ اسے حاصل کرنے کے لیے قلبی طہارت، توکل، اور خدا کے

ساتھ ایک زندہ تعلق درکار ہوتا ہے۔ قرآن کریم بارہا تقویٰ اور صبر کو اس استقامت کا بنیادی ستون قرار دیتا ہے، جیسا کہ فرمایا: إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (یوسف: 90)۔ یہاں واضح ہوتا ہے کہ صبر اور تقویٰ محض وقتی جذبات نہیں بلکہ مسلسل روحانی مجاہدہ ہیں، جو انسان کو مخلوق کی واہ واہ یا طعن و ملامت سے بے پروا بنا دیتے ہیں۔

ایک دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ جو شخص حق کے ساتھ جُڑ جاتا ہے، وہ حقیقت میں خدا کی نصرت کے ساتھ جُڑ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر دنیا اس کی مخالفت کرے تو وہ دراصل خدا سے ٹکرانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام زین العابدینؑ نے دعا میں فرمایا: اللّٰهُمَّ اجْعَلْ نَفْسِي مُطْمَئِنَّةً بِقَضَائِكَ، رَاضِيَةً بِقَدَرِكَ، مُشْتَاقَةً إِلَى لِقَائِكَ۔ یہ دعا صرف ظاہری رضا نہیں بلکہ ایک اندرونی اطمینان کا اظہار ہے کہ بندہ دنیا کی مخالفت میں بھی خدا کی طرف لپکتا ہے اور اس کی رضا میں سکون پاتا ہے۔

اس مسئلے کا ایک نفسیاتی زاویہ بھی ہے۔ جو شخص ہمیشہ دنیا کی رائے کا اسیر ہوتا ہے، وہ اپنے نفس کا قیدی بن جاتا ہے۔ اس کی شناخت دوسروں کی زبان اور چہروں سے بندھی ہوتی ہے، اور اس کا باطن ایک خالی برتن کی طرح ہوتا ہے جو ہر شور سے بھر جاتا ہے، مگر کسی حقیقی معرفت سے لبریز نہیں ہوتا۔ امام علیؑ فرماتے ہیں" :عبد الدنیا وہ ہے جو لوگوں کی تعریف سے خوش اور مذمت سے پریشان ہو۔ "یہ جملہ ظاہر کرتا ہے کہ اصل آزادی تب ہے جب انسان اپنی قدر کو خدا کی نگاہ سے دیکھے، نہ کہ دنیا کی پیمائشوں سے۔

حق پر قائم رہنے کا ایک اجتماعی پہلو یہ بھی ہے کہ ایسے افراد، اگرچہ تنہا ہوتے ہیں، مگر ان کی استقامت سماج کے لیے دلیل اور برہان بن جاتی ہے۔ قرآن نے انبیاء کی مثالیں دے کر ہمیں دکھایا کہ کس طرح ایک فرد کی استقامت پوری قوم کے لیے ہدایت کا چراغ بن گئی، حتیٰ کہ وہ نسلیں جنہوں نے اس حق گوئی کو نہ دیکھا، وہ بھی اس کی روشنی سے ہدایت پاتی رہیں۔

قرآن نے ایسے افراد کو "رَبَّانِيُّونَ" اور "صَادِقِينَ" قرار دیا ہے، جو حق پر جمے رہتے ہیں خواہ ان کا ساتھ دینے والا کوئی نہ ہو۔ ان کی تنہائی ان کے مرتبے کو کم نہیں کرتی بلکہ خدا کے ہاں انہیں محبوب تر بنا دیتی ہے۔ سورہ بقرہ میں ذکر ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ہر دل کو بھا جانے والی بات حق نہیں ہوتی، اور نہ ہر وہ عمل جو بظاہر کامیاب دکھائی دے وہ خدائی میزان میں کامیاب ہوتا ہے۔

انسان جب حق پر استقامت اختیار کرتا ہے تو وہ صرف خدا پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ دنیا کو ایک پیغام دیتا ہے کہ حق کسی عددی طاقت، سیاسی حمایت یا ظاہری کامیابی کا محتاج نہیں۔ یہ وہی پیغام ہے جو حضرت ابو طالبؑ نے دیا، جنہوں نے قریش کی مخالفت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیا اور خاموشی سے اپنے ایمان کو عمل سے ثابت کر دکھایا۔

وہی انسان کامیاب ہے جو حق پر ہو اور خدا کی رضا کا طالب ہو۔ اگر دنیا اس کی قدر دان ہو تو بھی وہ شکر گزار ہو، اور اگر دنیا اس کا مذاق اڑائے، تو بھی وہ مطمئن رہے۔ کیونکہ جو شخص

جانتا ہے کہ وہ کسے راضی کر رہا ہے، اسے دنیا کی مخالفت یا تعریف کبھی متزلزل نہیں کر سکتی۔

اسلامی نفسیات (Islamic Psychology) انسان کے نفس، روح، عقل اور ارادے کو وحی کی روشنی میں سمجھنے کا وہ علم ہے جو انسان کی اصل حقیقت یعنی عبدیت، فطرت، تقویٰ، اور مقصدِ حیات کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جب ہم اس بنیادی قول کو اسلامی نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ:

"چاہے ساری دنیا مل کر بھی ہمارے کسی نیک و اچھے کام کی تعریف کرے تو ہمیں پھولنا نہیں چاہیے، اسی طرح اگر ساری دنیا مخالفت کرے تو ہمیں حق سے نہیں ہٹنا چاہیے" تو اس کا تعلق براہِ راست انسانی نفس کی تربیت، نیت، ارادے، اور توجہِ قلب سے جڑ جاتا ہے۔

اسلامی نفسیات کے مطابق انسان کی فطرت میں "حبِ جاہ" اور "حبِ مدح" یعنی شہرت اور تعریف کی محبت موجود ہوتی ہے۔ یہ نفسِ امّارہ کا ایک چالاک دھوکہ ہے جو انسان کو بظاہر نیک عمل کے بعد بھی ریاکاری، خود پسندی اور فخر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: **وَلَا تُبۡطِلُوٓاْ أَعۡمَٰلَكُمۡ**، یعنی "اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو"۔ یہاں اسلامی نفسیات یہ بتاتی ہے کہ ایک عمل بظاہر نیک ہو سکتا ہے، مگر اگر نیت میں دنیا طلبی یا تعریف کی لالچ ہو، تو وہ عمل باطنی لحاظ سے ناقص یا فاسد ہو سکتا ہے۔

نفسیاتی طور پر جب انسان دنیا کی تعریف کو اپنے وجود کا پیمانہ بناتا ہے تو اس کا شعور باہر کی آوازوں پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ اس کا اندرونی استحکام کمزور ہو جاتا ہے، اور وہ "ریاکارانہ شخصیت (pseudo-self) "اختیار کر لیتا ہے جو دوسروں کی آنکھوں میں اچھا دکھنے کے لیے بدلتی رہتی ہے۔ اسلامی نفسیات اس کو ایک بیمار روحانی کیفیت سمجھتی ہے، جس کا علاج "اخلاص" اور "محاسبۂ نفس" ہے۔

دوسری طرف، دنیا کی مخالفت سے متاثر ہو کر حق کو چھوڑ دینا بھی "نفسِ خائف" اور "نفسِ مذبذب" کی علامت ہے، جو باطن میں کمزور یقین، خوفِ مخلوق، اور دنیا پرستی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن منافقین کی نفسیات کو یوں بیان کرتا ہے: يُرَآءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيلًا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو عمل میں لوگوں کی رضا چاہتے ہیں، نہ کہ اللہ کی۔

اسلامی نفسیات کے اماموں کے مطابق، روحانی ترقی کا راستہ اس وقت کھلتا ہے جب انسان "نفسِ مطمئنہ "تک پہنچ جائے، یعنی وہ باطنی مقام جہاں انسان دنیا کی مدح یا مذمت سے بے نیاز ہو کر صرف خدا کے حکم اور رضا کو اپنے عمل کا مرکز بنالیتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جہاں انسان کا "خوف" اور "امید" صرف اللہ سے وابستہ ہو جاتا ہے، نہ کہ مخلوق سے۔

یہ قول اسی روحانی اور نفسیاتی مرکزیت کا بیان ہے۔ دنیا کی اجتماعی رائے کی کوئی مستقل حقیقت نہیں، کیونکہ آج جو تعریف کرتے ہیں وہی کل مخالفت بھی کر سکتے ہیں۔ مگر خدا کا معیار مستقل، سچا، اور عادل ہے۔ جب انسان اپنی نفسی تربیت اس شعور کے ساتھ کرتا ہے

کہ ہر عمل کا مشاہد ناظرِ مطلق خدا ہے، تو وہ آہستہ آہستہ "مدح زدگی" اور "ذم ہراسی" جیسی بیماریوں سے نکل آتا ہے۔

لہٰذا اسلامی نفسیات اس قول کی تائید کرتی ہے کہ جو شخص اپنی نفسی کیفیتوں پر قابو پا کر، اخلاص، یقین، توکل، اور تقویٰ کی روش اپناتا ہے، وہ ہی حقیقی معنوں میں باطنی طور پر آزاد ہوتا ہے۔ وہ نہ مدح سے مغرور ہوتا ہے، نہ مخالفت سے مرعوب۔ وہ "عبد اللہ" بنتا ہے، نہ کہ "عبد الناس"۔ اور یہی اسلامی نفسیات کا ہدف ہے: ایک ایسا انسان جو اللہ کے سوا کسی اور کو مرکزِ رضا نہ بنائے۔

جانب دار یا غیر جانب دار عالم

انسانی زندگی میں علم اور اس کا حصول ایک عظیم فریضہ اور نعمت ہے جو عقل، فہم، اور شعور کی منزلوں کو روشن کرتا ہے۔ اس راہ میں پہلا قدم تحقیق و جستجو کے ذریعے غیر جانبداری کا اصول اپنانا ہے۔ جب ایک طالب علم یا محقق کسی موضوع پر غور و فکر کرتا ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ اس سفر میں کسی تعصب سے بالاتر ہو کر معلومات حاصل کرے۔ غیر جانبداری اسے صحیح اور مستند علم تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے سامنے حقائق کی اصل تصویر لاتی ہے۔ اگرچہ اس راستے میں وقت لگتا ہے، لیکن سچائی تک رسائی حاصل کرنا ہی وہ منزل ہے جو علم کی حقیقی بنیاد کو مضبوط کرتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بارہا غور و فکر، علم اور تعقل کی تاکید کی ہے، جو انسان کو حقائق کے ادراک اور خالص علم کے حصول کی ترغیب دیتی ہے۔

تاہم، جب انسان زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھتا ہے تو یہاں علم کو عمل میں لاتے ہوئے جانبداری کو اختیار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ جانبداری، درحقیقت، اصول اور ایمان کے دفاع کا نام ہے، جہاں انسان کو اپنے مقاصد، نظریات، اور اعتقادات کو محفوظ رکھنے کے لیے فیصلہ کن رویہ اپنانا پڑتا ہے۔ جسے دین اسلام میں "حب فی اللہ اور بغض فی اللہ" کا اصول بھی کہا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی وفاداری اور تعلق اللہ کی

خاطر مضبوط بنائے اور جہاں سچائی اور حق کا دفاع لازم ہو، وہاں اپنے موقف پر ثابت قدم رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی سچائی پر مبنی جدوجہد میں ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی ہے، اور حضرت علی علیہ السلام کے فرامین میں یہی اصول ملتا ہے کہ حق کا راستہ آسان نہیں ہوتا اور اس میں انسان کو مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مزید برآں، عملی میدان میں ہر معلومات کا افشا کرنا ضروری نہیں۔ یہاں انسان کو حکمت اور دانشمندی سے کام لینا ہوتا ہے کہ کون سی معلومات کب، کہاں، اور کس کے ساتھ شیئر کی جائیں۔ بے وقت یا بے ضرورت معلومات کا عام کرنا بسا اوقات نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، اس لیے ایک محقق یا عالم کو ہر مقام پر اپنی بات کو کہنے سے قبل حکمت و بصیرت کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ قرآن میں حضرت خضر علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ کچھ باتوں کا افشا مناسب وقت اور مقام کے بغیر نہیں کیا جاتا۔ ایسا طرز عمل نہ صرف انسان کو نقصان سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ حکمت عملی کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے۔

ایک جانب عالم کا فرض ہے کہ وہ علم کو غیر جانبداری کے ساتھ تحقیق میں استعمال کرے، اور دوسری جانب عملی میدان میں وہی عالم اپنے نظریات کے تحفظ کے لیے جانبدار بھی ہو۔ یہ دونوں رویے ایک توازن کو ظاہر کرتے ہیں جہاں علم کی حقیقت تک رسائی اور عمل کی تقویت ساتھ چلتی ہیں۔ عملی زندگی میں جو لوگ علم کو غیر جانبداری سے بروئے کار لانے کی کوشش کرتے ہیں، اکثر انہیں ایسی رکاوٹوں اور مخالفتوں کا سامنا ہوتا ہے جو ان کے

مقاصد کے خلاف ہوتی ہیں۔ اسی لیے، اسلام میں علم کو عمل میں تبدیل کرنے کے لیے تقویٰ، بصیرت اور استقامت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگر عملی زندگی میں کبھی نئے حقائق اور حق کی نشانیوں کا سامنا ہو تو قبولیت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہمیں سکھاتی ہے کہ علم کی حد نہیں اور ہر نئے سچ کی طرف مائل ہونا ایک مومن کا شیوہ ہے۔ کیونکہ حصول علم ایک مسلسل سفر ہے جو انسان کو قبر تک جاری رکھنا چاہیے۔ حقیقت اور صداقت کی قبولیت اور اس پر ثابت قدمی انسان کو اللہ کے قرب کا ذریعہ بناتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بظاہر متضاد نظر آنے والی باتیں حقیقت میں حکمت اور بصیرت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتی ہیں۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ "علم منافق سے بھی ملے تو لے لو"، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علم کی کوئی سرحد نہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر جگہ سے، خواہ وہ کسی بھی شخص سے کیوں نہ ہو، انسان علم کا فائدہ اٹھائے۔ یہاں علم کے معاملے میں اصل توجہ اس کے فائدے اور حقیقت پر مرکوز ہے، نہ کہ اس شخص پر جو علم فراہم کر رہا ہے۔ لہٰذا، اگر کوئی مفید اور حقیقت پر مبنی معلومات فراہم کر رہا ہے تو اسے محض اس کے کردار یا عقیدے کی بنا پر رد نہیں کرنا چاہیے۔

دوسری طرف جب قرآن کہتا ہے کہ "جب کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو"، تو اس میں احتیاط اور غور و فکر کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہاں علم یا معلومات کا حاصل

کرنا نہیں بلکہ اس کی سچائی پر اعتبار کرنا اہم ہے، کیوں کہ فاسق یا غیر معتبر شخص کی دی گئی خبر کو آنکھ بند کر کے مان لینے سے ممکن ہے کہ انسان گمراہی کا شکار ہو یا غلط فیصلہ کر بیٹھے۔ اس حکم میں مسلمانوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ خبر یا معلومات کے معاملے میں حقیقت کو جانچنے کی عادت ڈالیں، تاکہ کسی فاسد یا گمراہ کن معلومات کی بنا پر نقصان نہ ہو۔

دونوں باتوں میں دراصل مختلف حالات اور کیفیات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ علم کو حاصل کرنے کی تاکید ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ علم کو تلاش کرنا اور سیکھنا ایک مومن کی ذمہ داری ہے، چاہے وہ کہیں سے بھی ملے۔ جبکہ فاسق کی خبر کے معاملے میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس معلومات کی صداقت کی تحقیق کی جائے تاکہ کسی دھوکہ دہی یا گمراہی سے بچا جا سکے۔

لہذا، یہ دونوں حکم ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں بلکہ ایک وسیع تر اسلامی فہم اور دانش کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایک جگہ علم کی اہمیت اور وسیع دائرہ کار کو واضح کیا گیا ہے، جبکہ دوسری جگہ معلومات کے حصول کے بعد اس کی تحقیق اور حقیقت پسندی پر زور دیا گیا ہے۔ یہ دراصل مختلف مواقع اور حالات کے حساب سے دی گئی ہدایات ہیں جو ایک مومن کی زندگی میں حکمت اور بصیرت کو متوازن طور پر بروئے کار لانے کی ترغیب دیتی ہیں۔

نتیجتاً، ایک حقیقی عالم وہی ہے جو تحقیق میں غیر جانبدار اور عمل میں اصولی جانبداری کا مظاہرہ کرے۔ وہ سچ کی تلاش میں کسی تعصب کا شکار نہ ہو، مگر جب حق واضح ہو جائے تو اس کے دفاع میں کمزور نہ پڑے۔ ایسے عالم کی شخصیت توازن، حکمت اور استقامت کا آئینہ

دار ہوتی ہے جو نہ صرف علم کے نور سے منور ہوتا ہے بلکہ حق کے تحفظ میں بھی روشن مثال بن جاتا ہے۔

دو برائیوں میں انتخابِ احسن

امام علیؑ کا قول کہ "عاقل وہ نہیں جو بری باتوں میں سے اچھی بات کو پہچان لے بلکہ عاقل وہ ہے جو دو بری چیزوں میں سے بہترین چیز کو پہچان لے" دراصل ایک عظیم عملی حکمت اور عمیق سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے، جو بالخصوص بعد از وفات رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش آنے والے خلافت کے مسئلے میں امام علیؑ کے رویے اور طرزِ عمل میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ اس قول کی روشنی میں اگر ہم اُس تاریخی مرحلے کو سمجھنے کی کوشش کریں جب خلافت بلا فصل امام علیؑ کے بجائے دیگر افراد کے ہاتھ میں چلی گئی، تو ہمیں اس عظیم ہستی کی وہ حکمتِ عملی نظر آتی ہے جو فقط جذباتی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کی فلاح، امت کی وحدت اور اسلام کی بقاء کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مرتب کی گئی تھی۔

رسول اللہ صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت کا جو سیاسی بحران پیدا ہوا، وہ صرف ایک شخصی حق کا مسئلہ نہ تھا بلکہ پوری امت کے اجتماعی مستقبل کا سوال بن چکا تھا۔ امام علیؑ جانتے تھے کہ ان کا حق انکار سے خالی نہیں، اور وہ اس پر بارہا اشارتاً اور گاہے بگاہے کنایہ و تصریح کے ساتھ گفتگو بھی کرتے رہے، جیسا کہ نہج البلاغہ میں جگہ جگہ اس کی جھلک نمایاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے مکمل طور پر علیحدگی اختیار نہ کی، نہ کوئی خونریزی کی راہ اپنائی، اور نہ امت کو فتنہ و انتشار کے سپرد کیا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں امامؑ کا مذکورہ قول مجسم صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

امام علیؑ اس دور میں ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں ایک طرف اپنا فطری، شرعی اور روحانی حق تھا جو غصب ہوا، اور دوسری طرف ایک بکھرتی ہوئی امت تھی، ایک نوزائیدہ اسلامی ریاست تھی جسے اندرونی بغاوتوں، مرتدین، رومی و ایرانی سازشوں، اور فکری انتشار کا سامنا تھا۔ اس موقع پر اگر امام علیؑ شدت اختیار کرتے، زبردستی خلافت لینے کی کوشش کرتے یا خانہ جنگی کا راستہ چنتے تو بظاہر وہ اپنے حق کو تو وصول کر لیتے، مگر اسلام کی وحدت بکھر جاتی، دین نوپا تباہی کا شکار ہو جاتا، اور امت ایسی خونریزی میں الجھ جاتی جس سے دوبارہ ابھرنا شاید ممکن نہ ہوتا۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں امامؑ نے دو برے راستوں میں سے کم نقصان دہ اور نسبی خیر کو اپنایا۔ ایک راستہ یہ تھا کہ خاموشی اختیار کی جائے، دل میں کرب کے ساتھ اپنی مظلومیت کو محسوس کیا جائے، لیکن امت کی بقاء کے لیے ایک وسیع تر خیر کی طرف دیکھا جائے؛ اور دوسرا یہ کہ فوری اور ظاہری طور پر حق حاصل کرنے کے لیے امت کے امن کو قربان کر دیا جائے۔ امامؑ نے پہلے راستے کو چنا، نہ اس لیے کہ وہ اپنے حق سے غافل تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ عقل کے اس اعلیٰ معیار پر فائز تھے جس کی وہ تعلیم دیتے تھے: یعنی جب دونوں پہلو نقصان دہ ہوں، تب وہ راستہ اپنایا جائے جو امت کے لیے کم خرابی اور زیادہ خیر پر منتج ہو۔

اس دوران انہوں نے خلفاء کے ساتھ مشورہ دیا، جنگی، عدالتی اور انتظامی امور میں رہنمائی فرمائی، تاکہ اسلام کی بنیادیں مضبوط رہیں اور اسلام کی اصل روح نہ ٹوٹے۔ یہ وہی عقل ہے جس کا درس وہ دے رہے تھے۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ چونکہ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے،

لہٰذا میں دین سے کٹ جاؤں، میں خاموش تماشائی بن جاؤں یا امت کو اس کے حال پر چھوڑ دوں۔ بلکہ وہ اسلام کی کشتی کے محافظ بن کر کھڑے رہے، اگرچہ اس کشتی کا ناخدا وہ نہ تھے جنہیں وہ جائز سمجھتے تھے۔

یہی امام علیؑ کی حقیقت ہے: اپنے ذاتی حق اور درد کو پی کر امت کی اجتماعی خیر کو ترجیح دینا۔ یہی وہ فکری بلندی ہے جہاں عقل صرف معلومات یا اصولوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ عملی تدبیر، فہمِ وقت، اور فداکاری کا نام بن جاتی ہے۔ امامؑ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ دراصل اس قول کا کامل عملی مظہر ہے۔ ان کا سکوت، ان کی حکمت، ان کی مشاورت، اور پھر وقت آنے پر ان کا خود خلافت قبول کرنا، ان سب کا پس منظر یہی تھا کہ وہ امت کو کسی بڑے فتنہ سے بچا کر تدریجاً حق کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔

یہ طرزِ عمل آج بھی ہماری سیاسی، سماجی اور مذہبی قیادت کے لیے ایک مینارۂ نور ہے۔ جب ہم دو برائیوں میں گھرے ہوں، جب مثالی خیر ناپید ہو، تب ہمیں اس خیر نسبی کو اختیار کرنا چاہیے جو فتنہ وفساد کے دروازے بند کر دے اور آئندہ کے لیے اصلاح کی راہ ہموار کرے۔ امام علیؑ ہمیں سکھاتے ہیں کہ عقل وہ نہیں جو صرف مثالی خیر کی پہچان رکھے، بلکہ اصل عقل وہ ہے جو تلخ حالات میں بھی امت کی بھلائی کے لیے بہترین راستہ چنے، اگرچہ وہ ذاتی نقصان پر ہی کیوں نہ ہو۔ یہی ہے علوی حکمت، اور یہی ہے فکری بلندی کا وہ مقام جو صرف اولیاء الٰہی کے حصے میں آتا ہے۔

ذمہ دار و غیر ذمہ دار انسان

دنیا میں جو شخص شعور، فکر، ذمہ داری اور سچائی کی روشنی سے جیتا ہے، وہ خود کو دنیا کے مسائل سے الگ نہیں رکھتا بلکہ ان کا سامنا کرتا ہے، ان کے بوجھ کو اٹھاتا ہے اور اس راہ میں قربانیاں دیتا ہے۔ دوسری طرف احمق، جو نہ حق کی فکر کرتا ہے، نہ اپنی ذات کے مفہوم کو سمجھتا ہے، نہ انسانیت کے تقاضوں کو پہچانتا ہے، وہ دنیا کی سطحی آسانیوں میں بہتا ہوا زندگی گزارتا ہے، اور یوں دنیا کا بوجھ اس کے کندھوں پر نہیں آتا کیونکہ وہ کبھی اس بوجھ کو اٹھانے کے لائق ہی نہیں بنتا۔

یہاں "دنیا کی زحمتیں" محض معاشی یا جسمانی تھکن نہیں، بلکہ ایک شعوری، اخلاقی اور فکری ذمہ داری ہے جو انسان اپنی ذات، معاشرہ، اور حق کی معرفت کے تناظر میں محسوس کرتا ہے۔ ایک عاقل انسان جب دنیا میں قدم رکھتا ہے تو وہ صرف کھانے، کمانے یا لطف اٹھانے کی خاطر نہیں جیتا بلکہ وہ اپنے وجود کے مقصد، معاشرتی کردار اور ابدی حقیقت کے ادراک کے ساتھ جیتا ہے۔ اس کی زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہوتی ہے: باطل کے خلاف، ظلم کے خلاف، اپنی خواہشات نفس کے خلاف، اور اس دنیا کی ناپائیداری کے خلاف ایک بیدار اور مسلسل جنگ۔ اس کے برعکس احمق کو نہ یہ فکر ہوتی ہے کہ وہ کیوں پیدا ہوا، نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ معاشرے میں اس کا کیا کردار ہونا چاہیے، نہ یہ شعور ہوتا ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ وہ آسانیوں، تسکین، آرام، اور وقتی خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے اور یوں بظاہر خوش وخرم مگر باطن میں کھوکھلا اور بے سمت زندگی گزارتا ہے۔

عروج و زوال کے قوانین کی روشنی میں یہ بات بڑی وضاحت سے سامنے آتی ہے کہ جو قومیں، فرد، یا تہذیبیں فکری، اخلاقی اور روحانی بیداری کا بوجھ اٹھاتی ہیں، جو حق کے لیے قربانی دیتی ہیں، جو شعور کے ساتھ دنیا میں قدم رکھتی ہیں، وہی تاریخ میں سرخرو ہوتی ہیں، وہی قومیں بلندیوں پر پہنچتی ہیں، اور وہی انسان دائمی اثرات چھوڑتے ہیں۔ جب کہ وہ قومیں یا افراد جو محض سطحی آرام، وقتی کامیابی اور مفاد پرستی کے اسیر ہوتے ہیں، وہ آخرکار زوال پذیر ہوتے ہیں کیونکہ انہوں نے دنیا کی اصل زحمت یعنی بیداری، ذمہ داری اور قربانی سے فرار اختیار کیا ہوتا ہے۔

تاریخ اس قول کی عملی تصدیق سے بھری پڑی ہے۔ انبیاء علیہم السلام، ائمہ علیہم السلام، اولیاء اور مصلحین نے ہمیشہ دنیا کی زحمتیں برداشت کیں، کیونکہ وہ عاقل تھے، وہ حقیقت بین تھے، وہ انسانوں کی ہدایت و فلاح کی فکر رکھنے والے تھے۔ انہوں نے دنیا کے بوجھ کو کندھوں پر اٹھایا، باطل کی تلواروں کے سامنے کھڑے ہوئے، مظلوموں کے لیے تازیانے کھائے، مگر سچائی کا علم کبھی زمین پر نہ گرنے دیا۔ ان کے مقابل احمقوں، طاغوتوں، اور جاہلوں نے عیش و عشرت میں زندگی گزاری، محلات بنائے، طاقت کے نشے میں مست رہے، مگر تاریخ نے ان کے نام مٹادیے، ان کے اقتدار کو خاک میں ملادیا اور ان کے چہروں سے نقاب اتار دیے۔

اسی طرح جب ہم آج کی دنیا میں دیکھتے ہیں کہ کہاں کہاں دنیا کی زحمتیں اٹھائی جارہی ہیں— مثلاً مظلوموں کے حق میں آواز اٹھانا، تعلیم و شعور کے لیے جدوجہد کرنا، اخلاقی اقدار کے

لیے کھڑے ہونا—تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ وہی عاقل لوگ ہیں جنہوں نے شعور کی شمع کو ہاتھ میں لیا ہوا ہے، اور اس کے بدلے میں انہیں تکلیفیں، قربانیاں اور تنہائیاں ملی ہیں۔ لیکن ان کے کندھے مضبوط ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہی بوجھ انہیں زمانے کی نظروں میں بلند کرے گا اور ان کے نام کو تاریخ کے صفحات میں جاوداں کر دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کا بوجھ وہی شخص اٹھاتا ہے جو زندہ ضمیر اور بیدار عقل کا مالک ہوتا ہے، جو حقیقت کو جاننے اور ماننے کی جرأت رکھتا ہے، اور جو سچائی کے لیے تکلیف اٹھانے کو زندگی کی کامیابی سمجھتا ہے۔ جبکہ احمق، خواہ وہ کتنی ہی آرام دہ زندگی کیوں نہ گزارے، درحقیقت زمانے کے لیے ایک بوجھ اور اپنے انجام کے لیے ایک اندھا سفر ہوتا ہے۔ امام علیؑ کا یہ قول ہمیں یہ شعور دیتا ہے کہ عزت، بیداری، قربانی اور فہم کی راہ آسان نہیں، مگر دائمی ہے؛ اور آسانی، بے فکری، غفلت اور لذت پرستی کی راہ بظاہر ہلکی ہے، مگر انجام میں پست اور زوال پذیر ہے۔ یہی قانونِ فطرت ہے، یہی سنتِ الٰہیہ ہے، اور یہی انسان کی اصل کسوٹی ہے۔

امام علیؑ کا یہ قول "دنیا کی زحمتیں عاقل کے لیے ہیں اور احمق کا شانہ اس بوجھ سے خالی ہے"۔

سانحہ کربلا کے مجرمین کی جدید دور پر تطبیق

کربلا کا سانحہ محض سن 61 ہجری کی ایک تاریخی جنگ نہیں بلکہ حق اور باطل، حریت اور غلامی، عدل اور استبداد، نور اور ظلمت کی ازلی جنگ کا وہ مظہر ہے جو ہر زمانے میں نئے چہروں اور نئے عنوانات کے ساتھ سامنے آتی رہی ہے۔ کربلا کے مجرم محض یزید، ابن زیاد، عمر سعد یا شمر نہیں تھے بلکہ وہ پوری طرزِ فکر، سیاسی ڈھانچے، اقتصادی مفادات اور سماجی منہج کے نمائندہ تھے جو کسی بھی وقت کے استعمار، سامراج اور طاغوت کی صورت میں ظہور کرتا ہے۔ ان افراد کا جرم صرف یہ نہیں تھا کہ انہوں نے ایک امام کو قتل کیا، بلکہ یہ کہ انہوں نے ایک الٰہی نظام کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے اسے دنیاوی طاقت، زر، سازش اور تشہیر کے ذریعے کچلنے کی کوشش کی۔ اگر اس تناظر کو اپنایا جائے تو کربلا کے مجرموں کی تطبیق آج کی دنیا کے سامراجی اور استعماری عناصر پر بڑی وضاحت سے کی جا سکتی ہے۔

رَوتھ چائلڈ خاندان جسے عالمی مالیاتی استبداد کا باپ کہا جاتا ہے، وہ کربلا کے ابن زیاد کی جدید شکل ہے جو ریاستی وسائل پر قبضہ کر کے عوام کو غلامی کے دائرے میں رکھتا ہے۔ ان کے بینکوں اور مالیاتی اداروں نے افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ میں وہی کردار ادا کیا ہے جو ابن زیاد نے کوفہ میں کیا تھا؛ لوگوں کو دھونس، لالچ، اور خوف سے خرید کر حق کی آواز کو دبایا۔ راک فیلر خاندان نے سرمایہ دارانہ نظام کو جس طرح عالمی استعمار کا بنیادی ستون بنایا، وہ

کربلا کے شمر کے مماثل ہے؛ دل میں ذاتی حسد، مفادات کی وحشت، اور سفاکی کی انتہا۔ ان کے تحت بننے والے تھنک ٹینکس اور NGOs نے جس چالاکی سے روحانی تحریکوں کو زک دی اور عوام کے شعور کو پراگندہ کیا، وہ ویسی ہی جنگ تھی جیسی کربلا میں تلواروں سے نہیں بلکہ پروپیگنڈا اور نفسیاتی دباؤ سے لڑی گئی تھی۔

ڈونلڈ ٹرمپ جیسے جدید حکمران کربلا کے یزید کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ طاقت کے نشے میں، پوری دنیا کے عوامی مزاحمتوں، مذہبی آزادیوں اور اخلاقی اصولوں کو پامال کرتے ہیں۔ جیسے یزید نے دین کو سلطنت کا زینہ بنایا، ویسے ہی ٹرمپ نے انجیل، عیسائیت اور جمہوریت کو سیاسی مفاد کا آلہ کار بنایا۔ اس کا "ڈیل آف دی سنچری" ہو یا بیت المقدس کو اسرائیل کا دارالحکومت قرار دینا، ہر فیصلہ مظلوموں کی قبروں پر رقص کرنے کی مثال ہے۔ بنیامین نتن یاہو اس وقت کے عمر بن سعد سے مشابہ ہے جو میدانِ جنگ میں تو تھا مگر ضمیر میدان سے پہلے ہی بک چکا تھا۔ اس کا اسرائیلی استعمار کربلا کی فوج کی جدید صورت ہے، جو غزہ کے بچوں پر بم برساتا ہے اور حریت پسندوں کو دہشت گرد کہتا ہے، جیسا کہ کربلا میں امام حسینؑ کو خارجی کہا گیا تھا۔

ایمانوئیل میکرون اور یورپ کے وہ تمام حکمران جو آزادیِ اظہار کے نام پر رسول اللہؐ کی توہین کو جائز قرار دیتے ہیں، وہی جدید شمر ہیں، جو نام خدا کا لیتے ہیں لیکن اس کی حرمت کو روندتے ہیں۔ ان کے قانون، عدالتیں، اور تعلیمی نظام باطن میں یزیدیت کا قلعہ ہیں، جہاں عدل محض طاقتور کے لیے ہے اور آزادی محض گمراہی کے لیے۔ ان کا سیکولرزم اصل میں

دین کے خلاف بغاوت کی منظم تحریک ہے، جو امام حسینؑ کے "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کے اصول سے متصادم ہے۔

اگر پاکستان کے سیاسی اکابرین کی بات کی جائے تو یہاں کا نظامِ سیاست، اشرافیہ، اور مقتدر حلقے کربلا کے ابن زیاد اور عمر سعد کی ملی جلی تصویر ہیں۔ وہ جو عوامی ووٹ سے آتے ہیں لیکن طاقت کے ایوانوں میں جاکر طاغوت کے نمائندہ بن جاتے ہیں۔ یہ وہی چہرے ہیں جو مسجدوں میں دینداری، میڈیا پر وطن پرستی، اور جلسوں میں اخلاقیات کی بات کرتے ہیں لیکن پسِ پردہ IMF اور FATF کے دباؤ پر سود، قحبہ گری، بے حیائی، کرپشن اور استعماری غلامی کو قانونی تحفظ دیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو آلِ رسولؐ کے ذکر پر اشک بہاتے ہیں لیکن آج کے مظلوموں کو گمراہ، غدار یا باغی کہتے ہیں۔ ان کے درباری مولوی، مفاد پرست تجزیہ کار، اور سرکاری قلمکار دراصل جدید یزیدی منبروں پر بیٹھے شمر ہیں، جو قوم کے ضمیر کو سوئے رکھتے ہیں۔

ہندوستان کا موجودہ فاشزم، نریندر مودی، آر ایس ایس اور ان کے انتہا پسند نظریات، کربلا کے وہ خوارج ہیں جو نہ عقل رکھتے ہیں نہ رحم، صرف تعصب، نفرت، اور طاقت کے جنون میں جھلسے ہوئے ہیں۔ جس طرح یزید نے اسلام کو مٹانے کے لیے دین کی ظاہری علامتوں کو باقی رکھا، ویسے ہی مودی ہندوتوا کی آڑ میں ہندوستان کو سیکولر سے ہندو راشٹر بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کے نہتے مسلمانوں کی چیخیں آج بھی کوفہ کے گلی کوچوں میں زینبؑ کے بین کی بازگشت ہیں۔

یہ تمام جدید سامراجی اور استبدادی چہرے اس ایک بنیادی قدر سے خالی ہیں جس کے لیے حسینؑ نے قربانی دی: انسان کی عزت، دین کی حرمت، اور عدل کا قیام۔ کربلا ہمیں یہ بتاتی ہے کہ باطل کبھی ایک نام، ایک چہرہ یا ایک وقت تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ہر دور میں وہ نئے چولے پہن کر آتا ہے، نئی زبان میں بولتا ہے، اور نئی دلیلیں تراشتا ہے۔ مگر حسینؑ ہر دور میں وہی رہتا ہے؛ مظلوموں کا امام، آزادی کا پرچم، اور حق کا چراغ۔ جو آج بھی جل رہا ہے، ان ظالموں کے ظلم کے خلاف، چاہے ان کا نام راک فیلر ہو یا ابن زیاد، نتن یاہو ہو یا شمر، یا وہ سب جو فقط اس لیے خاموش ہیں کہ ان کا مفاد یزید کے دربار سے وابستہ ہے۔ حسینؑ ان سب کے خلاف وہ ابدی قیام ہے جسے سمجھنے کے لیے آنکھ نہیں دل درکار ہے۔

سورۂ عصر اور زندگی کی سچائیاں

سورۃ والعصر قرآن مجید کی ایک نہایت مختصر لیکن جامع اور گہری معنی رکھنے والی سورت ہے، جو انسان کی زندگی، اس کے حالات، اس کے اعمال اور اس کے انجام کے بارے میں نہایت اہم حقائق بیان کرتی ہے۔ اس سورۃ کا پیغام نہ صرف مذہبی بلکہ نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی اعتبار سے بھی ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ اگر ہم موجودہ زمانے کی زندگی کو دیکھیں تو ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انسان ہمہ وقت مختلف حالات سے گزرتا ہے۔ کبھی وہ خوشیوں میں ہوتا ہے اور کبھی غم و پریشانی میں، کبھی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتا ہے تو کبھی ناکامیوں کا سامنا کرتا ہے۔ ان حالات میں انسان کی کامیابی کا راز صرف اس بات میں نہیں کہ وہ کب خوش ہے، بلکہ اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ ان تمام حالات میں صبر و تحمل کے ساتھ کس طرح اپنی راہ کو درست رکھتا ہے اور اپنی اصل منزل کی طرف گامزن رہتا ہے۔

انگریزی جملہ "Life comes with highs and lows. Don't break your heart by expecting things to be good all the time. Have patience. Invite and embrace happy moments." ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ زندگی ایک مسلسل سفر ہے جو کبھی آسان اور کبھی مشکل مرحلوں سے گزرتا ہے۔ انسان اگر یہ توقع رکھے کہ ہر وقت سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوگا، تو یہ محض خام

خیالی ہے۔ ایسی توقعات انسان کے دل کو توڑتی ہیں اور اسے مایوسی کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہی مایوسی رفتہ رفتہ انسان کو کمزور اور بے چین کر دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی فطرت اور دنیا کے اصولوں کو سمجھتے ہوئے ان نشیب و فراز کو قبول کرے، صبر اختیار کرے اور جب خوشی آئے تو اس کا خیر مقدم کرے۔

سورۃ والعصر اسی حقیقت کو بڑی شدت اور جامعیت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ زمانے کی قسم کھا کر ایک نہایت اہم بات فرماتے ہیں کہ "بیشک انسان خسارے میں ہے"۔ اس ایک جملے میں انسان کی عمومی حالت کو بیان کر دیا گیا کہ اگر وہ اپنی زندگی کو بغیر کسی مقصد کے گزارے، وقت کو ضائع کرے، اپنے اعمال کا محاسبہ نہ کرے، تو وہ لازمی طور پر نقصان اٹھائے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس نقصان سے بچنے کا بھی واضح طریقہ بتایا: ایمان، عمل صالح، حق کی تلقین اور صبر کی وصیت۔ یہی چار چیزیں انسان کو اس دنیا کے عارضی اور وقتی اتار چڑھاؤ میں ثابت قدم رکھتی ہیں اور اسے ایک باوقار اور کامیاب زندگی عطا کرتی ہیں۔

ایمان انسان کو اللہ پر اعتماد دیتا ہے، عمل صالح اس اعتماد کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے، حق کی تلقین انسان کو سچائی پر قائم رکھتی ہے اور صبر اسے وقت کی کٹھنائیوں میں ڈٹے رہنے کی طاقت بخشتا ہے۔ ان سب صفات کا تعلق براہ راست زندگی کے ان اتار چڑھاؤ سے ہے جن کا ذکر انگریزی عبارت میں کیا گیا ہے۔ جب انسان ان اصولوں کو اپناتا ہے تو وہ نہ صرف دنیاوی پریشانیوں میں مضبوط رہتا ہے بلکہ آخرت کی کامیابی کا بھی امیدوار بن جاتا ہے۔

اگر ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں تو ہمیں بے شمار لوگ دکھائی دیتے ہیں جو معمولی سی ناکامی یا پریشانی میں دل شکستہ ہو جاتے ہیں، کچھ تو اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ زندگی سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے سورۃ والعصر ایک زبردست پیغام رکھتی ہے۔ یہ سورت انسان کو بتاتی ہے کہ تمہاری اصل کامیابی وقتی خوشی یا غم میں نہیں، بلکہ صبر، حق اور ایمان پر ڈٹے رہنے میں ہے۔ جو شخص ان صفات کو اپناتا ہے، وہ نہ صرف خود کو بہتر بناتا ہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی مثال بن جاتا ہے۔

یوں دیکھا جائے تو سورۃ والعصر محض ایک قرآنی سورۃ نہیں بلکہ انسانی نفسیات اور زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے والا ایک جامع اصولی پیغام ہے۔ اس پیغام کو اپنی زندگی کا حصہ بنا کر ہم دنیا کے بدلتے حالات میں بھی ثابت قدم رہ سکتے ہیں اور ہر خوشی و غم کو اللہ کی طرف سے ایک آزمائش سمجھ کر صبر و شکر کے ساتھ قبول کر سکتے ہیں۔ یہی طرزِ عمل ہمیں حقیقی معنوں میں ایک پُر سکون اور کامیاب انسان بناتا ہے۔

سوشل میڈیا کا نشہ، اور قرآن کی رہنمائی

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں خبر رسانی کے مسئلے کو ایک حساس ترین سماجی اور دینی امر قرار دیا ہے۔ ایسی اطلاعات، جن میں خوف یا امن کی کیفیات چھپی ہوں، ایسی خبریں جن سے عوام کے ذہن میں اضطراب یا بے جا اطمینان پیدا ہو سکتا ہو، ان کے بارے میں قرآنِ حکیم نے واضح اصول بیان کیا ہے:

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا۔ (سورۃ النساء، آیت 83)

" اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے، تو فوراً اس کو پھیلا دیتے ہیں، حالانکہ اگر وہ اسے رسول اور اپنے میں سے اہلِ امر (حاکم یا ماہرین) کی طرف رجوع کر لیتے تو وہ لوگ جو ان میں سے نتیجہ اخذ کرنا جانتے ہیں، ضرور اس کی حقیقت جان لیتے۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے، سوائے چند لوگوں کے۔"

یہ آیت ایک نہایت گہرا اصول بیان کر رہی ہے: خبر سنتے ہی بغیر تحقیق کے اس کو پھیلانا صرف ایک اخلاقی خامی نہیں بلکہ ایک شیطانی طرزِ عمل ہے۔ اور یہ فطرتِ شیطانی انسان کو صرف تب لاحق ہوتی ہے جب وہ خدا کی رحمت و فضل سے دور ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں نہ کوئی خوفِ خدا باقی رہتا ہے، نہ غیرتِ دین۔

آج سوشل میڈیا پر بعض افراد جو مسلسل خبریں، ویڈیوز، بیانات، افواہیں، اور تبصرے پھیلاتے ہیں، وہ محض "اطلاع دینے" کا کام نہیں کر رہے، وہ اکثر اوقات ایک شعوری یا غیر شعوری طور پر دشمن کے ایجنڈے کو تقویت دے رہے ہوتے ہیں۔ مزاحمت کے محاذ پر لڑنے والوں، حق کی حمایت کرنے والوں، ظالموں کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کے بارے میں بے بنیاد یا وقت سے پہلے کی گئی خبریں دشمن کیلئے نفسیاتی جنگ کا ایندھن بن جاتی ہیں۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ سوشل میڈیا کے نشے نے بعض افراد کو مسلسل "کچھ نہ کچھ" بولنے اور لکھنے کا مریض بنا دیا ہے۔ انہیں یہ اضطرار لاحق ہوتا ہے کہ اگر وہ کچھ شیئر نہ کریں، کچھ اپڈیٹ نہ کریں، تبصرہ نہ کریں، تو گویا وہ موجود نہیں۔ یہ ایک بیمار ذہن کی علامت ہے جو اپنی شناخت کو فالوورز، لائکس، اور ٹرینڈنگ مواد کے ساتھ جوڑ چکا ہے۔ ایسے افراد کے ذہن میں حق و باطل، دوست و دشمن، خیر و شر کے امتیازات مٹ چکے ہیں، یا وہ ان کی اہمیت کو اپنی "آن لائن موجودگی" کی قیمت پر قربان کر چکے ہیں۔

ایسا شخص جو ہر خبر پر تبصرہ کرتا ہے، ہر ویڈیو فارورڈ کرتا ہے، ہر افواہ کو اپنی ذمہ داری سمجھ کر نشر کرتا ہے، وہ نہ صرف دین کے اصولوں سے غافل ہوتا ہے بلکہ درحقیقت وہ خود فکری غلامی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ وہی ذہن ہے جو دشمن کے میڈیا وار فیئر کا پہلا شکار بنتا ہے اور انجانے میں اس کا ہتھیار بن جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عوام کو بیدار کر رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ عوام کو مایوس، مضطرب اور کمزور کر رہا ہوتا ہے۔

ایسا طرزِ عمل اس وقت اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے جب یہ دینی یا مزاحمتی لباس میں لپٹا ہو۔ جو لوگ اہلِ بیتؑ کے ماننے والے ہیں، جو مزاحمت اور حق کی حمایت کے دعوے دار ہیں، ان کیلئے یہ طرزِ عمل کھلی خیانت ہے۔ کیونکہ وہ دشمن کے بیانیے کو اپنے ہاتھوں سے مزین کر کے عام کرتے ہیں، بغیر یہ سوچے کہ اس سے دشمن کو تقویت ملتی ہے یا کمزوری؟ بغیر اس کے کہ یہ خبر درست ہے یا غلط؟ اور بغیر اس کے کہ یہ کہاں، کس وقت، اور کس کے سامنے کہنی چاہیے؟

قرآن کہتا ہے کہ خبر پہلے اہلِ خبرہ کے پاس لے جاؤ، ان سے تصدیق کرو۔ اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو تم شیطان کی پیروی کر رہے ہو۔ یعنی خبر رسانی ایک عبادت اور امانت ہے، جس کی ادائیگی بھی بصیرت، تقویٰ اور علمی معیار کے تحت ہونی چاہیے نہ کہ جذبات، شہرت یا تبصروں کی بھوک کے تحت۔

اب ایسے افراد جو خود کو مزاحمتی فکر کا علمبردار سمجھتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ اپنی ہر پوسٹ، ہر شیئر، اور ہر تبصرے سے پہلے یہ سوچیں:

کیا میری یہ بات دشمن کو فائدہ دے سکتی ہے؟

کیا میں اپنے ہی لوگوں کے حوصلے تو نہیں توڑ رہا؟

کیا میں کسی غلط یا نامکمل خبر کو پھیلا کر ایک گناہ کا ذریعہ تو نہیں بن رہا؟

کیا مجھے ہر بات ہر کسی سے ہر وقت کہنی ہے، یا زمان و مکان کی بصیرت کی ضرورت ہے؟

جو شخص ان سوالات کے جواب میں لاپروائی برتے، وہ صرف ایک "سوشل میڈیا صارف" نہیں بلکہ دشمن کی چالوں کا نادان اتحادی ہے۔ اور اگر وہ پھر بھی خود کو دیندار، مخلص، اور باشعور سمجھتا ہے تو اسے قرآن کی اس آیت کو روز اپنے سامنے رکھنا چاہیے، تاکہ کم از کم شرمندگی کی وہ کیفیت پیدا ہو جو انسان کو فتنہ گری سے بچا سکے۔

کیونکہ یہ صرف باتوں کا معاملہ نہیں۔ یہ مسئلہ دین، مزاحمت، قوموں کی نفسیات اور سچائی کی ساکھ کا ہے۔ اور سچ کی حفاظت ہمیشہ خاموشی، بصیرت، تقویٰ اور تحقیق سے ہوتی ہے، بے تحاشہ بولنے سے نہیں۔

علم اور دانش بظاہر روشنی ہے، مگر یہ روشنی اگر باطل کے راستے کو روشن کرے، ظلم کے ہاتھ مضبوط کرے، یا حق کی راہوں میں رکاوٹ بنے تو وہی روشنی تاریکی بن جاتی ہے۔ کسی بھی

علم یا معلومات کا اصل معیار اس کا اخلاقی مصرف، اس کا وجودی مقصد، اور اس کا سمت نما ہونا ہے۔ اگر علم اور معلومات انسان کو اللہ، عدل، صداقت، اور حقیقت کی طرف رہنمائی نہ کرے بلکہ جھوٹ، فریب، دنیا پرستی، استکبار، اور استحصال کو جواز فراہم کرے تو ایسا علم نہ صرف بے کار ہے بلکہ حرام، مکروہ اور خطرناک بھی ہے۔ ایسی معلومات جو اگرچہ فکری لحاظ سے پُر کشش، فلسفیانہ اعتبار سے گہرائی رکھتی ہوں یا سائنسی و منطقی سطح پر متاثر کن معلوم ہوں، لیکن اگر وہ ایک طاغوتی نظام کے مفادات میں استعمال ہو رہی ہوں، اگر وہ مظلوموں کے خلاف، استعمار کے حق میں یا گمراہی کو مضبوط کرنے کیلئے پھیلائی جا رہی ہوں، تو وہ بذاتِ خود ایک فتنہ ہیں۔

اسلام میں علم کو عبادت کے درجے پر رکھا گیا ہے، مگر اس عبادت کا مرکز حق ہے۔ جب علم سے وابستہ نیت اور استعمال فاسد ہو جائے، جب کسی اطلاع، تحقیق یا فکری تجزیے کا نتیجہ حق کی کمزوری اور باطل کی تقویت بنے، تو وہ علم عبادت نہیں رہتا بلکہ وبالِ جان بن جاتا ہے۔ اس دنیا میں کتنے ہی اہلِ فکر، اہلِ دانش، اور اہلِ فن ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنی تمام تر ذہانت اور علمی بصیرت کو طاقتور ظالمین کی خدمت میں پیش کیا۔ ان کے خیالات نے قوموں کو تباہ کیا، انسانیت کو قتل کیا، اور صداقت کو مسخ کیا۔ ان کا گناہ ان ظالموں سے کم نہیں جنہوں نے تلوار یا توپ سے زمین پر ظلم کیا، کیونکہ انہوں نے فکری سطح پر ان ظلموں کو جواز دیا، ان کے اقدامات کو مہذب اور فطری ثابت کیا، اور سادہ دل عوام کو گمراہ کیا۔

قرآن اور اہل بیتؑ کی تعلیمات میں حق کے بغیر علم کو اندھا، بے کار اور مہلک قرار دیا گیا ہے۔ یہ اس لئے بھی ہے کہ علم بذاتِ خود کوئی خیر نہیں بلکہ اس کا اخلاقی رخ، استعمال، اور نیت طے کرتی ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اگر کوئی شخص سچ بول رہا ہے مگر وہ سچ ایک ایسے وقت، ایسے انداز اور ایسے مخاطب میں کہا جا رہا ہے جہاں اس کا فائدہ دشمن کو ہو اور ضرر حق والوں کو، تو وہ سچ جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہے۔ اسی لئے اسلامی تعلیمات میں کہا گیا ہے کہ ہر بات کہنے والی نہیں ہوتی، ہر سچ بولنے والا نہیں ہوتا، اور ہر دانش پھیلانے کے قابل نہیں ہوتی۔

یہ اصول خاص طور پر موجودہ دور میں اس وقت زیادہ اہم ہو جاتا ہے جب سوشل میڈیا، یونیورسٹیز، اور تھنک ٹینکس کے نام پر علم کی ایک سیلابی کیفیت ہر طرف پھیلائی جا رہی ہے۔ وہ نوجوان جو کچھ پڑھتے ہیں، سیکھتے ہیں، یا ان پر انکشاف ہوتا ہے، فوراً اس کو حق سمجھ کر اس کی تبلیغ میں لگ جاتے ہیں، جبکہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کے الفاظ اور نظریات کس کے ایجنڈے کو پورا کر رہے ہیں۔ بہت سے بظاہر سچے اور علمی جملے، جب ایک غلط سیاق و سباق میں رکھے جاتے ہیں، تو وہ فتنے کا سبب بن جاتے ہیں۔

اسی لئے امام علیؑ نے فرمایا: "كَلِمَةُ الحَقِّ يُرادُ بِها الباطِلُ" یعنی "حق بات کہی جاتی ہے مگر اس سے مراد باطل ہوتی ہے"۔ یہ وہی مقام ہے جہاں علم کو حرام کیا جاتا ہے، کیونکہ وہ گمراہی اور ظلم کا ایندھن بن جاتا ہے۔

پس ہر ذی شعور انسان کو، خاص طور پر وہ جو علم و دانش کا دعویٰ رکھتے ہیں، یہ سمجھنا ہو گا کہ علم کا اصل مصرف حق کی نصرت اور باطل کی رسوائی ہے۔ اگر علم، معلومات یا تحقیق اس کے برعکس کسی خدمت میں آ جائے تو وہ جتنی بھی دلکش ہو، جتنی بھی علمی و منطقی ہو، وہ شیطان کی زبان پر حق کا لبادہ ہے۔ اور اس کا نشر کرنا، اس کی تبلیغ کرنا، اس کو پھیلانا صرف اخلاقی غفلت نہیں بلکہ دینی خیانت اور انسانی جرم ہے۔

شادی، اولاد اور تربیت

دیر سے شادی یا جلد شادی، دونوں انسانی زندگی کے اہم فیصلوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے نتائج نہ صرف فرد کی ذات بلکہ اس کی نسل، خاندان، اور معاشرے پر بھی گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ اس موضوع کو اگر دینی، سماجی، نفسیاتی اور معاشی زاویوں سے دیکھا جائے تو حقیقت کے کئی پرت سامنے آتے ہیں جنہیں سادہ فیصلوں کے تناظر میں نہیں سمجھا جاسکتا۔

جلد شادی کو اسلام میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ جوانی وہ عمر ہے جب انسان کی فطری خواہشات اپنے عروج پر ہوتی ہیں اور اگر ان کا جائز راستہ مہیا نہ کیا جائے تو معاشرتی اور روحانی گراوٹ کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ نکاح کو فتنوں سے بچاؤ کا ذریعہ قرار دینا اس بات کی گواہی ہے کہ جلد شادی محض جسمانی تقاضے پورے کرنے کا نام نہیں بلکہ ایک روحانی، نفسیاتی اور سماجی تحفظ ہے۔ جلد شادی کا ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب اولاد پیدا ہوتی ہے تو والدین خود بھی جوان اور متحرک ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ بچوں کی پرورش میں بہتر طور پر شریک ہوسکتے ہیں، کھیل کود، تعلیم و تربیت، ذہنی ہم آہنگی، اور وقت دینے میں وہ توانائی رکھتے ہیں جو بڑھاپے میں کمیاب ہوتی ہے۔

تاہم جلد شادی کے ساتھ اگر شعور، ذمہ داری اور معاشی تیاری نہ ہو تو یہ خود ایک سنگین غلطی بن سکتی ہے۔ اگر انسان نہ خود کفیل ہو، نہ زندگی گذارنے کا سلیقہ جانتا ہو، نہ ہی باہمی تعلقات کو نبھانے کی حکمت رکھتا ہو تو وہ نہ صرف اپنی زندگی کو الجھالیتا ہے بلکہ اپنی اولاد کی زندگی میں بھی پیچیدگیاں بھر دیتا ہے۔ اس لیے صرف جلد شادی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ علم، ہنر، تربیت، اور فکری بلوغت کا ہونا ضروری ہے۔

دیر سے شادی کی بھی اپنی وجوہات ہو سکتی ہیں، جیسے تعلیم مکمل کرنا، مالی بنیادیں مضبوط کرنا، یا زندگی میں کسی خاص مقصد کی تکمیل۔ لیکن اگر دیر سے شادی کا مطلب یہ ہو کہ انسان اپنی فطری خواہشات کو دبائے، نفس پرستی کی طرف مائل ہو، یا جذباتی ٹھہراؤ کھو بیٹھے تو پھر یہ تاخیر نفس، جسم اور روح تینوں کے لیے مہلک بن سکتی ہے۔ دیر سے شادی کرنے والے والدین جب اولاد کی پرورش کے مرحلے میں آتے ہیں تو ان کے جسمانی اور ذہنی ذخائر کم ہونے لگتے ہیں۔ پینتالیس یا پچاس کی عمر میں پیدا ہونے والے بچوں کی عمر جب شعوری سطح پر داخل ہوتی ہے تو والدین اکثر یا تو بیمار، کمزور، یا زندگی کے اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہیں کہ نہ صرف جسمانی طور پر تھک جاتے ہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی تربیت کے لیے درکار استقامت بھی ماند پڑ چکی ہوتی ہے۔

تاہم یہاں بھی ایک توازن ہے۔ اگر دیر سے شادی کرنے والا جوڑا خود شعوری، علمی، فکری اور معاشی طور پر مستحکم ہو، تو وہ دیر سے ہونے والے بچے کو وہ تربیت اور رہنمائی دے سکتے

ہیں جو اکثر جلد شادی کرنے والے کم تجربہ کار والدین نہیں دے پاتے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ وقت، محبت، توجہ، علم اور روحانی اقدار کو بچوں کے اندر منتقل کریں۔

اصل مسئلہ نہ دیر سے شادی ہے نہ جلد شادی، اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کو کس قدر شعور، تقویٰ، اور عملی حکمت کے ساتھ چلاتا ہے۔ والدین کے لیے سب سے بڑا فریضہ صرف بچوں کو دنیا میں لانا نہیں بلکہ ان کی روحانی، نفسیاتی اور عملی تربیت ہے۔ انہیں دنیا کی دوڑ کا مسافر بنانے سے پہلے انسان اور بندۂ خدا بنانا ضروری ہے۔ بچوں کو پیسہ کمانے کے ہنر سکھانا اہم ہے، لیکن اس سے پہلے سچ بولنے، عزت سے جینے، حق کا ساتھ دینے، نفس کی خواہشوں پر قابو پانے، اور اللہ پر توکل کرنے کا شعور دینا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

اسی طرح بچوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی گذارنے کے فنون بھی سکھانا چاہیے، جیسے وقت کی قدر، محنت کی عزت، عاجزی، خودداری، شکر گزاری اور صبر۔ یہ سب باتیں صرف اسکولوں سے نہیں ملتیں بلکہ والدین کے عمل، انداز، طرزِ گفتگو اور روزمرہ زندگی سے بچے سیکھتے ہیں۔ اگر والدین خود علم و حکمت کے متلاشی ہوں، تو اولاد بھی سیکھنے والی بنے گی۔ اگر والدین خود خوش اخلاق، دیندار، سادہ مزاج اور سچائی پر قائم ہوں، تو اولاد بھی ان کے نقش قدم پر چلے گی۔

ایک بات پھر وہی ہے کہ شادی کب کی گئی، یہ سوال بعد کا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسان خود کو شوہر، بیوی، باپ یا ماں کے طور پر تیار کر چکا تھا؟ کیا اس کے پاس صرف پیسہ تھا یا ساتھ میں علم، بصیرت، ہنر اور اخلاق بھی تھا؟ کیونکہ جو اولاد دنیا میں آتی ہے، وہ صرف

گوشت پوست کی مخلوق نہیں بلکہ ایک امانت ہے، جس کا حساب روزِ قیامت بھی لیا جائے گا اور دنیا میں بھی اس کے اثرات نسل در نسل محسوس ہوں گے۔

صحیح وقت پر شادی اور اس کے ساتھ آنے والی ذمہ داریوں کی احسن ادائیگی دراصل انسان کو ایک باوقار، ذمہ دار، خاندانی اور فطری زندگی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ وہ طرزِ حیات ہے جو شیطانی استعماری نظام کے مفاد میں ہرگز نہیں کیونکہ یہ نظام انسان کو غیر فطری، فردیت زدہ، شہوت پرست، مادہ پرست، خود غرض اور جذباتی طور پر ٹوٹا ہوا رکھ کر اپنے استحصالی مقاصد حاصل کرتا ہے۔ شادی ایک ایسا فطری بندھن ہے جو انسان کو جنسی آزادی کے دھوکے، جذباتی افراتفری، بے مہار تعلقات، اور اخلاقی زوال جیسے جالوں سے نکال کر ایک پُرامن، بامقصد اور مرکزیت والی زندگی کی طرف لے جاتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو استعمار کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔

جب ایک نوجوان بروقت نکاح کر لیتا ہے، تو وہ جنسی بے راہ روی، زنا، فحاشی، اور معاشرتی انارکی سے بچ جاتا ہے۔ استعماری نظام کا ایک اہم ستون یہی ہے کہ نوجوان نسل کو جسمانی لذتوں، فلموں، سیریز، گیمز اور سوشل میڈیا کی لایعنی دنیا میں الجھا کر ان کے اندر کا قائد، سپاہی، مفکر اور مصلح دفن کر دیا جائے۔ صحیح وقت پر شادی اسی اندرونی استعداد کو محفوظ رکھتی ہے، اسے نکھارتی ہے، اور انسان کو سنجیدہ، کارآمد اور اجتماعی سطح پر مفید فرد بناتی ہے۔ ایک شادی شدہ مرد یا عورت جب اپنے خاندان، بیوی، شوہر اور بچوں کے لیے جیتا ہے تو وہ

اپنی ذات سے نکل کر دوسروں کی ذمہ داری اٹھاتا ہے، جو کہ استعمار کے "میں، میرا، مجھے" والے انفرادی خودپرستی کے فلسفے کی نفی ہے۔

استعمار کا ایک بڑا ہتھکنڈہ "ڈیٹ" کلچر، "آزاد محبت"، "سنگل زندگی"، اور "پہلے کیریئر بعد فیملی" جیسے نظریات کو فروغ دے کر شادی کو ایک بوجھ، قید اور غیر ضروری چیز بنا دینا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ انسان خاندان جیسی محفوظ اور مضبوط اکائی میں جڑے کیونکہ ایک مضبوط خاندان فرد کو خودمختار بناتا ہے، اور خودمختار فرد کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شادی ایک ایسا قلعہ ہے جو نہ صرف شیطان کی شہوانی یلغار سے بچاتا ہے بلکہ فرد کو عفت، حیاء، وفا، قربانی، اور تحفظ کے اصول سکھا کر روحانی و اخلاقی پختگی عطا کرتا ہے۔ جب انسان یہ صفات سیکھتا ہے تو وہ استعماری نظام کے بنائے ہوئے مصنوعی آئیڈیلز، لالچ، شہرت، عیش و عشرت، اور نفس پرستی کے جال سے آزاد ہو جاتا ہے۔

شادی کے بعد والدین بننے کا تجربہ، بچوں کی پرورش، ان کے لیے قربانی، ان کی تعلیم و تربیت میں حصہ لینا، اور خاندان کی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد کرنا انسان کو استعماری نظام کے بنائے ہوئے "تفریحی غلام" سے نکال کر ایک سنجیدہ معمارِ قوم بناتا ہے۔ جو انسان صبح سے شام تک صرف اپنی خواہشات کے لیے جیتا ہے، وہ کبھی نظام ظلم کے خلاف نہیں اٹھتا، لیکن جو اپنے خاندان، نسل، اور عقیدے کے لیے جیتا ہے، وہ اگر بیدار ہو جائے تو دنیا کو بدل سکتا ہے۔ یہی بیداری استعمار کے لیے خطرہ ہے۔

یوں صحیح وقت پر شادی اور اس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی نہ صرف انسان کو ذاتی طور پر محفوظ کرتی ہے بلکہ اسے استعمار کے بنائے ہوئے ان تمام فکری، نفسیاتی اور تہذیبی جالوں سے نکالتی ہے جو انسان کو اپنا غلام بنائے رکھنے کے لیے بچھائے گئے ہیں۔ شادی، اگر دینی شعور اور فطری اصولوں کے تحت ہو، تو یہ استعماری نظام کی سب سے بڑی شکست ہے، کیونکہ یہ انسان کو "میں" سے نکال کر "ہم" کی دنیا میں داخل کر دیتی ہے، اور یہی "ہم" وہ طاقت ہے جو دنیا کے فرعونوں کو لرزاں کر سکتی ہے۔

شعورِ حق کی علامتی زبان

شعر و ادب انسانی شعور کی وہ رفعت ہے جہاں الفاظ محض اظہار نہیں رہتے بلکہ احساسات، معانی، تہذیب اور باطن کی پرتیں بن جاتے ہیں۔ شاعری عقل اور وجدان کا وہ حسین امتزاج ہے جو انسانی ذہن کو نہ صرف الفاظ کی صورت میں تجربات کا جامہ پہناتا ہے بلکہ اس تجربے کو ایک ایسی معنوی فضا میں ڈھالتا ہے جہاں زبان وقت سے ماورا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری ہر زبان اور ہر تہذیب میں پائی جاتی ہے، اور اپنی فطری فکری گہرائی کے سبب ہر قوم کی روحانی و فکری شناخت بن جاتی ہے۔ فارسی ہو یا اردو، عربی ہو یا سنسکرت، ہر زبان میں شاعری نے انسانی تاریخ کی تہذیبی ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ عرب کے فصیح و بلیغ ماحول میں تو شعر گوئی کا مقام اتنا بلند تھا کہ قبیلے کی عزت و ذلت کا انحصار شاعر کی زبان پر ہوتا تھا۔ ان کے ہاں خطابت و فصاحت ہی ثقافتی برتری کا پیمانہ تھی۔ ایسے معاشرے میں قرآن مجید کا نزول ایک ایسا معجزہ تھا جس نے تمام اہلِ زبان کو چیلنج کر دیا۔ قرآن نے نہ صرف انہیں ان کی فصاحت و بلاغت میں زیر کیا بلکہ ان کی زبان کے اندر چھپے ہوئے معانی، استعارات، تماثیل اور تشبیہات کو ایسی الہامی جہت دی کہ جو پہلے کبھی نہ دیکھی گئی۔

قرآن اپنی صورت میں اگرچہ نثر ہے، مگر اس کے اسلوب میں وہ تمام فنی اور جمالیاتی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو کسی اعلیٰ درجے کی شاعری میں ہوتی ہیں۔ تشبیہ، کنایہ، استعارہ،

تمثیل، حسنِ تعلیل، تجرید، تجسیم، تضاد اور ایہام جیسے ادبی فنون قرآن میں ایسے برتے گئے ہیں کہ وہ صرف بلاغت کا نمونہ ہی نہیں بلکہ ایک فکری و روحانی بیداری کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ قرآن کی یہ ادبی عظمت ہی ہے جس نے اسے تاقیامت ایک زندہ کلام بنا دیا۔یہی وجہ ہے کہ اس کی آیات ہر دور پر منطبق ہو سکتی ہیں۔ جب ہم آج کے کسی ظالم کو فرعون کہتے ہیں، یا کسی مزاحمت کرنے والے کو موسیٰ، تو یہ صرف ایک مذہبی رجحان نہیں بلکہ قرآنی حکمت کا استعارہ ہے جو واقعات کو علامتی اور تمثیلی انداز میں پیش کر کے ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے۔

قرآن کے اس ادبی اسلوب نے زمان و مکان کی حدود کو توڑ کر اسے ہر دور کے انسان کے لیے زندہ و مؤثر بنا دیا۔ وہ واقعات جو ہزاروں سال پرانے تھے، وہ شخصیات جو ماضی کا حصہ بن چکی تھیں، ان کی کہانیوں کو قرآن نے ایسے انداز میں بیان کیا کہ وہ نہ صرف عبرت و ہدایت کا سبب بنیں بلکہ ہر زمانے میں اپنا عملی مظہر پیدا کرتی رہیں۔ فرعون صرف ایک شخص نہیں رہا بلکہ ظلم و تکبر کا استعارہ بن گیا، اور موسیٰ محض ایک نبی نہیں بلکہ حق گوئی اور استقامت کی علامت بن گیا۔یہی استعاراتی فکر انسان کو موجودہ دور کے حالات کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کی زبان ایک عام تاریخی کتاب کی زبان نہیں، بلکہ ایک زندہ حقیقت کی زبان ہے، جو ہر دور کو جھنجھوڑ سکتی ہے، ہر معاشرے کو آئینہ دکھا سکتی ہے۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی اہم ہے کہ قرآن کو وہی شخص درست طور پر سمجھ سکتا ہے جو ادب اور زبان کی باریکیوں سے واقف ہو۔ استعارات، کنایات اور تماثیل صرف لغوی علم سے

نہیں سمجھے جاسکتے، بلکہ ان کے پیچھے چھپی تہذیبی، تاریخی اور ادبی پس منظر کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص ادب سے نابلد ہوتا ہے تو وہ قرآن کے اس فکری حسن اور حکمت کو نہیں سمجھ پاتا۔ وہ ان آیات کو صرف واقعات کی ایک سیریل سمجھ کر پڑھتا ہے، نہ کہ ایک ایسی تمثیلی حقیقت کے طور پر جو اس کے دور پر بھی منطبق ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص میں ذوقِ ادب، فہمِ زبان اور شعورِ تمثیل نہیں ہوتا، وہ قرآن کی استعاراتی گہرائیوں میں اتر ہی نہیں سکتا۔ وہ محض ترجمے کی سطح پر رکتا ہے، جہاں نہ جذبہ ہوتا ہے نہ وجدان۔

قرآن کی زندہ معنویت کا راز ہی اس کے ادبی اسلوب میں ہے۔ اسی لیے اہلِ ادب ہمیشہ قرآن سے قریب رہے ہیں۔ مولانا روم ہوں یا حافظ، غالب ہوں یا اقبال، ان سب کی شاعری میں قرآنی استعارات کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں فرعون، موسیٰ، یوسف، یعقوب، ابراہیم، نمرود اور دیگر قرآنی شخصیات صرف تاریخی کردار نہیں بلکہ ایک فکری و باطنی معانی کی علامتیں ہیں۔ یہی قرآنی تماثیل اور استعارات ہی ہیں جنھوں نے اسلامی فکر کو علامتی، فکری اور جمالیاتی بنیاد فراہم کی ہے۔ چنانچہ قرآن نہ صرف عقیدے کی کتاب ہے بلکہ فکری اور ادبی حیات کا سرچشمہ بھی ہے۔

لہٰذا شعر و ادب اور قرآن کے تعلق کو محض ایک ظاہری مماثلت کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہ تعلق دراصل ایک فکری و روحانی رشتہ ہے جس نے قرآن کو ہر زمانے کے لیے زندہ رکھا ہے۔ اور یہی وہ پہلو ہے جو انسان کو نہ صرف اپنے ماضی سے جوڑتا ہے بلکہ اسے

حال کے مسائل کو سمجھنے اور مستقبل کی سمت متعین کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔ قرآن کا یہ جمالیاتی پہلو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ صرف قانون، عبادت اور عقائد ہی دین نہیں بلکہ احساس، تخیل، حکمت اور حسن بھی دین کا حصہ ہیں۔ اور یہی چیز اسے ابدی اور آفاقی بناتی ہے۔

لہذا جب ہم قرآن کریم کی زبان، اسلوب، اور طرزِ بیان کو گہرائی سے دیکھتے ہیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن محض ایک تاریخی کتاب نہیں، بلکہ ایک زندہ اور ہمہ وقت فعال ہدایت نامہ ہے۔ اس کی تمثیلی زبان، اس کے استعارے، تشبیہات، کنائے اور علامات ہمیں صرف ماضی کی خبریں نہیں دیتے بلکہ حال کو سمجھنے اور مستقبل کی رہنمائی کرنے کا زاویہ بھی عطا کرتے ہیں۔ قرآن جن شخصیات، واقعات اور حق و باطل کے تصادمات کو بیان کرتا ہے وہ اپنے زمانے کی ایک مخصوص شکل تو رکھتے ہیں، مگر ان کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ ہر دور میں مختلف اشکال کے ساتھ ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعثتِ پیغمبرؐ کے بعد جو سچائی و باطل کی جنگ برپا ہوئی، جس میں ابو جہل، ابو لہب، یزید، فرعون جیسے کردار سامنے آئے، اور ان کے مقابلے میں پیغمبرؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ اور دیگر اہلِ حق نے جو موقف اپنایا، وہ ایک ابدی اصول کی صورت میں ہم تک پہنچا۔

جب ہم جدید دور میں کسی جابر، فاسق، فاجر اور استبداد پر مبنی حکومت یا نظام کو دیکھتے ہیں تو فطری طور پر اسے قرآن و تاریخ کی روشنی میں پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کسی جابر کو "آج کا یزید" کہا جاتا ہے یا کسی حق پرست کو "آج کا حسین"، تو یہ کوئی شخصی یا ذاتی تشبیہ نہیں ہوتی بلکہ ایک تمثیلی انداز ہے جس کے ذریعے ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح

کربلا میں دو نظریات اور دو راستے آمنے سامنے تھے، اسی طرح آج بھی حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔ حسینؑ کی انفرادیت، علیؑ کی شجاعت، فاطمہؑ کا وقار، زینبؑ کی خطابت، یہ سب ایسی صفات ہیں جو مکمل صورت میں کسی اور میں جمع نہیں ہو سکتیں، لیکن اگر کوئی شخص ان میں سے کسی صفت کو اپنے عمل میں لے آئے، تو اس کے کردار میں اُس عظیم ہستی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

اسے نہ تو گستاخی سمجھا جا سکتا ہے، نہ غلو، اور نہ ہی شخصیت پرستی۔ بلکہ یہ وہی قرآنی طریقہ ہے جو فرعون کے واقعے کو بیان کرتا ہے تاکہ ہم ہر دور کے فرعون کو پہچان سکیں۔ اگر ہم یہ نہ سمجھیں کہ قرآن کی تمثیلی زبان ایک جاری و ساری حقیقت ہے تو اس کے معانی جامد ہو جائیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن، اپنے واقعات کی تکرار کے ذریعے ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ حالات بدل سکتے ہیں، زمانے بدل سکتے ہیں، چہرے اور لباس بدل سکتے ہیں، مگر کردار اور فکری رویے وہی رہتے ہیں۔ یزید کوئی مخصوص انسان نہیں بلکہ ایک رویہ ہے، ایک طرزِ فکر ہے، ایک مزاج ہے جو ہر زمانے میں مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ اسی طرح حسینؑ محض ایک شخص نہیں بلکہ ایک صدائے احتجاج، ایک صبر، ایک قربانی اور ایک الٰہی مزاحمت کی علامت ہے۔

اسی وجہ سے جب کوئی آج کے مظلوم کو "وقت کا حسین" کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس مظلوم کو حسین بنانا چاہتا ہے یا معصوم کے مرتبے پر فائز کرتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے حسینؑ کی اس صفت کو اپنا لیا ہے جو ظلم کے سامنے خاموش نہ

رہنے کی ہے۔ اور جب کسی جابر کو "وقت کا یزید" کہا جاتا ہے تو اس سے مراد اس کے عمل اور کردار کی مماثلت ہوتی ہے، نہ کہ شخصی برابری۔ یہی قرآن کا تعلیم دیا ہوا شعور ہے، جو ہمیں ماضی کو حال سے جوڑنے کی اجازت دیتا ہے تاکہ ہم کبھی ماضی سے سبق لینا ترک نہ کریں، اور نہ ہی تاریخ کو محض پرانی کہانیوں کا مجموعہ سمجھ کر دفن کر دیں۔

یہی سبب ہے کہ اہلِ بیتؑ کی سیرت، ان کے قیام، ان کی خاموشی، ان کا احتجاج، ان کی دعا، ان کی حکمت، ہر چیز کو ہم آج بھی اپنے حالات پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی زندگیوں کو فقط جذباتی مرثیوں یا نعتیہ کلام کے ذریعے یاد کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان کی تمثیلی حیثیت کو سمجھنا، ان کے کردار کو بطور اصولِ حیات دیکھنا ضروری ہے۔ جب ہم کسی کو وقت کا علیؑ کہتے ہیں تو اس کی اصل روح یہ ہوتی ہے کہ جس طرح علیؑ نے عدل، حکمت، فہم، شجاعت اور قربانی کو جمع کیا، اسی طرح آج کوئی شخص اگر ان صفات کی جھلک اپنے وجود میں پیدا کرے، تو وہ بھی ایک علیؑ کی طرح ظلم کے مقابل کھڑا ہو سکتا ہے۔

لہٰذا یہ تماثیل محض الفاظ کی بازی گری نہیں بلکہ ایک فکری ورثہ ہے جو ہمیں قرآن اور سیرتِ نبویؐ و علویؑ نے عطا کیا ہے۔ یہ وہ فکری ورثہ ہے جس کی بدولت قرآن تا قیامت زندہ ہے اور اہلِ بیتؑ کی حیات کا ہر لمحہ آج بھی ہم میں جاری و ساری ہے، شرط یہ ہے کہ ہم ان استعاروں، تماثیل اور کنایات کو سمجھیں، اور انہیں اپنے زمانے پر اطلاق دینا سیکھیں۔ یہی طریقہ ہمیں تاریخ کو فہم میں رکھنے اور حال میں حق کو پہچاننے کی راہ دکھاتا ہے۔

شعور، خودی اور ظہورِ امامؑ

انسانی زندگی بظاہر واقعات، افراد اور خارجی حالات کے درمیان گزرتی ہے، لیکن حقیقت میں اس کی اصل زندگی اس کی باطنی کیفیت، شعوری حالت، اور نظریۂ حیات پر منحصر ہے۔ وہ جیسے سوچتا ہے، ویسے ہی دیکھتا ہے، اور جیسے دیکھتا ہے، ویسے ہی جیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر انسان اپنی مشکلات کا سبب دوسروں کو سمجھتے ہیں، اور اپنے احساسات و ردعمل کو بھی دوسروں کے ہاتھوں گروی رکھ دیتے ہیں۔ وہ خود کو زمانے، معاشرے، حکومت، یا قسمت کا شکار مانتے ہیں، اور اپنی داخلی قوتوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔

یہی لاشعوری حالت ہمیں ایک "ری ایکٹیو (reactive) "طرزِ زندگی کی طرف لے جاتی ہے، جہاں ہم صرف واقعات پر ردعمل ظاہر کرتے ہیں، ان پر اثر نہیں ڈالتے۔ لیکن جیسے ہی انسان اپنے شعور کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اپنی سوچوں اور جذبات کو دیکھنے لگتا ہے، وہ ایک نئے راستے پر قدم رکھتا ہے۔ یہ راستہ ردعمل سے شعور کی طرف، بیرونی الزام سے اندرونی احتساب کی طرف، اور اندھیرے سے نور کی طرف لے جاتا ہے۔

امام زمانہؑ کے منتظرین کے لیے یہ شعوری بیداری محض ایک نفسیاتی مشق نہیں بلکہ ایک دینی، فکری اور روحانی فریضہ ہے۔ چونکہ ظہورِ امامؑ عدلِ کامل اور شعورِ کامل کا ظہور ہے، تو اس کا انتظار صرف خارجی انقلاب کی آرزو نہیں بلکہ اپنے اندر اس انقلاب کو لانے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو انسان امامؑ کے ظہور کی حقیقی تیاری کرنا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے اپنے "نفس" پر قابو پانا ہوتا ہے۔

انسان جب باطل کے خلاف جدوجہد کے لیے میدان میں اترتا ہے — خواہ وہ تعلیم ہو، سیاست ہو، معیشت ہو، میڈیا ہو یا مذہب — تو اگر اس کی نیت پاک نہ ہو، اس کا نفس غیر تربیت یافتہ ہو، اور اس کا شعور ناپختہ ہو، تو وہ لاشعوری طور پر انہی اقدار کو دہراتا ہے جن کے خلاف وہ لڑ رہا ہوتا ہے۔ چنانچہ ظلم کے خلاف کھڑا ہونے والا خود ظلم پر اتر آتا ہے، باطل کے خلاف بولنے والا خود فریب دہی اور نفرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ یہاں سے ایک نئی ذمہ داری شروع ہوتی ہے: نفس کا مشاہدہ، نیت کی اصلاح، جذبات کی تربیت، اور ردِ عمل کو شعوری عمل میں بدلنا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان سمجھتا ہے کہ دنیا اس کے باطن کا عکس ہے۔ جب وہ اندر سے مایوس، مشتعل، یا خود پسند ہوتا ہے، تو وہ ہر شے کو خطرہ محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اپنے اندر امن، یقین، محبت اور رضائے الٰہی کی کیفیت پیدا کرتا ہے، تو دنیا اس کے لیے ایک نورانی امکان بن جاتی ہے۔ لوگوں، حالات، اور وقت کے بارے میں اس کا رویہ بدل جاتا ہے — اور چونکہ رویہ ہی حقیقت کو متعین کرتا ہے، اس لیے اس کی دنیا بھی بدل جاتی ہے۔

امامؑ کا ظہور ایک خارجی حقیقت ہے جس پر ہمارا ایمان ہے، لیکن یہ خارجی ظہور ایک اجتماعی داخلی بیداری کا نتیجہ ہے۔ جب تک افراد کے دلوں میں ظلم، دنیا پرستی، نفس پرستی، حسد، تکبر اور غفلت قائم ہے، امام کا ظہور صرف ایک نعرہ ہے۔ لیکن جب انسان اپنی زندگی کو "امر بالمعروف و نہی عن المنکر"، "جہاد بالنفس"، "عبادت کے خلوص"، "عدل کی ترویج" اور "خدا پر کامل توکل" کے سانچے میں ڈھالنا شروع کرتا ہے، تو وہ ظہورِ امامؑ کے راستے میں ایک حقیقی کردار ادا کرنے لگتا ہے۔

یہ کردار صرف نظریاتی نہیں بلکہ عملی ہوتا ہے۔ جب ایک نوجوان تعلیم کو امامؑ کے نور کے تحت علمِ نافع کے طور پر دیکھتا ہے، جب ایک معلم اپنے شاگرد کو ایک مؤمنِ منتظر کے طور پر تیار کرتا ہے، جب ایک سیاستدان دنیاوی مفاد کے بجائے امامؑ کے عدلِ مطلق کو بنیاد بنا کر فیصلے کرتا ہے، جب ایک صحافی سچ اور خیر کی ترجمانی کو اپنا ہدف بناتا ہے، جب ایک تاجر حلال کمائی اور انصاف کے اصولوں پر چلتا ہے، تب ہر شعبہ خود ایک "ارضِ انتظار" میں بدل جاتا ہے۔

مگر یہ سب ایک دن میں نہیں ہوتا۔ انسان کی سوچ، احساسات اور طرزِ عمل اس کے بچپن کے تجربات، سماجی رویوں، تعلیمی اثرات اور ذاتی حادثات سے مشروط ہوتے ہیں۔ ان تمام اثرات نے اس کے اندر ایک "لاشعوری نظام" تشکیل دیا ہوتا ہے جو خود کو مسلسل دہراتا ہے۔ یہی وہ conditioning ہے جو اسے محدود رکھتی ہے، اور بار بار نفس کے چکر میں گھما دیتی ہے۔ اس conditioning کو توڑنے کے لیے انسان کو "مشاہدہ" سیکھنا ہوتا

ہے۔ یعنی وہ اپنی سوچوں، جذبات، رویوں، خواہشات، اور خوف کو باہر سے دیکھے — بغیر جج کیے، بغیر ردعمل دیے، صرف دیکھے۔

یہی مشاہدہ، مراقبہ، عبادت اور محاسبہ کا اصل مقصد ہے۔ جب انسان دن میں کئی بار رک کر اپنے باطن کو دیکھتا ہے — کہ وہ کس حالت میں ہے، کس نیت سے عمل کر رہا ہے، کس احساس سے بات کر رہا ہے — تو وہ آہستہ آہستہ reactive mode سے باہر آنا شروع ہوتا ہے۔ وہ "عمل" کرنے لگتا ہے، "ردعمل" نہیں۔ اور یہی عمل، امامؑ کے ظہور کے راستے کا پہلا عملی قدم ہے۔

بالآخر انسان اس حقیقت تک پہنچتا ہے کہ اسے کسی مقام پر پہنچنے کی ضرورت نہیں، کسی کو شکست دینے کی ضرورت نہیں، نہ ہی خود کو ثابت کرنے کی۔ اسے بس "ہونا" ہے — وہ ہونا جو اللہ نے اسے بنایا، ایک باشعور، باہمت، با اخلاق، نورانی انسان جو ظلمت کے دور میں روشنی کا سفیر ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنے "نفس" کو نہیں بلکہ اپنی "خودی" کو پہچانتا ہے۔ اور جیسا کہ حدیث ہے ": من عرف نفسہ فقد عرف ربہ" — جو اپنے نفس کو پہچان لے، وہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے۔

اور جو اپنے رب کو پہچان لے، وہ اپنے امام کو بھی پہچان لیتا ہے — کیونکہ امام، خدا کی حجت ہے۔ اور جو حجتِ الٰہی کو پہچان لیتا ہے، وہ اس کے کارواں کا حصہ بننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

یہی شعور، یہی خودنگری، یہی محبت، اور یہی مجاہدہ، ظہور کی وہ بنیاد ہے جس پر ایک نئی دنیا کی عمارت کھڑی ہونی ہے — اور اس بنیاد کا پہلا پتھر انسان کا دل ہے۔

صہیونیت کے مفاد میں کام کرنے والی عالمی ادارے

صہیونی استعمار کی حکمت عملی محض زمینوں پر قبضہ یا فوجی برتری حاصل کرنے تک محدود نہیں، بلکہ اس کی بنیاد ایک عالمی ذہنی، قانونی، معاشی اور ثقافتی تسلط پر ہے جس کے ذریعے پوری دنیا میں ایک ایسا نظم قائم کیا جاسکے جو اسرائیل کے مفادات، یہودی اشرافیہ کے تسلط اور ان کے حلیف مغربی ممالک کے استعماری مقاصد کو تحفظ فراہم کرے۔ اس مقصد کے لیے صہیونی استعمار نے مختلف عالمی ادارے تشکیل دیے، یا پہلے سے موجود اداروں کو اپنے نظام میں ضم کر لیا۔ ان اداروں کا کردار بظاہر ترقی، تعاون، قانون، حقوقِ انسان، تعلیم یا سائنس کے فروغ کے نام پر ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ادارے مخصوص طاقتوں کے منصوبوں کی تکمیل میں براہِ راست یا بالواسطہ مدد دیتے ہیں۔

اقوام متحدہ (United Nations) کی تشکیل جنگ عظیم دوم کے بعد ایک پر امن عالمی نظام کے قیام کے لیے کی گئی، لیکن اس کی ساخت اور طاقت کی تقسیم بذاتِ خود ایک استعماری تقسیم تھی۔ سلامتی کونسل کے مستقل ارا کین کو ویٹو کا اختیار دے کر واضح کر دیا گیا کہ دنیا کی اصل حکمرانی انہی کے ہاتھ میں رہے گی۔ اسرائیل کے قیام سے لے کر فلسطینیوں پر جاری مظالم، بیت المقدس کی حیثیت، غزہ پر جنگی جرائم، اور لاکھوں پناہ گزینوں کی واپسی جیسے مسائل پر اقوام متحدہ کی خاموشی یا بے بسی اس بات کی واضح دلیل ہے

کہ یہ ادارہ صہیونی استعمار کے خلاف نہیں جا سکتا، کیونکہ اس کے فیصلے انہی طاقتوں کے ہاتھ میں ہیں جو اسرائیل کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

عالمی مالیاتی ادارے جیسے ورلڈ بینک (World Bank) اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (IMF) بھی اسی نظام کے اہم ستون ہیں۔ یہ ادارے بظاہر غریب ممالک کو قرض فراہم کرتے ہیں تاکہ وہ معاشی ترقی کر سکیں، لیکن حقیقت میں ان کا قرض اور اس کے ساتھ منسلک شرائط اس قدر پیچیدہ، سودی اور استعماری ہوتے ہیں کہ وہ کسی بھی ملک کی خودمختاری کو دیمک کی طرح چاٹ لیتے ہیں۔ ان قرضوں کے ذریعے نجکاری، لبرل اکنامی، درآمدی انحصار، زرعی بربادی، مزدور دشمن پالیسی اور مقامی صنعتوں کی تباہی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ ان کے ذریعے قومی بجٹ، ٹیکس پالیسی، سبسڈی، اور تعلیمی و سماجی نظام پر بھی اثر ڈالا جاتا ہے۔ یہ تمام اقدامات بالآخر ایک ایسے نظام کو فروغ دیتے ہیں جس میں سرمایہ دار اشرافیہ کو فائدہ اور عوام کو غلامی ملتی ہے، جبکہ اسرائیل جیسے ریاستیں طاقتور معیشتوں کی چھتری تلے آزادانہ ہر جرم کر سکتی ہیں۔

یونیسکو، یونیسف، ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (WHO)، اور دیگر اقوام متحدہ سے منسلک ادارے بھی اکثر اپنی اصل بنیاد سے ہٹ کر مخصوص ایجنڈوں کی تکمیل میں مصروف نظر آتے ہیں۔ تعلیم، صحت، اطفال اور ثقافت کے شعبوں میں ان اداروں کی پالیسیاں بڑی حد تک مغربی نظریات، جنسی آزادی، فیملی سسٹم کی تحلیل، اور مذہب بیزاری کو فروغ دیتی ہیں۔ اسرائیل کے نصاب، فلسطینی بچوں کے قتل، غزہ میں صحت کی سہولیات کی بندش، یا

اسرائیلی اسکولوں میں نسل پرستی کی تعلیم پر یہ ادارے کبھی سنجیدہ ردِ عمل نہیں دیتے۔ یہ خاموشی بتاتی ہے کہ ان کا کردار بھی کسی حد تک استعماری منصوبے کے زیرِ اثر ہے۔

انٹرنیشنل کریمنل کورٹ (ICC) اور انٹرپول جیسی قانونی ادارے بھی بظاہر عدل و انصاف کے عالمی ادارے ہیں، لیکن ان کی کارروائیاں بتاتی ہیں کہ ان کا نشانہ عموماً وہ ممالک بنتے ہیں جو استعماری ایجنڈے کے مخالف ہوں، مثلاً افریقی ممالک، مشرق وسطیٰ کی مزاحمتی تحریکیں یا آزاد سوچ رکھنے والے قائدین۔ اسرائیل کے جنگی جرائم پر یہ ادارے ہمیشہ نرم یا خاموش رہتے ہیں جبکہ فلسطینیوں یا لبنانیوں کو بآسانی دہشتگرد قرار دے دیا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ نوبیل انعامات، بین الاقوامی انسانی حقوق کی تنظیمیں، میڈیا نیٹ ورکس، ٹیکنالوجی کمپنیز، اور تعلیمی ادارے جیسے ہارورڈ، اسٹینفورڈ، یا آکسفورڈ بھی اس نظام کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان کی فنڈنگ، تحقیقی موضوعات، پالیسی سازی اور عالمی بیانیہ تخلیق کرنے کے انداز میں واضح جھکاؤ نظر آتا ہے۔ اسرائیلی سائنسدانوں کو نوبیل انعامات سے نوازا جاتا ہے، لیکن فلسطینی مظلوموں کو "شدت پسند" یا "ریڈیکل" کہہ کر عالمی ذہنوں کو مسخ کیا جاتا ہے۔

یہ پورا عالمی نظام ایک گلوبل ورلڈ آرڈر کے تحت کام کرتا ہے جس میں طاقت کا توازن اسرائیل، امریکہ اور ان کے سرمایہ دار اتحادیوں کے پاس ہے۔ اس نظام میں جو بھی قوم، تحریک، دانشور، یا ادارہ آزادی، مزاحمت، مذہب یا سماجی عدل کی بات کرے، وہ یا تو دبا دیا

جاتا ہے، خرید اجاتا ہے، یاد ہشت گردی کے زمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ان تمام اداروں کا باہمی ربط، ان کی پالیسیوں کا ہم آہنگ ہونا، اور ان کا عملی طور پر اسرائیل کے حق میں استعمال ہونا، اس بات کی شہادت ہے کہ صہیونی استعمار محض ایک سیاسی وجود نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر، نظریاتی اور ساختیاتی نظام ہے جو عالمی اداروں کے اندر رچا بسا ہے۔

لہٰذا جب ہم عالمی سیاست، معیشت یا ثقافت کی بات کرتے ہیں، تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ محض چہروں، الفاظ یا قوانین سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ ان اداروں کی اصلیت کو اس زاویے سے دیکھنا چاہیے کہ وہ کس کے مفاد میں کام کرتے ہیں، اور ان کی خاموشی اور سرگرمی کس ظلم یا انصاف کی گواہی دے رہی ہے۔ یہ فکری بیداری ہی وہ پہلا قدم ہے جو استعمار کے جال کو توڑنے، مظلوم اقوام کو متحد کرنے، اور ایک حقیقی عادلانہ عالمی نظم کے قیام کی طرف لے جاسکتا ہے۔

صہیونیت، ایران اور اسلام

تاریخ کے صفحات پر اگر کسی قوم کا نام سب سے زیادہ خوں آشام، حق غاصب، اور الٰہی ہدایت کے دشمن کے طور پر لکھا گیا ہے تو وہ بنی اسرائیل کی وہ یہودیت ہے جس نے نہ صرف انبیائے الٰہی علیہم السلام کو شہید کیا بلکہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اہل بیت علیہم السلام کے حقوق کو غصب کرنے اور ان کے قتل میں بنو امیہ و بنو عباس جیسے سفاک گروہوں کو اپنا آلہ کار بنایا۔ یہی وہ اصل ہے جس پر زیارت عاشورا میں "أَسَّس أساس الظلم والجور" کے الفاظ کے ساتھ لعنت کی گئی، کیونکہ ظلم کی بنیاد اسی فکر نے ڈالی جو خدا کے نور سے بیزار اور باطل کے تسلط کی پجاری تھی۔ یہ وہی فتنہ پرور قوت ہے جو آج بھی عالمی استعماری طاقتوں کے پردے میں چھپی ہوئی انسانیت کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھے ہوئے ہے۔

ایران اور صہیونیت کے مابین جاری حالیہ جنگ کوئی معمولی جغرافیائی تنازعہ یا محض ریاستوں کے باہمی مفادات کا ٹکراؤ نہیں، بلکہ یہ تاریخ، عقیدہ، اور انسانیت کے مستقبل کی لڑائی ہے۔ یہ وہ معرکہ ہے جس میں ایک طرف وہ عالمی سامراج کھڑا ہے جس کی بنیاد حرص، کرپشن، قتل و غارت اور استحصال پر ہے، اور دوسری طرف وہ مکتب ہے جس کی رگوں میں حسین ابن علیؑ کا لہو ہے، جو ظلم کے مقابلے میں جھکنے کو موت اور سر کٹانے کو حیات سمجھتا

ہے۔ اس جنگ میں اگر ایرانی اسلامی انقلابی حکومت شکست کھاتی ہے یا سرنگون ہوتی ہے تو یہ صرف ایک سیاسی نظام کا خاتمہ نہیں ہوگا بلکہ اس کے اثرات تمام عالمِ اسلام اور بالخصوص ملت تشیع کی روحانی، فکری، اور مزاحمتی بیداری پر تباہ کن انداز میں پڑیں گے۔ یہ شکست تشیع کی نہیں بلکہ اس فلسفۂ حیات کی ہوگی جو ظلم کے مقابل حق کے قیام کا نام ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس سے صہیونی استعمار سب سے زیادہ خائف ہے۔

عالمی صہیونی قوتیں بخوبی جانتی ہیں کہ اگر دنیا میں کوئی ایسا نظریہ باقی ہے جو ان کے سرمایہ دارانہ، استحصالی اور فاسد عالمی نظام کو حقیقی خطرہ دے سکتا ہے تو وہ مکتبِ تشیع ہے، اور اس مکتب کا زندہ مظہر انقلابِ اسلامی ایران ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سامراج مخالف بہت سے بڑے نام جیسے ذوالفقار علی بھٹو، شاہ فیصل، صدام حسین، اور معمر قذافی جیسے غیر شیعہ رہنما بھی اپنی سطح پر استعماری قوتوں کے مقابل اُٹھے، مگر چونکہ ان کی بنیاد کسی الٰہی فکر پر استوار نہ تھی، ان کی تحریکیں شخصی یا قوم پرستانہ تھیں، اور ان کے پیچھے عوامی سطح پر عقیدے کی وہ گہرائی نہ تھی جو انقلاب اسلامی ایران کو حاصل ہے، اس لیے وہ سب ایک ایک کر کے یا تو ختم کیے گئے یا ناکام ہوئے۔

مگر امام خمینیؒ کی قیادت میں جو انقلاب آیا وہ صرف حکومت کی تبدیلی نہ تھی، وہ ایک نظریاتی فکری، روحانی اور تہذیبی انقلاب تھا۔ اس کا مقصد صرف ایک قوم کی آزادی نہیں بلکہ پوری امتِ مسلمہ، اور اس سے بھی بڑھ کر تمام مستضعفینِ عالم کی نجات تھی۔ یہ انقلاب ایک ایسی روحانی اور فکری کمانڈ سنٹر میں بدل گیا جو آج دنیا بھر میں مزاحمتی گروہوں کو

قوت، تشخص اور ہمت دیتا ہے۔ چاہے وہ حزب اللہ ہو، انصار اللہ ہو، عراق کی حشد الشعبی ہو، فلسطین کی مزاحمت ہو یا کشمیر کے نوجوان، سب کے دل میں ایک الہامی امید کی چنگاری اسی نورِ ولایت سے روشن ہے۔ اس انقلاب کی سب سے بڑی طاقت اس کے پیچھے چھپی ہوئی وہ نظریاتی گہرائی ہے جس کا مظہر عزاداریِ سید الشہداءؑ ہے۔ یہی عزاداری ہے جو ظلم کے خلاف فطری بغاوت کو عبادت بنا دیتی ہے، یہی وہ طاقت ہے جو آنسوؤں کو تحریک میں اور مصیبت کو مقصد میں بدل دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن سب سے پہلے اسی عزاداری، اسی مکتبِ حسینؑ، اور اسی شعورِ کربلا کو نشانہ بناتا ہے تاکہ ملت کے حوصلے، فکری استقامت، اور جذبۂ قربانی کو کمزور کیا جاسکے۔

اگر ایران کے اسلامی نظام کو زمین بوس کیا گیا تو دشمن یقیناً پوری قوت کے ساتھ اس نظریاتی و روحانی قلعے پر حملہ آور ہوگا، وہ فقط ایران پر نہیں رکے گا، بلکہ وہ عزاداری کے خلاف عالمی سطح پر مہم چلائے گا، مراجع کرام کے خلاف بدگمانیاں پھیلائے گا، تشیع کی مزاحمتی تاریخ کو مسخ کرے گا، اور ملت کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرے گا کہ یہ راہ شکست کی راہ ہے، اور اب صلح، نرمی، اور مغرب سے ہم آہنگی ہی نجات کا راستہ ہے۔ اگر خدانخواستہ ملت اس دامِ فریب میں آگئی تو نہ صرف تشیع بلکہ تمام مسلم اقوام کئی دہائیوں تک اپنی خودی، مزاحمت اور نجات کی امید سے محروم ہو جائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج جو جنگ تہران کی گلیوں میں لڑی جارہی ہے، وہ درحقیقت ہر اُس شخص کی جنگ ہے جو دنیا میں عدل، آزادی، عزت اور دین کی سربلندی چاہتا ہے۔

لہٰذا آج عالمِ تشیع پر، اور بالعموم تمام مسلمان و مستضعف اقوام پر یہ شرعی، اخلاقی، اور تاریخی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف زبان و دل سے انقلابِ اسلامی کی حمایت کریں بلکہ اسے عملی طور پر بھی کامیاب اور قائم رکھنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ چاہے وہ میڈیا کے محاذ پر ہو، فکری میدان میں ہو، سیاسی بیداری کی شکل میں ہو، یا اقتصادی و ثقافتی جہاد کے ذریعے، یہ وقت انفرادی مفادات، فرقہ وارانہ حدود، اور قومی تعصبات کو پسِ پشت ڈالنے کا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں امت کو خود سے بلند ہو کر ایک عالمی نظامِ عدل کے تصور کے ساتھ جُڑنا ہو گا۔ جو بھی آج اس انقلاب کو تنہا چھوڑے گا، وہ کل اپنے ہی ایمان، آزادی، اور عزت کے لیے کوئی آواز اٹھانے کے قابل نہیں رہے گا۔

یہ معرکہ فقط ایران یا اسرائیل کا نہیں، بلکہ یہ پوری انسانیت کے مستقبل کا تعین کرنے والا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا ظلم، سرمایہ دارانہ چنگل، اور سامراجی جبر سے نجات پائے تو ہمیں آج اس علم کو بلند رکھنا ہو گا جس پر "یا حسینؑ" لکھا ہے، اور جس کی بنیاد "لا نُعطِیَنَّ یدَ الذلّۃ" پر ہے۔ یہی وہ پرچم ہے جو ہر دور کے فرعونوں، نمرودوں، اور یزیدوں کو للکارنے کی طاقت رکھتا ہے، اور جس کے نیچے جمع ہونے والا کبھی شکست خوردہ نہیں کہلاتا بلکہ تاریخ میں ہمیشہ سرخرو لکھا جاتا ہے۔

عزاداری کیوں عبادت ہے؟

کربلا کی عظیم قربانی درحقیقت اُس دوٹوک موقف کی نمائندہ ہے جو امام حسینؑ نے وقت کے باطل حکمرانوں کے خلاف اختیار فرمایا۔ ان کا قیام کسی شخصی مفاد یا شخصی مظلومیت کے گرد نہیں گھومتا بلکہ یہ ایک خدائی دین، فطری عدل، اور انسانیت کے وقار و آزادی کا بلند ترین اظہار تھا۔ امام حسینؑ کا ہدف اشرافیہ کے اُس ظلم کے خلاف جہاد تھا جو خدا، اس کے دین اور بندگانِ خدا پر مسلط ہو چکا تھا۔ ان کی تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے بے دین اور جابر حکمرانوں کی اصلاح کی ایک عظیم کوشش تھی۔

امام حسینؑ نے اُس دین کے احیاء کیلئے قیام کیا جو انسان کو دونوں جہانوں میں فلاح و سعادت کا پیغام دیتا ہے؛ ایسا دین جو دنیا کو آخرت کی کھیتی بناتا ہے، انسانی معاشروں میں عدل، استحکام اور روحانی رفعت کے تقاضے پورے کرتا ہے، اور فطرت کے مطابق خدا کے قوانین کے ذریعے انسان کو حیاتِ جاودانی کی جانب لے جاتا ہے۔ وہ تعلیماتِ محمدیہ جو زمانے کی غفلت میں پسِ پشت ڈال دی گئی تھیں، امامؑ ان کے دوبارہ قیام کے لیے میدان میں اُترے۔ پس، امام حسینؑ کا قتل دراصل دنیاوی لذتوں کے اسیر افراد کی جانب سے دینِ خدا اور شریعتِ محمدی کے خلاف سازش اور بغاوت کا عملی اظہار تھا۔

اسی بنا پر ہر اُس شخص پر جو خدا، رسول، اسلام، قرآن اور حق سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے، واجب ہے کہ وہ عزاداریِ امام حسینؑ کو اختیار کرے۔ یہ مجالسِ عزاء محض آنسو بہانے کی محفلیں نہیں بلکہ وہ رازوں بھری درسگاہیں ہیں جو انسان کو دنیا و آخرت دونوں میں فلاح کی راہ دکھاتی ہیں۔ یہ وہ خفیہ کوڈ ہیں جو دلوں کو زندہ کرتے اور عقلوں کو بیدار کرتے ہیں۔ خاص طور پر جب دنیا پرست، گمراہ یہودی گروہ اسلام کے خلاف مسلسل سازشیں کر رہے ہوں، تب یہ مجالس مجاہدین کی تربیت گاہیں بن جاتی ہیں جو ان سازشوں کا شعور رکھتے ہوئے جہاد کے لیے ذہنی و فکری آمادگی حاصل کرتے ہیں۔

امتِ محمدیہ کی اصلاح، ہر باشعور مسلمان پر فرض ہے۔ عزاداری کی مجالس کو صرف رسمی اور روایت پرستی کا مقام نہ بنایا جائے بلکہ ان کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حقیقی مراکز ہونا چاہیے جہاں انسانوں کو ظہور حضرت مہدیؑ اور اسلامی عالمی نظام کے قیام کے لیے تیار کیا جائے۔ یہاں صرف مذہبی جذبات نہیں بلکہ علمی شعور، سیاسی بصیرت اور انقلابی فکر پروان چڑھنی چاہیے، تاکہ دین دوبارہ انسانوں کی آکسیجن بن جائے اور وہ گمراہی و غفلت کی مضر فضاؤں سے نجات حاصل کریں۔ یہی عمل افضل ترین عبادت ہے۔

شہادتِ معصومینؑ پر برپا کی جانے والی عزاداری کو عبادت کا مقام اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ درحقیقت ذکرِ خدا، رسولؐ، اسلام اور قرآن کی سربلندی کا ابتدائی اور بنیادساز مرحلہ ہے۔ یہ مجالس تعلیماتِ اسلامی کو decode کرنے کی ایسی درسگاہیں ہیں جہاں تدبر و تفکر کے ذریعے اصل دین یعنی امامت کے قیام کی راہ واضح ہوتی ہے۔ یہاں نہ صرف مظلوم و محروم

کی حمایت کا نظریاتی دفاع کیا جاتا ہے بلکہ دشمن کی شناخت اور اس پر غلبہ حاصل کرنے کی حکمتِ عملی کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ یہی وہ طریقہ کار ہے جسے تمام معصومینؑ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں اختیار کیا اور اسی کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ ان کی شہادتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ائمہ معصومینؑ نے اسلام کی حکمتِ عملی کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ قیمتی سمجھا۔

چونکہ سیاسی امور سماج کے نظم و نسق سے جُڑے ہوتے ہیں، اس لیے امامت کا ادارہ جو دینی بنیادوں پر سماجی نظام کا قیام و انتظام کرتا ہے، اسلام میں سب سے عظیم عبادت ہے۔ اس شعبے کے بغیر دین معاشرتی و عملی زندگیوں میں اپنی روحانی و اجتماعی حیثیت قائم نہیں کر سکتا۔ آج امامت کے فوائد اور اس کے مقابلے میں دیگر نظاموں کی تباہ کاریوں کا ادراک دنیا بھر کے افراد کر چکے ہیں۔ لوگ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ سب ایک غلامی کے جال میں پھنس چکے ہیں۔ اس trap سے نکلنے کے لیے عزاداری کو اس کے حقیقی مفہوم میں سمجھنا اور اسے decode کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔

امام حسینؑ کی جدوجہد کا جوہر یہی تھا کہ ایسی غیر عادل، غیر فطری حکومتوں کو جو انسانی ضروریات اور حقوق کی ادائیگی سے قاصر ہوں، اکھاڑ پھینکا جائے اور نظامِ امامت قائم کیا جائے، جو انسانوں کی دنیا و آخرت کی فلاح کا ضامن ہے۔

جوش ملیح آبادی کا یہ شعر انہی حقائق کی بہترین ترجمانی کرتا ہے:

"دنیا کو بیدار تو ہو لینے دو، ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ"

خداوندِ متعال سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ظلم و ناانصافی کے خلاف جہاد کرنے والا حقیقی مجاہد بنائے، اور ہمیں علم و دانش اور تھکن سے بے نیاز مسلسل جدوجہد کے ذریعے اس جہاد کو عملی شکل دینے والا سر بکف سپاہی قرار دے۔ آمین یارب العالمین۔

غدیر اور دنیا میں جنت کا عکس

اگر غدیر کو یاد رکھا جاتا، یعنی اس دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اعلان کردہ ولایتِ علیؑ کو امت نے تسلیم کر لیا ہوتا اور اس کے بعد تمام آئمہ علیہم السلام یکے بعد دیگرے خلافت و حکومت کے منصب پر فائز ہوتے، تو دنیا کی تاریخ مکمل طور پر مختلف ہوتی۔ وہ دنیا جو آج ظلم، استحصال، طبقاتی فرق، جاہلانہ نظام، استعماری طاقتوں اور لالچ پر مبنی ترقی کی بنیاد پر کھڑی ہے، ایک ایسی دنیا ہوتی جو عدل، عقل، علم، روحانیت اور توازن پر قائم ہوتی۔

سیاسی میدان میں دنیا ایک الٰہی سیاست کا مشاہدہ کرتی، جہاں حکومت طاقت، فریب اور اکثریت کے کھیل کی بجائے حق، تقویٰ اور علم پر مبنی ہوتی۔ امام علیؑ کی سیرت میں جو سیاسی بصیرت، عدل گستری، اقرباء پروری سے اجتناب، اور محروم طبقات کی دادرسی نظر آتی ہے، وہی اصول تمام آئمہ کے ذریعے مسلسل نافذ رہتے۔ ہر امامؑ اپنے دور میں ظلم کے خلاف ایک زندہ احتجاج تھا، مگر اگر انہیں حکومت میسر ہوتی، تو نہ صرف ظلم مٹ چکا ہوتا بلکہ اس کے بنیادی اسباب ہی ختم ہو چکے ہوتے۔ اقوام کے درمیان جنگیں طاقت اور تسلط کی خاطر نہ ہوتیں بلکہ امتِ واحدہ کے تصور کے تحت تعاون، عدل اور اخوت کی بنیاد پر تعلقات قائم

ہوتے۔ اقوامِ متحدہ جیسا ادارہ ایک کھوکھلا نظریہ نہ ہوتا، بلکہ اہل بیتؑ کی قیادت میں انسانیت کا واقعی نمائندہ ہوتا۔

تعلیم کے میدان میں قرآن و اہل بیتؑ کی روشنی میں ایک ایسا نظام قائم ہوتا جو صرف معلومات کی ترسیل نہیں بلکہ عقل، تزکیہ، تفکر اور حقیقت کی تلاش کو محور بناتا۔ علم کو نفع بخش بنانے کا جو معیار رسولؐ اور آئمہؑ نے دیا، وہ عالمی تعلیمی پالیسی کا ستون ہوتا۔ ہر علم خدا کی معرفت کا ذریعہ بنتا، نہ کہ انسانوں کے استحصال اور تباہی کا۔ امام جعفر صادقؑ جیسے علمی مراکز دنیا بھر میں قائم ہوتے، جہاں سائنس، فلسفہ، فقہ، طب، نجوم اور دیگر تمام علوم خداشناسی کے تناظر میں پروان چڑھتے۔ علم کو سرمایہ دارانہ یا استعماری ایجنڈوں کا خادم نہیں بنایا جاتا بلکہ وہ انسان کو عبدِ حقیقی بنانے کا ذریعہ ہوتا۔

تہذیبی و ثقافتی طور پر انسانیت فطرت کی طرف واپس لوٹتی۔ خود کو خدا کا بندہ سمجھنے اور انسانی کرامت کی اصل بنیاد یعنی تقویٰ کو محور بنا کر ایک ایسا تمدن وجود میں آتا جو نہ صرف روحانی حسن کا آئینہ ہوتا بلکہ جمالیاتی ذوق بھی وحی کی روشنی میں پروان چڑھتا۔ ثقافت فحاشی، صارفیت، تفریق اور قومی تفاخر سے پاک ہوتی۔ لباس، طرزِ معاشرت، زبان و ادب، اور فنونِ لطیفہ، سب ایک ایسے جمالیاتی توازن کے مظہر ہوتے جن میں فطرت، عقل، روحانیت اور انسانی وحدت کی خوشبو رچی ہوتی۔

اقتصادی میدان میں نہ سرمایہ دارانہ نظام کی اجارہ داری ہوتی اور نہ ہی اشتراکی نظام کی بے روح مساوات، بلکہ ایک ایسا اقتصادی نظام نافذ ہوتا جس میں مالکیت کا حقیقی تصور، حقوقِ انسانی، صدقات، خمس وزکات، بیت المال، وقف، اور اخوتِ انسانی کو بنیاد بنایا جاتا۔ دولت کا ارتکاز، سود، فریب اور استحصال کی تمام شکلیں ختم ہوتیں۔ محنت کا احترام، کمزور طبقے کا تحفظ، اور قدرتی وسائل کی عادلانہ تقسیم وہ اصول ہوتے جن پر عالمی اقتصادی پالیسیاں بنتیں۔ دنیا آج قرضوں میں ڈوبی ہوئی غریب اقوام کا ظلم نہ سہہ رہی ہوتی، بلکہ ایک دوسرے کی دستگیر امتیں قائم ہوتیں۔

اخلاقی سطح پر دنیا ایک ایسا سماج دیکھتی جہاں جھوٹ، خیانت، ظلم، حسد، غرور، حرص، اور ہوس کو بدترین عیب سمجھا جاتا اور صدق، امانت، تواضع، ایثار، حلم، علم اور عدل جیسی صفات کو اصل فضیلت سمجھا جاتا۔ امام زین العابدینؑ جیسے اخلاقی معلم ہر بستی میں انسانوں کو ان کے اصل مقام کی یاد دہانی کراتے۔ انسان اپنی حیوانی جبلتوں کا بندہ نہ بنتا بلکہ نفسِ مطمئنہ کی منزل تک پہنچنے کی جدوجہد کرتا۔

اگر اہل بیتؑ کو حکومت مل جاتی تو دنیا ظاہری ترقی کی بجائے باطنی ارتقاء کی راہ پر چلتی۔ سائنسی ترقی ضرور ہوتی، مگر وہ مادیت پرستی یا جنگی صنعتوں کی خدمت میں نہ ہوتی بلکہ انسان کی خدمت، بیماریوں کے خاتمے، فطرت سے ہم آہنگی، اور روح و جسم کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے ہوتی۔ ٹیکنالوجی انسانوں کو غلام بنانے کا آلہ نہ بنتی بلکہ وہ اخلاق اور عدل کے تابع ہوتی۔

فردی،عائلی اور معاشرتی زندگی اپنی بنیاد سے لے کر اپنی بلند ترین صورت تک، وحی و عقل، اخلاق وعدل، اور محبت وہدایت کی روشنی میں ڈھل چکی ہوتی۔ ہر فرد کا تصورِ زندگی صرف دنیاوی کامیابی یا لذت نہیں ہوتا بلکہ وہ خود کو خدا کا بندہ، ایک بااخلاق وجود، اور ایک مقصد مند انسان سمجھتا۔ اس کی زندگی کا مرکز نفس پر قابو، اخلاقی تربیت، علم کا حصول اور دوسروں کی خدمت بن جاتا۔ خواہ وہ غریب ہوتا یا امیر، حاکم ہوتا یا محکوم، وہ اپنے کردار کو میزانِ عدل پر پرکھتا۔ امام علیؑ کے اقوال جیسے "تمہاری قیمت صرف جنت ہے" یا امام سجادؑ کے "صحیفہ سجادیہ" جیسے مناجات اس کی روزمرہ زندگی کی روح ہوتے۔ وہ زندگی کے ہر موڑ پر خود احتسابی، صبر، قناعت، شکر، خوفِ خدا اور امیدِ رحمت کے ساتھ قدم بڑھاتا۔

نجی اور عائلی زندگی میں محبت، وفا، حیاء، اور قربانی کے اصول غالب ہوتے۔ مرد و عورت ایک دوسرے کو بوجھ نہیں بلکہ خدا کی طرف پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے۔ نکاح صرف جسمانی یا سماجی ضرورت نہیں ہوتا بلکہ روحانی ارتقاء کی ایک مقدس راہ ہوتا۔ والدین اپنے بچوں کو دنیا کے غلام نہیں بلکہ عبدِ خدا بنانے کی نیت سے تربیت دیتے۔ بچوں کی تعلیم صرف معاش کمانے کے لیے نہیں بلکہ انسان سازی کے لیے ہوتی۔ گھروں میں قرآن کی تلاوت اور اہل بیتؑ کی تعلیمات معمول کا حصہ ہوتیں۔ ماں فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی طہارت اور قربانی کا نمونہ ہوتی، باپ علیؑ جیسا عدل پسند، غیرت مند اور مہربان ہوتا، اور بچے حسنینؑ کی تربیت کے عکس ہوتے۔ خاندان محبت کا گہوارہ، اور صبر و ایثار کا قلعہ ہوتا، نہ کہ جھگڑوں، خودغرضی اور دنیاوی حرص کی آماجگاہ۔

معاشرتی زندگی میں طبقاتی تقسیم، نسلی تفاخر، اور مال و عہدے پر مبنی عزت کا تصور مٹ چکا ہوتا۔ لوگ ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے، مسجد صرف عبادت کی جگہ نہیں بلکہ علم، عدل، شوریٰ اور خیر کا مرکز ہوتی۔ اہل محلہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے، بھوکے کو کھانا دینا باعثِ فخر، یتیم کا سہارا بننا سعادت، اور مظلوم کی مدد کرنا فرض سمجھا جاتا۔ معاشرے میں فقراء کا احترام ہوتا، مالدار اپنے مال کو امانت سمجھتے، اور غریب حسد کے بجائے شکر کے ساتھ جیتے، کیونکہ معاشرہ ایسا ہوتا جہاں عدل حقیقی تھا اور محرومیاں اجتماعی نظام کی کوتاہی کا نتیجہ نہیں بلکہ بعض اوقات آزمائش کا تقاضا ہوتیں۔ رشوت، دھوکہ، جھوٹ، اور بدگمانی جیسے امراض ناپید ہوتے کیونکہ معاشرے کی بنیاد ہی خدا پرستی، تقویٰ اور اہل بیتؑ کی روش پر ہوتی۔

عوام اور حکام کا رشتہ باہمی اعتماد، شفافیت، اور مشورے پر مبنی ہوتا۔ حکومت صرف قوانین نافذ کرنے کا ادارہ نہیں بلکہ خود ایک اخلاقی مرشد ہوتی۔ عدالتیں علیؑ کی عدالت جیسی ہوتیں، جہاں قاضی کا جھکنا ظلم کی علامت ہوتا، اور ایک معمولی فرد بھی خلیفہ کے خلاف حق کے ساتھ کھڑا ہو سکتا۔ معاشرہ ایک زندہ، باشعور اور ناصح ملت کی طرح ہوتا، نہ کہ اندھی تقلید اور جذباتی شور کا شکار ہجوم۔

مجموعی طور پر ایسی دنیا میں انسان اپنی ذات کے اندر خدا کی معرفت کو پالیتا، اپنے گھر میں سکون کو محسوس کرتا، اور اپنے معاشرے میں عدل، رحمت اور بھائی چارے کو عملاً جیتا۔ یہ وہی دنیا ہوتی جسے قرآن نے "بلدة طيبة و رب غفور" کہا۔

یقیناً یہ وہ دنیا ہوتی جس میں "یَعْمُرُ الْاَرْضَ قِسْطًا وَعَدْلًا کَمَا مُلِئَتْ جَوْرًا وَظُلْمًا" کا وعدہ صرف امام مہدیؑ کے ہاتھوں مکمل نہ ہوتا، بلکہ ہر امام کی حکومت میں مرحلہ بہ مرحلہ اس کا ظہور ہوتا رہتا اور جو اب امام مہدیؑ کے ظہور کے بعد عالمگیر سطح پر ظہور پائے گی، مگر اگر غدیر کے بعد وہ سلسلہ جاری رہتا تو یہ مبارک کیفیت بہت پہلے زمین پر ظاہر ہو چکی ہوتی۔ یہی غدیر کا پیغام تھا، جو اگر قبول کر لیا جاتا تو دنیا جنت کے عکس سے کم نہ ہوتی۔

علمی غیر جانبداری سے باعمل وابستگی تک کا سفر

انسان کا علمی و فکری سفر ایک مسلسل جستجو کا نام ہے، جس میں وہ سوالات کرتا ہے، تحقیق کرتا ہے، مشاہدات و تجربات کا سہارا لیتا ہے اور معلومات کے سمندر سے اپنے لیے موتی چنتا ہے۔ اس دوران اس کا طرزِ عمل عموماً غیر جانبدار اور نیوٹرل ہوتا ہے، کیونکہ وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوتا بلکہ سوال اور تلاش کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں انسان خود کو تجزیے، مشاہدے، مکالمے اور فکری تنوع کے کھلے میدان میں آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ حقیقت تک رسائی ممکن ہو۔ اس فیز میں وہ مختلف زاویوں سے چیزوں کو دیکھتا ہے، ایک مفروضے کو پرکھتا ہے، پھر دوسرا قائم کرتا ہے، ایک فکر سے متاثر ہوتا ہے اور پھر اس پر تنقید کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علم ایک بے رنگ روشنی کی مانند ہوتا ہے جو مختلف سمتوں میں بیک وقت سفر کر رہی ہوتی ہے۔
مگر تحقیق کا یہ مرحلہ کوئی دائمی منزل نہیں بلکہ ایک عارضی راہگزر ہے۔ جب انسان مسلسل تلاش، تجزیہ اور غور و فکر کے نتیجے میں کسی مقامِ فہم، کسی نکتۂ حقیقت، کسی فکری اور اعتقادی بنیاد تک پہنچتا ہے تو وہ علم صرف ایک نظری شناخت نہیں رہتا، وہ حکمت میں ڈھل جاتا ہے۔ اور حکمت، علم کی وہ صورت ہے جو زندگی کے عمل کو سمت، روح اور غایت عطا کرتی

ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان کے لیے نیوٹرل رہنا ممکن نہیں رہتا کیونکہ حکمت کا فطری تقاضا ہے کہ وہ کسی نظریہ، کسی موقف، کسی گروہ یا کسی محاذ سے وابستہ ہو۔

جو شخص یہ کہے کہ وہ سچ کو پہچان چکا ہے، مگر پھر بھی غیر جانبدار رہے، وہ یا تو سچ کا فہم حاصل نہیں کر پایا یا وہ خود فریبی کا شکار ہے۔ کیونکہ جب سچ واضح ہو جائے، جب حق اپنے جملہ دلائل و نشانیوں کے ساتھ انسان کے سامنے آ جائے، تو پھر اس کے ساتھ کھڑا ہونا صرف اخلاقی فریضہ نہیں بلکہ وجودی ضرورت بن جاتا ہے۔ اس سچ کے ساتھ کھڑے ہونے کا ایک عملاً راستہ یہ بھی ہے کہ انسان اس فکر، اس پیغام یا اس ہدف کے ساتھ جڑے ہوئے گروہ، تحریک یا جماعت کا حصہ بنے جو اس سچ کو اجتماعی سطح پر نافذ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ کیونکہ علم اگر تنہا رہ جائے تو وہ فقط کتابوں میں بند ایک گونگا سرمایہ ہوتا ہے، مگر جب وہ ایک باہدف، بصیرت افروز اور منظم اجتماعی طاقت میں ڈھلتا ہے تو وہ تاریخ ساز بن جاتا ہے۔

زندگی میں انسان کو بہت سے علمی و فکری شعبوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ مضامین اور میدان ایسے ہوتے ہیں جہاں تحقیق کا عمل جاری رہتا ہے، جیسے کائنات کے راز، لسانیات، جمالیات، یا فنی و سائنسی پہلو، جن میں تحقیق اپنی نوعیت میں خالص علمی رہتی ہے۔ ان میں انسان نیوٹرل بھی رہ سکتا ہے کیونکہ ان کا تعلق براہِ راست کسی سیاسی، نظریاتی یا وجودی فیصلے سے نہیں ہوتا۔ مگر کچھ میدان ایسے ہوتے ہیں جیسے دین، عقیدہ، سیاست، حق و باطل، عدل و ظلم، جن میں تحقیق اگر نتیجہ خیز ہو جائے تو پھر غیر جانبداری کی کوئی گنجائش باقی نہیں

رہتی۔ ان شعبوں میں علم جب نکھر کر سامنے آجائے، تو اس کا فطری تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس نتیجے کی روشنی میں اپنا عمل مرتب کرے، اپنی وفاداریاں متعین کرے، اور ایسے گروہ یا تحریک سے جڑ جائے جو اس نتیجے کو عمل میں لانے کے لیے میدان میں سرگرم ہو۔ ایسے گروہ یا جماعت سے جڑنا جہاں فکری ہم آہنگی ہو، ایک طرح سے اس علم کے عملی جولان کا میدان بن جاتا ہے۔ مگر یہ وابستگی اندھی نہیں ہونی چاہیے بلکہ حکمت، بصیرت، اور مقصد شناسی کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ گروہ کے ساتھ جڑنے کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنی عقل گروی رکھ دے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرد اپنے فہم و ادراک کو اجتماعی نظم و حکمت کے تحت ڈھالتا ہے تاکہ علم کا اثر محدود نہ رہے بلکہ وسیع تر سوسائٹی میں تبدیلی کا سبب بنے۔

علم کا کمال صرف فہم یا نکتہ نظر تک محدود نہیں، بلکہ وہ اس وقت حقیقت بن کر سامنے آتا ہے جب وہ میدانِ عمل میں قدم رکھے، جب وہ جماعتی فیصلوں، حکمتِ عملی، اور اجتماعی ارادے کا حصہ بنے۔ یہیں سے علم بصیرت بن کر کردار کی شکل اختیار کرتا ہے، اور وہ بصیرت، تاریخ کے دھارے کو موڑنے کی طاقت رکھتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں علم اپنے عروج کو پہنچتا ہے، جب وہ فرد کے اندر بھی چراغ بنے اور قوم کے لیے بھی مشعلِ راہ ہو۔ انسانی شعور اور سماجی نظم کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ سچائی اور امانت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ سچ اگرچہ اپنی ذات میں ایک اعلیٰ قدر ہے، لیکن جب اسے وقت، جگہ، اور سیاق سے کاٹ کر پیش کیا جائے یا اس کی بنیاد تحقیق کے بغیر مشتبہ مفروضات پر رکھی جائے، تو وہ

سچائی کے نام پر خیانت بن جاتا ہے۔ جو خبر، اطلاع یا دانش ابھی تحقیق طلب ہو، جس کی صحت و صداقت میں شک ہو، جس کا ماخذ غیر واضح یا غیر معتبر ہو، یا جس کے اثرات کے بارے میں مکمل بصیرت نہ ہو، اسے نشر کرنا یا پھیلانا نہ صرف غیر ذمہ دارانہ عمل ہے بلکہ حقیقت کے ساتھ کھلی خیانت ہے۔

یہ رویہ اس وقت اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے جب کسی حساس دینی، فکری، سیاسی یا مزاحمتی فضا میں انجام دیا جائے۔ مشتبہ معلومات کو افشا کرنا اکثر نہ صرف حق پر یقین رکھنے والوں کے ذہنوں کو مشوش کرتا ہے بلکہ وہ دشمن کے پروپیگنڈے کو بلاواسطہ تقویت دینے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایک غیر یقینی، ادھوری یا قابلِ تحقیق بات جب ایک حتمی اطلاع کے طور پر بیان کی جائے تو سننے والا اسے ایک قطعی سچ سمجھ کر ردعمل دیتا ہے۔ اور یوں ایک شک، ایک مفروضہ یا ایک ناپختہ خیال، عملی میدان میں فتنہ، بدگمانی، کمزوری اور انتشار کا سبب بن جاتا ہے۔

قرآن کی روشنی میں خبر رسانی کا اصول یہی ہے کہ اگر کوئی فاسق یا غیر معتبر شخص کوئی اطلاع دے تو اس کی تصدیق کیے بغیر اسے قبول یا پھیلانا جائز نہیں۔ یہی اصول ہر اس دانش اور اطلاع پر بھی لاگو ہوتا ہے جو ابھی علمی سطح پر تحقیق کے مرحلے میں ہو۔ کیونکہ افواہ، اندازہ، یا جزوی علم اگر حتمی اور مکمل سچ کے طور پر بیان کیا جائے تو سننے والے کو دھوکہ دیا جاتا ہے، اور دھوکہ دینا خواہ نیت کے بغیر ہو، سچائی کی روح کے منافی ہوتا ہے۔ بعض افراد نیک نیتی سے بھی مشتبہ باتیں پھیلا دیتے ہیں، اس امید میں کہ شاید یہ بات سچ ہو

یا شاید اس سے کچھ خیر کا پہلو نکل آئے۔ لیکن نیت کے اخلاص سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آیا یہ عمل سچ کی امانت کے مطابق ہے یا نہیں۔ سچائی کی امانت یہ تقاضا کرتی ہے کہ جب تک کوئی بات یقین کے ساتھ، تحقیق اور بصیرت کی روشنی میں ثابت نہ ہو جائے، اس کو روک کر رکھا جائے، اس پر خاموشی اختیار کی جائے، یا کم از کم یہ وضاحت کی جائے کہ یہ اطلاع ابھی تحقیق طلب ہے۔ بصورت دیگر یہ صرف لاعلمی نہیں بلکہ خیانت کا ایک ایسا پہلو بن جاتا ہے جو نہ صرف حق کو کمزور کرتا ہے بلکہ سچائی کی حیثیت کو بھی مشکوک بنا دیتا ہے۔ اس دور میں جب ہر شخص ایک چینل، ایک منبر، اور ایک پبلشر بن چکا ہے، خبر رسانی کی اخلاقی ذمہ داریاں کہیں زیادہ سنگین ہو چکی ہیں۔ جس طرح ایک جھوٹ واضح فریب ہے، اسی طرح ایک مشتبہ بات کو سچ کے طور پر پھیلانا بھی فریب ہے، بلکہ بعض اوقات یہ جھوٹ سے زیادہ مہلک ہوتا ہے کیونکہ اس کا نقصان دیرپا اور گہرا ہوتا ہے۔ اس لیے علم، خبر اور دانش کی دنیا میں تحقیق سے پہلے اظہار، اور شک کی حالت میں تشہیر، سچائی کی حرمت کو پامال کرنا ہے، جو صرف اخلاقی خطا نہیں بلکہ حق کے ساتھ خیانت ہے۔ اور یہ خیانت نہ صرف فرد کے شعور کو زنگ آلود کرتی ہے بلکہ اجتماعی سطح پر بداعتمادی، گمراہی، اور باطل کی مدد کا دروازہ کھولتی ہے۔

جنگ کے دوران اہل ایمان کیلئے حوصلہ افزائی

اسلام اور کفر کے مابین جب جنگ کا طبل بجتا ہے، تو یہ معرکہ محض زمین، وسائل یا قومی برتری کی لڑائی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک عظیم ترین فکری وروحانی معرکہ ہوتا ہے جو توحید اور طاغوت کے مابین برپا ہوتا ہے۔ اس میدان میں ایک سچا مجاہد اسلحے سے زیادہ اپنے ایمان، یقین، اخلاص، صبر اور اللہ سے تعلق پر بھروسہ کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے اسے اکیلا نہیں چھوڑا، بلکہ قرآن کی آیات اس کی روح کی غذا اور قلب کی ڈھارس بن کر ساتھ ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہ خدا کے دین کا سپاہی ہے اور اس کے دشمن فقط اللہ کے دشمن ہیں۔ ایسے وقت میں قرآن اس کے دل کو مضبوطی عطا کرتا ہے، اس کے حوصلے کو بلند کرتا ہے اور اسے وعدۂ الٰہی پر یقین عطا کرتا ہے۔

قرآن اسے یاد دلاتا ہے کہ اللہ نے فرمایا" : کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة بإذن الله والله مع الصابرين"(سورہ بقرہ، آیت 249) یعنی کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آچکی ہیں، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ آیت مجاہد کے دل میں وہ یقین جگاتی ہے جو اسے اپنے محدود وسائل کے باوجود دنیا کی بڑی بڑی فوجوں کے مقابل کھڑا ہونے کا حوصلہ دیتی ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو تعداد کی کمی اس کے عزم کو نہیں توڑ سکتی۔

جب وہ دشمن کی صفیں دیکھتا ہے، وسائل کی چمک دمک دیکھتا ہے، تو قرآن اسے تنبیہ کرتا ہے " :یا أیھا الذین آمنوا إذا لقیتم فئة فاثبتوا واذکروا الله کثیرا لعلکم تفلحون، وأطیعوا الله ورسوله ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا إن الله مع الصابرین" (سورہ انفال، آیت 45-46)۔ اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ فتح کا راستہ صرف ہمت اور اتحاد میں ہے، اختلاف و نزع کو چھوڑنا، اللہ و رسول کی اطاعت اور مسلسل ذکر الٰہی ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ دشمن سے بھڑنے کا مطلب صرف شمشیر زنی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے اللہ پر یقین رکھنا ہے۔

يَـــ ٰ أَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تَنصُرُوا۟ ٱللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ " اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔ "(سورہ محمد، آیت 7) یہ آیت ایک عظیم وعدۂ الٰہی ہے جو مؤمنین کو بتاتی ہے کہ اللہ کی مدد مشروط ہے بندے کی طرف سے خلوص و قربانی کے ساتھ دین کی نصرت پر۔ جب کوئی مؤمن اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لیے اخلاص سے قدم بڑھاتا ہے، تو اللہ نہ صرف اس کی مدد فرماتا ہے بلکہ اسے ثابت قدمی، استقامت اور فتح عطا کرتا ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ کامیابی کا راز اللہ کی راہ میں عملی اقدام اور نیت کی سچائی میں ہے۔

ایسے وقت میں مجاہد اپنے رب کے اس سودا کو بھی یاد رکھتا ہے جو اس نے بندگانِ مومن سے کیا ہے " :إن الله اشتری من المؤمنین أنفسھم وأموالھم بأن لھم الجنة یقاتلون فی

سبیل اللہ فیقتلون ویُقتلون"(سورہ توبہ، آیت 111)۔ یہ آیت اسے بتاتی ہے کہ اب وہ اپنی جان کا مالک نہیں رہا، اب وہ اللہ کی راہ میں بیچ چکا ہے اور اس کی قیمت جنت ہے۔ اب اگر وہ قتل کرے یا قتل ہو جائے، دونوں صورتوں میں کامیاب ہے، کیونکہ وہ سودا خالص رب سے ہے جو بدلہ دینے میں کبھی کمی نہیں کرتا۔

جب دشمن کا شور، طعن، دھمکیاں اور ظاہری برتری نظر آتی ہے تو قرآن پھر اس کے دل کو تھپکی دیتا ہے اور کہتا ہے" : ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين"(سورہ آل عمران، آیت 139)۔ تم نہ کمزور پڑو، نہ غم کرو، اگر تم ایمان والے ہو تو تم ہی غالب رہو گے۔ یہاں ایمان کو معیار بنایا گیا ہے، کہ اگر دلوں میں یقینِ کامل ہو، اگر دل سچے ہوں تو کثرت و قلت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

مجاہد جانتا ہے کہ اللہ کی نصرت مشروط ہے، لیکن وہ وعدہ ہے سچا، اللہ خود فرماتا ہے" :يا أيها الذين آمنوا إن تنصروا الله ينصركم ويثبت أقدامكم"(سورہ محمد، آیت 7)۔ اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا۔ یہ آیت نہ صرف حوصلہ ہے بلکہ ایک راہِ عمل بھی ہے، کہ اللہ کی نصرت تب ہی آتی ہے جب بندے اپنی نیت، عمل، صف اور مقصد کو خالص اللہ کے لیے کر دیتے ہیں۔

وہ دشمن کے ساز و سامان کو دیکھتا ہے تو قرآن اسے تلقین کرتا ہے کہ یہ جنگ تیاری کی بھی محتاج ہے۔ فرمایا گیا" : وَاَعِدُّوْا لَـهُـمْ مَّا اسْتَطَعْتُـمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ

عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمُ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ(سورہ انفال، آیت 60)"۔ ان سے لڑنے کے لیے جو کچھ قوت سے اور صحت مند گھوڑوں سے جمع کر سکو سو تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسروں پر رعب پڑے، جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے۔ دین کی راہ میں لڑنے کا مطلب کاہلی یا انتظار نہیں بلکہ روحانی ومادی تیاری دونوں ہے۔

ہر زخم، ہر تھکن، ہر تنہائی کے لمحے میں مجاہد کے دل کو قرآن تسلی دیتا ہے" :یا أیها الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلاۃ إن الله مع الصابرین"(سورہ بقرہ، آیت153)۔ کہ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد مانگو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ آیت اسے بتاتی ہے کہ روحانی سکون اور ثبات صرف اللہ سے تعلق میں ہے، اور جب بندہ سجدے میں جا کر آنسو بہاتا ہے تو وہ تھکن، درد، تنہائی سب مٹ جاتی ہے۔

اور جب ساتھی شہید ہو جائیں، صفیں چھن چھن کر کم ہوتی جائیں، تو قرآن اسے بتاتا ہے کہ اللہ کے وعدے کبھی جھوٹے نہیں ہوتے، فرمایا" : من المؤمنین رجال صدقوا ما عاهدوا الله علیه فمنهم من قضی نحبه و منهم من ینتظر و ما بدلوا تبدیلا"(سورہ احزاب، آیت 23)۔ کچھ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے گئے وعدے کو سچا کر دکھایا، کچھ اپنی جان دے چکے اور کچھ ابھی منتظر ہیں اور انہوں نے کبھی ارادے میں تبدیلی نہیں کی۔

یہ قرآن کا معجزہ ہے کہ وہ صرف الفاظ نہیں بلکہ جہاد کا نقشہ، شہادت کا شوق، قربانی کی عظمت، اور رب سے ملاقات کی خوشی کو ہر لمحہ تازہ کرتا ہے۔ مجاہد جب قرآن کی ان آیات کو سینے سے لگاتا ہے تو وہ ایک نئے ولولے، یقین اور اعتماد کے ساتھ اٹھتا ہے، تلوار پکڑتا ہے، اور دشمن کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ذکرِ الٰہی ہوتا ہے، آنکھوں میں شوقِ وصال، اور دل میں وہ آواز گونجتی ہے: "ہم وہ ہیں جو اللہ کی راہ میں جیتے ہیں اور اسی کی راہ میں مرنے کو اعزاز سمجھتے ہیں۔" یہی وہ ایمان ہے جو ہر معرکے میں اسلامی لشکر کو غالب رکھتا ہے، کیونکہ جب اللہ ساتھ ہو تو شکست ممکن ہی نہیں۔

قرآن مجید نے کفار و مشرکین کے لشکروں کو محض ظاہری قوت رکھنے والی، مگر باطنی طور پر کھوکھلی اور بودی طاقتیں قرار دیا ہے۔ ان کی ظاہری کثرت، اسلحہ، اور دنیاوی دبدبہ اللہ کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ وہ حق کے مقابل جھوٹ پر قائم ہوتے ہیں، اور جھوٹ خواہ کتنا ہی مضبوط لگے، انجام کار مٹنے کے لیے ہی ہوتا ہے۔

اللہ سورہ انفال میں کفار کی حالت کو یوں بیان فرماتا ہے: إِن يَنفِقُوا يُنفِقُوا كَرْهًا فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ (الانفال:36) یعنی وہ جو کچھ بھی خرچ کریں گے، ناخوش ہو کر کریں گے، پھر وہی خرچ ان کے لیے حسرت بن جائے گا، اور وہ مغلوب ہوں گے۔ ان کا تمام ساز و سامان، ان کی مال و دولت اور فوجی تیاری انجام کار ان پر حسرت کا بوجھ بن کر رہ جائے گی، کیونکہ وہ اللہ کے مقابل باطل پر کھڑے ہیں۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں غزوہ بدر کے تناظر میں فرمایا: قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ (آل عمران:13) یعنی تمہارے لیے ایک نشانی دو جماعتوں کی جنگ میں تھی، ایک اللہ کی راہ میں لڑنے ولی، دوسری کافر، جنہیں مؤمنین دوگنا دیکھ رہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی مدد سے تقویت دیتا ہے۔ یہاں کافروں کی ظاہری طاقت کے باوجود ان کی شکست اللہ کے نصرت یافتہ مجاہدوں کے مقابل ان کی بودی حیثیت کو نمایاں کرتی ہے۔

اسی طرح سورہ ابراہیم میں فرمایا گیا: مَّثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ ۖ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ ۖ لَّا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ۔ (ابراہیم:18) یعنی جو لوگ اپنے رب کا انکار کرتے ہیں ان کے اعمال اس راکھ کی مانند ہیں جس پر آندھی کے دن تیز ہوا چلے، وہ اس سے کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتے، یہی دور کی گمراہی ہے۔ یہاں کفار کی تمام کوششیں، ان کے لشکر، ان کے ہتھیار، سب ہوا میں اڑتی راکھ کی طرح قرار دی گئی ہیں۔

سورہ محمد میں اللہ فرماتا ہے :إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ، وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَّهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ (محمد:7-8) اگر تم اللہ کی مدد کروگے، تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا، اور جو کافر ہیں، ان کے لیے ہلاکت ہے اور اللہ ان کے اعمال

کو ضائع کر دے گا۔ یہاں بتایا گیا ہے کہ کفار کے تمام منصوبے، کوششیں اور جنگی حکمت عملیاں ضائع ہو جاتی ہیں کیونکہ وہ اللہ کے مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔

یہی حقیقت سورہ انفال میں اور بھی واضح انداز میں یوں بیان ہوتی ہے: إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (الأنفال:43) کہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دشمن کو کم دکھایا تاکہ مومنوں کا حوصلہ بلند رہے، اور اسی طرح حقیقت میں بھی دشمن کی کثرت مسلمانوں کے دل پر اثر انداز نہ ہو سکی۔

قرآن بارہا کفار کو صرف عددی کثرت، ظاہری غرور اور دنیاوی ساز و سامان پر ناز کرنے والی قوم قرار دیتا ہے جو حقیقت میں کسی بنیاد پر قائم نہیں۔ ان کا نظام، ان کی فوج، ان کی حکومتیں، ان کے لشکر سب باطل پر کھڑے ہیں، اور باطل کے متعلق اللہ نے اعلان کر دیا ہے: إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (الاسراء: 81) یعنی باطل تو مٹنے ہی والا ہے۔

یوں قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ کفار و مشرکین کے لشکر بظاہر جتنے بھی مضبوط نظر آئیں، درحقیقت وہ ریت کی دیوار ہیں جو حق کے طوفان کے سامنے ٹک نہیں سکتے۔ ان کی بنیاد جھوٹ، ظلم، اور شرک پر ہے، اور ایسی بنیاد کا انجام تباہی ہے، نہ کہ استحکام۔ مجاہدین کو یہی بصیرت اور اطمینان قرآن سے ملتا ہے، جس سے ان کے دل دشمن کی ظاہری چمک دمک سے نہ گھبراتے ہیں، نہ جھکتے ہیں، کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ جن کی پشت پر اللہ ہو، ان کے مقابل دنیا کی کوئی طاقت ٹک نہیں سکتی۔

کثیر الکلام ایمان کو تباہ کر دیتا ہے

بہت زیادہ باتیں کرنا، بظاہر ایک معمولی سی عادت معلوم ہوتی ہے، لیکن اسلامی نفسیات اور کنونشنل نفسیات دونوں کے مطابق یہ عمل انسان کے نفس، اس کی روحانی کیفیت، ایمانی اہداف اور ذہنی استقامت پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اسلام کے اخلاقی نظام میں زبان کو انسان کے وجود کا نہایت حساس، اور نازک ترین پہلو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر فضول گوئی، لَغو، اور بے مقصد باتوں سے دور رہنے والے افراد کو "مفلحون" یعنی کامیاب کہا گیا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی متعدد احادیث میں زبان کی حفاظت کو جنت یا جہنم کے تعین کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، اور ائمہ معصومین علیہم السلام نے بار بار یہ تعلیم دی کہ مؤمن وہی ہے جو کم بولے، مگر ہر بات حکمت سے کرے، اور بے فائدہ گفتگو سے پرہیز کرے۔

اسلامی نفسیات کی رو سے بہت زیادہ بات کرنا دراصل انسان کے اندرونی سکون، وقار اور روحانی توازن کو متاثر کرتا ہے۔ جب انسان مسلسل بولتا ہے، خواہ وہ مباحثہ ہو، تفریح ہو یا خود کو ثابت کرنے کی کوشش، تو اس کا ذہن ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت میں چلا جاتا ہے۔ دل اور دماغ کو وہ فرصت ہی نہیں ملتی جس میں وہ غور و فکر کر سکیں، تزکیہ کر سکیں، یا اللہ سے رابطہ قائم کر سکیں۔ یہی وہ کیفیت ہے جو ذکرِ الٰہی سے دوری، غفلت، اور قلبی سستی کو جنم دیتی ہے۔ انسان کا نفس اس شور میں اپنے اصل سے دور ہوتا جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے

وجود کی گہرائی سے جڑنے کے بجائے ظاہری رابطوں میں الجھا ہوتا ہے۔ امام علیؑ نے فرمایا کہ "جو بہت بولتا ہے، وہ بہت غلطیاں کرتا ہے، اور جو بہت غلطیاں کرتا ہے، اس کا دل مردہ ہو جاتا ہے"۔ اس قول میں انسانی نفسیات کا ایک مکمل اصول پوشیدہ ہے کہ زبان کی بے مہار حرکت، قلب کی حیات کو آہستہ آہستہ فنا کر دیتی ہے۔

کنونشنل نفسیات بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ حد سے زیادہ بولنا کئی نفسیاتی کمزوریوں کی علامت ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات یہ اضطرابی عارضہ (Anxiety Disorders) کا اظہار ہوتا ہے، جہاں انسان خاموشی کو برداشت نہیں کر پاتا اور مسلسل باتیں کر کے اپنے اضطراب کو دباتا ہے۔ کبھی یہ خوداعتمادی کی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ فرد خود کو ثابت کرنے کے لیے زیادہ گفتگو کرتا ہے، اور کبھی یہ narcissistic tendencies کا غماز ہوتا ہے جہاں فرد چاہتا ہے کہ وہ مرکزِ توجہ بنا رہے۔ سائیکوڈائنامک تھیوری کے مطابق، بہت زیادہ باتیں کرنے والا فرد لاشعوری طور پر اپنے باطنی خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جتنا وہ بولتا ہے، اُتنا ہی اُس کا باطن شور سے بھر جاتا ہے، اور وہ سکونِ قلب سے مزید دور ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، خاموشی، غور و فکر، اور سنجیدہ گفتگو نہ صرف ذہنی صحت کو بہتر بناتی ہے بلکہ فرد کو اپنی جذباتی کیفیت سے بھی مربوط کرتی ہے۔

ایمانی ذہن، جو آخرت پر یقین رکھتا ہے، جو اپنے ہر عمل کو خدا کے حضور جوابدہی کے احساس سے مشروط کرتا ہے، وہ کبھی بھی بلاضرورت زبان نہیں کھولتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ زبان سے نکلنے والا ہر لفظ یا تو اس کے حق میں حجت بنے گا یا اس کے خلاف گواہ۔ یہی وجہ ہے کہ اہل معرفت اور اولیائے الٰہی کی ایک نمایاں صفت قلیل الکلامی رہی ہے۔ وہ بہت کم بولتے تھے، مگر ان کا ہر لفظ اثر رکھتا تھا، کیونکہ وہ زبان کو نفس کا خادم نہیں، بلکہ عقل اور

ایمان کا تابع بناتے تھے۔ بے تحاشہ گفتگو انسان کے ذہن کو سطحی بنا دیتی ہے، وہ گہرائی سے محروم ہو جاتا ہے، اور ایمانی اہداف سے اس کا تعلق کمزور ہو جاتا ہے، کیونکہ ایمان گہرائی، تدبر، توکل، اور حیا سے پھلتا ہے، نہ کہ شور، بحث، اور بے معنی الفاظ سے۔

یوں دیکھا جائے تو زیادہ بولنا انسان کے شعور، روحانیت، اور علمی و نفسیاتی توازن پر براہِ راست منفی اثر ڈالنے والا عمل ہے۔ اسلامی تربیت میں سکوت کو عبادت قرار دیا گیا ہے، کیونکہ سکوت انسان کے باطن میں نزول کا دروازہ کھولتا ہے، اور اسے اپنے رب، اپنی حقیقت اور اپنے مقصد سے جوڑتا ہے۔ لہٰذا نہ صرف اسلامی نفسیات بلکہ ماڈرن سائیکالوجی بھی اسی نکتہ پر متفق ہے کہ بہت زیادہ گفتگو، خصوصاً غیر ضروری اور غیر محتاط، انسان کو بگاڑ کی طرف لے جاتی ہے، جبکہ خاموشی، تدبر، اور موزوں و با معنی کلام اسے فکری و روحانی ارتقاء کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

کفار کی ترقی کا دھوکہ اور اہل ایمان کی سادگی

یہ سوال جو گمراہ مادہ پرست لوگ اٹھاتے ہیں کہ سب سے زیادہ جی ڈی پی، ترقی، سہولیات، سائنس، ٹیکنالوجی، صحت، تعلیم، ٹریفک نظام، عدالتی شفافیت اور دیگر شہری خدمات غیر مسلم ملکوں میں کیوں زیادہ ہیں، اس کا مقصد اہل ایمان کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنا، ان کے روحانی اعتماد کو متزلزل کرنا اور انہیں مادہ پرستی کی جانب راغب کرنا ہے۔ اس سوال کی بنیاد ہی غلط منہجِ فکر پر ہے کیونکہ یہ سوال دراصل الٰہی نظام معیار کو دنیاوی کسوٹیوں پر پرکھنے کی ایک شیطانی کوشش ہے، جبکہ قرآن، احادیثِ معصومینؑ اور اہل عرفان و حقیقت کی روشنی میں حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دار العمل اور آخرت کو دار الجزاء قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: " من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن نريد ثم جعلنا له جهنم يصلاها مذموماً مدحوراً، ومن أراد الآخرة وسعى لها سعيها وهو مؤمن فأولئك كان سعيهم مشكوراً" (سورہ اسراء، آیت 18-19) یعنی جو دنیا کی جلدی چاہے، ہم اس کے لیے دنیا میں وہی کچھ جلدی دے دیتے ہیں جسے ہم چاہیں، پھر ہم اس کے لیے جہنم تیار کرتے ہیں، اور جو آخرت کو چاہے اور اس کے لیے محنت کرے اور وہ مومن ہو تو اس کی سعی کی قدر کی جائے گی۔

اسی طرح اہل دنیا کی ظاہری چمک دمک، ان کی معیشتی قوت، ان کی سماجی ترقی درحقیقت کسی روحانی برتری یا حقیقی فلاح کا ثبوت نہیں۔ سورہ توبہ میں اللہ فرماتا ہے: "فلا تعجبك أموالهم ولا أولادهم إنما يريد الله ليعذبهم بها في الحياة الدنيا وتزهق أنفسهم و هم كافرون"۔ پس ان کی دولت، ترقی اور خوشحالی اہل ایمان کے لیے باعثِ رشک نہیں بلکہ بعض اوقات یہ ان کے عذاب کا ذریعہ ہے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: "الدنيا سجن المؤمن و جنة الكافر"، یعنی دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔ چنانچہ اگر دنیا میں اہل ایمان کو محرومیاں، مشکلات، کمزوریاں اور زحمتیں نظر آئیں تو یہ ان کے اخروی درجات کی تیاری ہے، اور اگر اہل کفر کو دنیا کی ساری آسائشیں اور ظاہری ترقیات ملیں تو یہ ان کے لیے ایک وقتی مہلت ہے جو انہیں حق سے مزید دور اور آخرت میں تباہی کے قریب کرتی جا رہی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے دنیا سے روک لیتا ہے جیسے تم بیمار کو اس چیز سے روکتے ہو جو اسے نقصان دیتی ہے"۔ پس جو کچھ دنیا میں اہل ایمان کو نہیں دیا جا رہا، وہ ان کے روحانی تحفظ اور اخروی نجات کا ذریعہ ہے، اور جو کچھ اہل دنیا کو ملا ہے وہ ان کی آزمائش اور غفلت کی قیمت ہے۔

یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ جسے تم سہولت کہتے ہو، وہ کبھی کبھی ایک روحانی غفلت بن جاتی ہے۔ سکون نہیں بلکہ نشہ بن جاتی ہے۔ مال، طاقت، ٹیکنالوجی، سہولتیں، اگر انسان کو خود

فراموشی، فطرت گریزی اور معاد سے بے گانگی کی طرف لے جائیں تو وہ سب زہر ہیں، چاہے انہیں شہد میں لپیٹ دیا گیا ہو۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو بیان کیا: "یعلمون ظاھراً من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون" (سورہ روم، آیت 7)۔

اسلام کی کامیابی کا معیار نہ کبھی جی ڈی پی تھا، نہ بجلی پانی، نہ موبائل انٹرنیٹ، نہ فلائی اوورز اور نہ اسٹاک ایکسچینج۔ اسلام کا معیار ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ کون اپنے رب کو پہچانتا ہے، کون حق پر ڈٹ جاتا ہے، کون شہید ہوتا ہے، کون جیل جاتا ہے، کون ظلم سہتا ہے مگر سر نہیں جھکاتا، کون حلال کھاتا ہے چاہے ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، اور کون دنیا کی ساری نعمتیں پا کر بھی آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔

امیر المؤمنین علیؑ فرماتے ہیں: "ما اَقل عملاً اَقلبہ یقین" یعنی تھوڑا عمل جو یقین کے ساتھ ہو، وہ کثرتِ عمل پر بھاری ہے جو مادہ پرستی اور دنیا طلبی سے ہو۔ دنیا دار ملکوں کا نظام کتنا بھی چمکدار ہو، جب وہ خدا کی بغاوت پر قائم ہو، جب وہ مظلوموں کی آہوں پر ترقی کرتا ہو، جب وہ سود، شراب، فحاشی، بے حیائی اور استکبار پر فخر کرے، تو وہ زوال اور لعنت کا ایک خوشنما قلعہ ہے، نہ کہ قابلِ تقلید مثالی معاشرہ۔

پس اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ دنیاوی ترقی کو معیارِ حق نہ بنائیں بلکہ معیار کو قرآن و عترت کے اقوال میں تلاش کریں۔ کامیابی وہی ہے جو عبدیت کے سفر میں ہو، جو قلب کے نور میں

ہو، جو آخرت کی نجات میں ہو۔ دنیا کی سہولیات ایک عارضی سراب ہیں جن کے پیچھے بھاگنے والے آخرکار حسرتوں کے صحرا میں گم ہو جاتے ہیں۔

جس طرح فرعون کی سلطنت، نمرود کی ٹیکنالوجی، قارون کا خزانہ، سب قرآن میں ذکر ہوئے مگر بطور مثالِ ہلاکت اور بربادی، نہ کہ کامیابی۔ بالکل اسی طرح آج کے امریکہ، اسرائیل، فرانس، جرمنی یا کسی مغربی ملک کی ترقی بھی اگر خدا کے نظام سے ہٹی ہو تو وہ صرف خالی شیل ہے، اس کے اندر کوئی حقیقت، کوئی برکت اور کوئی دائمی حیثیت نہیں۔

پس اہل ایمان کو استقامت، صبر، توکل، اور بصیرت کے ساتھ دنیا کے دھوکے سے بچتے ہوئے اپنے راستے پر ڈٹے رہنا ہے، اور ان گمراہ مادہ پرستوں کے سوالات کا جواب بھی اسی روحانی عظمت سے دینا ہے، جو ہمیشہ حق پر قائم رہتی ہے، چاہے دنیا ساتھ دے یا نہ دے۔

ماضی و حال اور قوانین فطرت

امام علیؑ کا فرمان "گزرے ہوئے حالات سے آنے والے زمانے کا قیاس کرو" نہ صرف ایک حکیمانہ بصیرت ہے بلکہ انسانی تاریخ، فطرت اور سچائی کے ازلی و ابدی اصولوں کی گہرائی پر مبنی ایک جامع اصول ہے۔ یہ قول ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم تاریخ کو محض ماضی کے واقعات کے ذخیرے کے طور پر نہ دیکھیں بلکہ اسے ایک زندہ تجربہ گاہ سمجھیں جہاں حق و باطل، عدل و ظلم، خیر و شر کی کشمکش ایک مستقل قانون کی صورت میں کارفرما رہی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "سنت اللہ لا تبدیل لہا" یعنی اللہ کے قوانین میں تبدیلی نہیں آتی، اسی طرح انسانی سماج پر بھی جو الٰہی و فطری قوانین لاگو ہوتے ہیں وہ بھی تغیر و تبدل سے محفوظ ہیں۔

انسانی فطرت، انسانی ضمیر، اور انسانی ردِ عمل بھی ان قوانین کا حصہ ہیں۔ ایک ماں کا محبت سے لپٹ جانا، ایک مظلوم کی آہ کا اٹھنا، ایک ظالم کے خلاف فطری نفرت کا ابھر آنا—یہ سب فطرتِ انسانی کے ایسے مظاہر ہیں جو نہ ماضی میں بدلے، نہ حال میں بدلے، اور نہ مستقبل میں بدلیں گے۔ لہٰذا جس طرح امامؑ نے مستقبل کے اندازے کے لیے ماضی کو پیمانہ قرار دیا، اسی طرح ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ حال کے آئینے میں ماضی کا چہرہ بھی پہچانا جاسکتا ہے۔

آج کے حالات کو اگر غور سے دیکھا جائے، تو دنیا بھر میں حق و باطل کے نقوش اسی طرح واضح ہیں جیسے صفین و کربلا کے میدانوں میں تھے۔ اگر آج کا ضمیر انسانی ظلم کے خلاف چیخ رہا ہے، اگر آج مظلوموں کے لہو سے انسانیت کا پرچم بلند ہو رہا ہے، تو یہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ ماضی میں کون مظلوم تھا، کون ظالم، کس نے باطل کی مدد کی اور کس نے حق پر قربانی دی۔ کربلا میں یزید کے لشکر کو جو قوتیں حاصل تھیں، آج وہی طاغوتی قوتیں جدید شکل میں دنیا پر مسلط ہیں، اور حسینی جذبہ آج بھی وہی ہے جو صدیاں پہلے تھا۔

اگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ استعماری طاقتیں مظلوم اقوام کو روند رہی ہیں، اور پھر کچھ اقوام، کچھ افراد ان کے خلاف استقامت سے کھڑے ہیں، تو یہ ہمیں ماضی کے استقامت پیشہ اصحابِ حق کی یاد دلاتا ہے۔ آج اگر کوئی قوم یا جماعت اپنی جان، مال، عزت اور اقتدار کو قربان کر کے حق کی آواز بلند کر رہی ہے، تو وہی صفات ہمیں اصحابِ رسولؐ، اصحابِ علیؑ، اور انصارِ حسینؑ میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اور اگر کوئی گروہ دنیا کے مفاد کے لیے ظلم کے ساتھ کھڑا ہے، اگر کوئی اپنے مفاد یا تعصب کی خاطر باطل کی تائید کر رہا ہے، تو وہ بھی ہمیں ماضی کے باطل پرست کرداروں کی یاد دلاتا ہے، جیسے ابن زیاد، عمر بن سعد اور شمر۔

حق و باطل کا معیار کوئی وقتی اور جغرافیائی نہیں بلکہ ایک فطری، روحانی اور اخلاقی قدر ہے جو ہر دور، ہر قوم، ہر تہذیب اور ہر نسل میں ایک ہی طرح سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "یہ وقت الگ ہے، تاریخ کے فیصلے اس وقت کے مطابق تھے"، وہ دراصل اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ قوانینِ فطرت، ضمیرِ انسانی اور الٰہی سنتیں زمان

و مکان کی قید سے آزاد ہیں۔ انسان بدل سکتا ہے، ظاہری حالات بدل سکتے ہیں، ٹیکنالوجی بدل سکتی ہے، لیکن حق ہمیشہ حق رہے گا اور باطل ہمیشہ باطل۔

پس اگر ہم آج کے حالات میں صداقت، عدل، قربانی، دیانت، ظلم، فریب، استکبار اور استضعاف جیسے مفاہیم کا گہرائی سے تجزیہ کریں، تو ہم ماضی کے تاریخی اور دینی واقعات کو نہ صرف بہتر سمجھ سکتے ہیں بلکہ ان کے بارے میں درست نتائج بھی اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ بصیرت ہمیں تعصبات سے نکال کر حق کی شناخت عطا کرتی ہے، اور ہمیں تاریخ کو عقیدت یا نفرت کی عینک سے نہیں بلکہ فطری و فکری اصولوں کے ذریعے دیکھنے کی صلاحیت بخشتی ہے۔ امام علیؑ کا یہی مقصد تھا کہ انسان فہمِ تاریخ سے آگہی حاصل کرے، تاکہ وہ نہ صرف مستقبل کے فتنے پہچان سکے، بلکہ ماضی کے چہرے بھی حقیقت کی روشنی میں دیکھ سکے۔

امام علیؑ کا یہ گہرا اور حکیمانہ قول کہ "گزرے ہوئے حالات سے آنے والے زمانے کا قیاس کرو" دراصل ایک ایسا اصولی زاویۂ نگاہ ہے جو تاریخ، فطرت اور انسانی رویوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے۔ اگر اس کی روشنی میں پلٹ کر دیکھا جائے تو اسی زاویے سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ موجودہ حالات بھی ماضی کے آئینے کو روشن کرتے ہیں۔ جس طرح مستقبل کا رخ ماضی کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، ویسے ہی حال کے واقعات و حقائق ماضی کے اعمال اور نیتوں کا مظہر ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی میں کوئی بھی حادثہ، کوئی بھی سیاسی یا سماجی تبدیلی، اچانک اور بے جڑ نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک طویل سلسلہ اسباب و علل کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے، جس کا آغاز ہمیشہ ماضی میں کہیں ہوتا ہے۔

قوانینِ فطرت میں سب سے بنیادی اصول "سبب و مسبب" یعنی cause and effect کا قانون ہے، جو انسانوں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جیسے فزکس یا کیمسٹری کی کائناتی ترتیب پر۔ اگر آج کوئی قوم غلامی کا شکار ہے، تو ضروری ہے کہ اس نے کسی وقت آزادی کی قیمت کو نظر انداز کیا ہو۔ اگر آج ظلم کا غلبہ ہے، تو یقیناً کسی مرحلے پر حق کے ساتھ خیانت کی گئی ہو گی۔ اگر آج امت انتشار اور ذلت کا سامنا کر رہی ہے، تو وہ ایک مسلسل فکری، روحانی اور اخلاقی زوال کا نتیجہ ہے جو کل کے اعمال میں پوشیدہ تھا۔ یہی فطری قانون ہے کہ اعمال کے اثرات وقت کے ساتھ ابھرتے ہیں، اور جو آج ظاہر ہوتا ہے، وہ درحقیقت کل کے پوشیدہ فیصلوں اور رویوں کا پھل ہے۔

اسی اصول کی بنیاد پر جب ہم آج کے حالات پر نگاہ ڈالتے ہیں—چاہے وہ سیاسی غلامی ہو، معاشی بدحالی ہو، فکری زوال ہو یا روحانی سستی—تو ہمیں یہ جاننے کا راستہ بھی ملتا ہے کہ ماضی میں کہاں کہاں انحراف کیا گیا۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ امت مسلمہ باہم دست و گریبان ہے، تو ہم یہ جان سکتے ہیں کہ ماضی میں وحدتِ کلمہ کو نظر انداز کیا گیا، خلافت و امامت کی اصل حقیقت کو مسخ کیا گیا، دین کو دنیاوی اقتدار کا زینہ بنایا گیا، اور سچ بولنے والوں کو خاموش کر دیا گیا۔ جب ہم آج ظالموں کو طاقت میں اور مظلوموں کو پسپا دیکھتے ہیں، تو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ماضی میں ظالموں کے ساتھ سازباز کی گئی اور حق کے علَم برداروں کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔

اسی طرح جب ہم آج دیکھتے ہیں کہ کون سی تحریکیں، اقوام یا افراد عدل، سچائی، اور مظلوموں کی حمایت میں کھڑے ہیں، اور کون لوگ ظالموں کے مددگار ہیں، تو ہمیں ان سے ماضی کے کرداروں کو پہچاننے میں بھی مدد ملتی ہے۔ جو لوگ آج استقامت کا مظاہرہ کر رہے ہیں، جن کے کردار میں صداقت، قربانی، اور دیانت کی جھلک ہے، وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں اُن اہلِ حق کی جو ماضی میں تنہا مگر سرفراز تھے۔ اور جو لوگ آج فریب، جبر، اور مفاد پرستی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، وہ ہمیں ماضی کے اُن کرداروں کی یاد دلاتے ہیں جنہوں نے حق کو فروخت کیا اور دنیا کو خرید لیا۔ اس طرح موجودہ زمانہ ہمارے لیے ایک زندہ تجربہ گاہ بن جاتا ہے، جہاں ہم ہر چیز کو پرکھ کر ماضی کی حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔

قوانینِ فطرت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ حق و باطل کی تمیز صرف تاریخ کی کتابوں میں دفن نہ ہو بلکہ وہ ہر دور میں، ہر جگہ، اور ہر دل میں جاگزیں ہو۔ اسی لیے اگر ہم آج کے حقائق کو بغور اور دیانت سے دیکھیں تو وہ ہمیں تاریخ کے پیچیدہ واقعات کو سمجھنے میں نہایت گہرائی سے مدد دیتے ہیں۔ آج کا حق گو ماضی کے حق گو کی نشانی بن سکتا ہے، اور آج کا مکار و جابر ماضی کے منافق و ظالم کا چہرہ دکھا سکتا ہے۔ یہی وہ حکمت ہے جسے امام علیؑ نے اپنے مختصر مگر پر معنی قول میں سمو دیا۔

لہٰذا جب ہم موجودہ حالات کو فطرت کے قوانین کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو وہ نہ صرف ماضی کے فیصلوں کی بازگشت محسوس ہوتے ہیں بلکہ وہ ماضی کو جانچنے کا ایک آفاقی معیار بھی فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح حال اور ماضی دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے ایک روحانی و

فکری وحدت میں سمٹ آتے ہیں، جہاں ہر لمحہ ہمیں تعلیم دیتا ہے، ہر واقعہ ایک نشانی بن جاتا ہے، اور ہر کردار ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑ کر کہتا ہے: پہچانو! کیونکہ تاریخ صرف گزر نہیں جاتی، وہ زندہ رہتی ہے، اور اپنے آپ کو دہراتی ہے—مگر صرف اُن کے لیے جو دیکھنے اور سمجھنے کی آنکھ رکھتے ہیں۔

مال، حکومت اور مصیبت میں امتحان

امام علیؑ کا یہ قول کہ " تین چیزوں کے ذریعے لوگوں کی عقلوں کا امتحان لیا جاتا ہے: مال، حکومت اور مصیبت " انسانی شخصیت، اجتماعی نظم، اور روحانی و اخلاقی بلوغت کا ایسا جامع تجزیہ ہے جو نہ صرف فرد کی سطح پر بلکہ قوموں اور تہذیبوں کے زوال و عروج کے اسباب کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ یہ تین عناصر بظاہر الگ الگ ہیں، لیکن درحقیقت ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں۔ انسان کی عقل، اس کی بصیرت، اور اس کی داخلی تربیت کو جانچنے کے یہ بنیادی پیمانے ہیں جو نہ صرف اس کے کردار کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ اس کی اصل حقیقت کو عیاں کر دیتے ہیں۔

مال ایک ایسا عنصر ہے جو انسان کے باطن میں چھپے حرص، بخل، یا سخاوت، امانت اور قناعت کو بے نقاب کرتا ہے۔ مال جب ہاتھ میں آتا ہے تو دل کی کیفیت کھل جاتی ہے۔ جو شخص مال پا کر غرور میں آ جائے، دوسروں کو حقیر سمجھے، خود کو خود مختار سمجھنے لگے، یا اپنے مال سے دوسروں کو دبانے لگے، وہ دراصل عقل کے میدان میں ناکام ہے۔ اس کے برعکس جو شخص مال کو امانت سمجھے، اسے خدا کی نعمت مان کر خلقِ خدا کی خدمت میں استعمال کرے، اور مال کے ذریعے فخر یا ظلم کے بجائے فلاح و عدل کی راہ اپنائے، وہی حقیقی عاقل ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ امام علیؑ کے نزدیک مال کا امتحان انسان کے لیے ایک روحانی آزمائش ہے، جس میں عقل کی سطح ناپی جاتی ہے، اور جہاں کامیابی کا معیار صرف جمع کرنا نہیں بلکہ تقسیم کرنا ہے۔

حکومت، طاقت اور اقتدار کا معاملہ مال سے زیادہ شدید آزمائش کا مقام ہے۔ یہاں صرف ذاتی رویے ہی نہیں بلکہ اجتماعی انصاف، انسانوں کے حقوق، اور عدل کی برتری کا سوال درپیش ہوتا ہے۔ اقتدار ایک ایسا آئینہ ہے جو انسان کی نیت، اس کے نظریات اور اس کی تربیت کو برہنہ کر دیتا ہے۔ جو اقتدار پا کر خود کو خلیفۂ خدا سمجھنے کے بجائے خود کو فرعون بنانے لگے، وہ دراصل عقل کے زمرے سے نکل جاتا ہے۔ حکومت کے ذریعے عقل کا امتحان یہ ہے کہ انسان طاقت ملنے کے بعد کیسا برتاؤ کرتا ہے: کیا وہ عدل پر قائم رہتا ہے یا ظلم پر اتر آتا ہے، کیا وہ شریعت کے اصولوں کو نافذ کرتا ہے یا خواہشات کی پیروی کرتا ہے، کیا وہ کمزوروں کی دادرسی کرتا ہے یا صرف طاقتوروں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ امام علیؑ خود خلافت کی کرسی پر بیٹھے مگر ان کا لباس، ان کا طرزِ حکومت، ان کا مزاج اور ان کا عدل اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے حکومت کو عقل و تقویٰ کی روشنی میں استعمال کیا، نہ کہ تسلط اور جبر کے آلے کے طور پر۔

مصیبت تیسرا اور سب سے نازک پیمانہ ہے جس پر انسان کی عقل کی گہرائی ناپی جاتی ہے۔ مال اور حکومت میں تو انسان کے پاس کچھ نہ کچھ اختیار ہوتا ہے، لیکن مصیبت ایسی حالت ہے جہاں انسان بے بس دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں انسان کی اصل روح اس کی برداشت، اس کا ایمان، اس کا ضبط، اور اس کا فہم آشکار ہو جاتا ہے۔ مصیبت انسان کو

دو راستے دکھاتی ہے: یا تو وہ شکایت، شکوہ، اور جزع و فزع کے ذریعے بکھر جاتا ہے، یا صبر، رضا، اور حکمت کے ساتھ اس کا سامنا کرتا ہے اور اس کے ذریعے مزید بلند ہوتا ہے۔ امام علیؑ کی زندگی خود مصائب سے بھرپور تھی، مگر ان کا ردِ عمل ہمیشہ صبر، تحمل، تدبیر اور حکمت پر مبنی رہا۔ کرب و بلا کا صبر ہو یا خلفاء کے دور میں ان کا ضبط و سکوت، ہر جگہ وہ مصیبت میں بھی عقل کی روشنی سے فیصلے کرتے رہے۔

ان تینوں پیمانوں کو اگر ایک دوسرے کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپس میں گہرے ربط میں ہیں۔ مال کی زیادتی، حکومت کی طاقت اور مصیبت کا دباؤ ـــ یہ تینوں انسان کو بیک وقت آزما سکتے ہیں۔ ایک حکمران اگر مال پر قابو نہ رکھ سکے تو وہ رشوت و کرپشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک دولت مند اگر حکومت حاصل کر لے تو ظلم کی راہ پر چل سکتا ہے۔ اور جب مصیبت آجائے تو اگر اس کے پاس عقل نہ ہو تو وہ اپنی دولت اور حکومت کے باوجود تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر انسان کی عقل تربیت یافتہ ہو، اس میں دینی فہم، اخلاقی مزاج، اور روحانی شعور ہو، تو یہی تینوں چیزیں اس کے لیے عروج کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام علیؑ کے اس قول کو محض ایک اخلاقی وعظ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ دراصل ایک تہذیبی، فکری اور عملی چارٹر ہے۔ ایک فرد ہو یا ایک قوم، ایک معاشرہ ہو یا ایک حکومت ـــ ان سب کے زوال و عروج کا انحصار ان تین عناصر کے ساتھ ان کے رویے پر ہے۔ جو مال پا کر بھی متواضع رہے، حکومت پا کر بھی عادل رہے، اور مصیبت میں

بھی ثابت قدم رہے، وہی دراصل عقل کی بلند ترین منزل پر فائز ہے۔ اور یہی امام علیؑ کی تعلیمات کا نچوڑ ہے: انسان وہی کامیاب ہے جو آزمائش میں کھرا اترے، اور عقل وہی کارگر ہے جو اختیار اور اضطرار، دونوں میں یکساں بصیرت کے ساتھ رہنمائی کرے۔

محافل کے آداب

محفل ایک ایسا سماجی مظہر ہے جس میں افراد ایک دوسرے سے جُڑتے ہیں، خیالات کا تبادلہ کرتے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں، اور تعلقات کو استوار رکھتے ہیں۔ مگر اسلامی نقطہ نظر سے محفل محض انسانوں کا جمع ہونا نہیں بلکہ ایک اخلاقی، فکری اور معنوی فضا کا نام ہے۔ اگر ایک محفل میں مرد وزن کا اختلاط نہیں، ظاہری پردے کا اہتمام ہے، اور کوئی کھلی بے حیائی یا منکرات نہیں ہو رہے، تو بھی یہ کافی نہیں کہ اسے ایک مثالی یا مطلوبہ محفل قرار دیا جائے۔ کیونکہ اسلام نے صرف ظاہری حرمت یا حجاب کی تلقین نہیں کی بلکہ باطنی پاکیزگی، فکری بیداری اور معنوی ہدف کو بھی لازم قرار دیا ہے۔

محفلوں کی ساخت اور کیفیت ہماری اجتماعی روح کی عکاسی کرتی ہے۔ اگر ہماری محافل صرف وقت گزارنے، ہنسی مذاق، چائے، کھانے یا دنیاوی باتوں پر مرکوز ہوں تو وہ ہماری روح کو تقویت دینے کے بجائے صرف جسمانی لذت یا وقتی تسکین کا ذریعہ بن جائیں گی۔ نتیجتاً ہم ایک ایسی قوم میں ڈھل جاتے ہیں جو محافل تو منعقد کرتی ہے مگر مقصد کے بغیر، گفتگو کرتی ہے مگر فکر کے بغیر، اجتماع رکھتی ہے مگر روحانیت کے بغیر۔ ایسی محافل اگرچہ ظاہری طور پر مذہب سے متصادم نہ ہوں، مگر حقیقت میں وہ ہمارے دین کی اس روح سے خالی ہوتی ہیں جو فرد اور قوم کو امام حسینؑ جیسے ہدف پر زندہ رکھتی ہے۔

اہل بیتؑ کی تعلیمات میں مجلس اور محفل کا مرکزی مقام ہے۔ امام حسینؑ کی یاد میں برپا کی جانے والی مجالس صرف آنسو بہانے کا نام نہیں بلکہ شعور و بیداری کی وہ فضا ہے جس میں فرد اپنے نفس کو پہچانتا ہے، اپنے زمانے کی شناخت کرتا ہے، اور ظالم و مظلوم کے مابین فرق کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح امام زمانہؑ کی غیبت کے دور میں ہر وہ عمل جو دل کو ان کی یاد، ان کی ذمہ داری، اور ان کے انتظار سے دور کرے وہ ایک قسم کی معنوی غفلت ہے۔ اگر ہماری محافل اس فکر سے خالی ہیں تو چاہے وہ ظاہری لحاظ سے پاک ہوں، مگر وہ لاشعوری طور پر ہماری روح کو غفلت، سرد مہری اور بے معنویت کی طرف دھکیل رہی ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہر محفل میں وعظ ہو، ہر محفل میں دین کی ظاہری باتیں ہوں یا مذہبی زبان استعمال کی جائے۔ چائے کی محفل ہو، گپ شپ ہو، علمی بحث ہو، ادبی نشست ہو، دوستوں کا میل جول ہو، سب درست ہے۔ مگر ان سب کا بنیادی تاثر اور لاشعوری محور اگر امام حسینؑ کے قیام کی روح، ظلم سے بیزاری، سچائی کی محبت، اور امام زمانہؑ کے ظہور کی تیاری سے جڑا ہو تو یہی ایک محفل کو نورانی بنا دیتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جو "یُحیی ذِکرُنا" کے زمرے میں آتی ہے، جہاں اہل بیتؑ کی یاد صرف نام یا مصیبت کے ذکر میں نہیں بلکہ ان کے افکار و مشن کی شعوری بازگشت میں زندہ رہتی ہے۔

آج ہماری محافل میں سب کچھ ہے مگر کبھی کبھار مقصد کا شعور نہیں۔ ہم وقت گزارتے ہیں، تفریح کرتے ہیں، مختلف موضوعات پر بات کرتے ہیں، مگر اس وقت کو امامِ وقت کی قربت، اصلاحِ نفس یا شعورِ ظلم و عدل کی طرف نہیں موڑتے۔ نتیجتاً ہم بے ضرر ہوتے

ہوئے بھی بے اثر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملت کے اندر طاقت، مزاحمت، شعور اور بیداری پیدا نہیں ہوتی۔

لہٰذا وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی محافل کے ظاہری آداب کے ساتھ ساتھ ان کے معنوی وزن اور فکری مرکزیت پر بھی غور کریں۔ امام حسینؑ کا قیام صرف کربلا میں برپا نہیں ہوا بلکہ ہر اس محفل میں دوبارہ زندہ ہوتا ہے جہاں سچائی کی حمایت، ظلم کی مخالفت اور امام وقتؑ کی نصرت کا شعور بیدار کیا جائے۔ اور ہر وہ محفل جو ظاہری طور پر سنجیدہ مگر معنوی لحاظ سے بے مقصد ہو وہ ایک ایسا قافلہ ہے جو منزل کے بغیر سفر کر رہا ہو۔ ہمیں اپنی محفلوں کو قافلۂ حسینی کا حصہ بنانا ہے، تاکہ ظاہری آداب کے ساتھ باطنی پیغام بھی زندہ رہے اور ہم امام حسینؑ کے مشن اور امام زمانہؑ کے ظہور کے حقیقی منتظر بن سکیں۔

مذاہب کا فلسفہ

(Theory of Every Order in Religion)

کائنات کو جب ہم ایک مربوط، ہم آہنگ اور باقاعدہ نظام کے طور پر دیکھتے ہیں تو یہ سوال لازمی طور پر اُبھرتا ہے کہ کیا یہ سب کچھ محض اتفاقی ہے؟ کیا زندگی، مخلوقات، زمان و مکان کی ترتیب ایک بے نظم حادثے کا نتیجہ ہے؟ یا اس کے پیچھے کوئی شعوری ارادہ، کوئی عظیم مقصود اور کوئی بلند تر نظم کارفرما ہے؟ یہی وہ سوال ہے جہاں سے الٰہی ادیان اور خاص طور پر "تھیوری آف ایوری آرڈر ان ریلیجن" یا "ہر ترتیب کے ماورائی مفہوم" کا تصور جنم لیتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق، نہ صرف کائنات کی ساخت، بلکہ اس میں جاری ہر نظم، ہر قانون، اور ہر مظہر ایک الٰہی حکمت کے تابع ہے۔ مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے، وہ ایک خاص مقصد کے تحت تخلیق کیا گیا ہے۔ کوئی چیز عبث نہیں، کوئی وجود بے معنی نہیں، اور کوئی لمحہ بے کار نہیں۔

الٰہی ادیان اس کائناتی ترتیب کو محض ایک سائنسی نظم کے طور پر پیش نہیں کرتے، بلکہ اسے ایک اخلاقی و روحانی ترتیب کے طور پر بھی متعارف کرواتے ہیں۔ اس ترتیب میں سب سے اعلیٰ و اشرف مخلوق "انسان" ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شعور، ارادہ، فہم اور اختیار دے کر خلافت کے منصب پر فائز کیا۔ یہ خلافت محض زمینی اقتدار یا مادی ترقی کی علامت نہیں، بلکہ

ایک گہری ذمہ داری ہے۔ قرآن واضح انداز میں فرماتا ہے کہ "میں نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا"۔ یہ آیت انسان کی تخلیق کا مقصد طے کر دیتی ہے، اور "عبادت" کا مفہوم صرف ظاہری مراسم تک محدود نہیں، بلکہ اس کا مطلب ہے اللہ کی پہچان، اُس کے نظام میں جذب ہونا، اُس کی صفاتِ حسنہ کو زمین پر ظاہر کرنا، اور اپنی زندگی کو اس کے ارادے کے مطابق ڈھال دینا۔

"تھیوری آف ایوری آرڈر" کا مفہوم اسی تصور سے گہرائی سے جُڑا ہے۔ کائنات میں ہر شے کی ایک جگہ ہے، ہر عمل کا ایک وقت ہے، ہر نتیجے کا ایک موقع ہے۔ یہ ترتیب انسان سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ خود کو اس اعلیٰ ترتیب کے ساتھ ہم آہنگ کرے، اور اپنے نفس کی بے ترتیبی کو خدائی نظم میں ضم کرے۔ جب انسان اپنے ارادے کو خدا کے ارادے کے تابع کر دیتا ہے، تب وہ اس کائناتی ہارمونی کا حصہ بن جاتا ہے، جہاں ہر چیز اپنے رب کی تسبیح کر رہی ہے۔ الٰہی ادیان اسی ہم آہنگی کا درس دیتے ہیں — کہ انسان اپنے اندر بھی اور باہر بھی ایک مقدس ترتیب کو پہچانے، اُس کا احترام کرے، اور اپنی زندگی کو اُس کے مطابق ترتیب دے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں مذہب، عقل، اخلاق اور روحانیت ایک نکتے پر جمع ہوتے ہیں۔ مذہب انسان کو یہ نہیں سکھاتا کہ وہ اپنے عقلی یا سائنسی سوالات ترک کر دے، بلکہ یہ سکھاتا ہے کہ وہ اپنی عقل کو ایک بڑی سچائی کا مطیع بنائے۔ ہر نظام، ہر دائرہ، ہر تعلق اور ہر جذباتی و نفسیاتی کیفیت بھی ایک خدائی ترتیب کے ماتحت ہے۔ انسان جب اس ترتیب کو سمجھتا ہے تو

وہ بے معنویت کے احساس سے نکل کر ایک مقصدی زندگی کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کے اعمال، اس کے رویے، اس کی نیتیں اور اس کے فیصلے ایک بڑی حقیقت کا حصہ ہیں۔ اس کی زندگی صرف ایک انفرادی حادثہ نہیں بلکہ ایک عالمی نظم کا شعوری جزو ہے۔

جب انسان اس خدائی ترتیب سے کٹ جاتا ہے، تو اس کی ذات میں انتشار، اس کے معاشرے میں فتنہ، اور اس کے ذہن میں بے یقینی پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کو خود اپنے چھوٹے سے ارادے سے کنٹرول کرنا چاہتا ہے، ہر چیز کو اپنی خواہشات کی کسوٹی پر پرکھنے لگتا ہے، اور یوں وہ اس عظیم ترتیب کے خلاف بغاوت پر اُتر آتا ہے جس میں اس کا اپنا وجود بھی تخلیق ہوا۔ الٰہی ادیان ہمیں بار بار یاد دلاتے ہیں کہ حقیقی سکون تب ہی حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی جگہ کو پہچان کر، اپنے منصب کو سمجھ کر، اپنے مقصدِ تخلیق کو جان کر، خود کو اُس الٰہی ترتیب کے تابع کر دیتا ہے جو کائنات کے ہر ذرے میں بول رہی ہے۔

تھیوری آف ایوری آرڈر ان ریلیجن درحقیقت ایک زندگی کا فلسفہ ہے، ایک روحانی مقام ہے، ایک اخلاقی فریم ورک ہے۔ یہ انسان کو یاد دلاتی ہے کہ وہ محض ایک بے چین ذہن، ایک بھٹکتی خواہش یا ایک مادی وجود نہیں، بلکہ وہ ایک مقدس نظم کا حصہ ہے۔ وہ اس دنیا میں صرف جینے، کھانے، کمانے یا بڑھنے کے لیے نہیں آیا، بلکہ اس لیے آیا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے، اُس کی رضا کو حاصل کرے، اور زمین پر اُس کا نور بن جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں الٰہی ادیان کا اصل پیغام اور کائنات کی ہر ترتیب کا راز کھلتا ہے — کہ انسان خود بھی ایک ترتیب کا حصہ ہے، اور اُس کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اُس ترتیب میں جذب کر دے جسے خدا نے ازل سے ابد تک بچھا رکھا ہے۔

کائنات کا مشاہدہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس کی ہر حرکت، ہر تغیر، ہر وجود اور ہر رشتہ ایک مکمل نظم کا حصہ ہے۔ یہ نظم صرف فزکس یا بایولوجی کی سطح تک محدود نہیں، بلکہ انسانی شعور، اخلاق، معاشرت، تہذیب، سیاست، معیشت اور تمدن کی گہرائیوں میں بھی سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر "تھیوری آف ایوری آرڈر ان ریلیجن" کھڑی ہے — یعنی دین فقط عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل ترتیبِ کائنات کی شعوری شرکت ہے، جس میں انسان کا ہر انفرادی و اجتماعی قدم الٰہی ہدفِ تخلیق سے جڑا ہوا ہے۔

اس تھیوری کا مرکز یہ ہے کہ خدا نے کائنات کو بے سبب نہیں بنایا، اور نہ ہی انسان کو بے کار چھوڑا۔ جس طرح سورج، چاند، ہوائیں، پانی، نباتات اور جانور ایک واضح طبعی و حیاتیاتی نظم کے تحت کام کر رہے ہیں، اسی طرح انسانی تمدن، سیاست، معیشت، علم، ابلاغ، خاندان اور دفاع بھی اگر الٰہی نظم کے تابع ہوں تو عدل، توازن، امن اور فلاح حاصل ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ ادارے الٰہی نظم سے کٹ جاتے ہیں اور انسانی خواہش، مفاد اور غرور کے تابع ہو جاتے ہیں، تو یہی شعبے فساد، ظلم اور ٹوٹ پھوٹ کا سبب بن جاتے ہیں۔

مثلاً سیاست اگر فقط طاقت، کرسی اور اقتدار کی ہوس بن جائے اور اس میں حق، عدل، مشورہ اور ذمہ داری کے دینی اصول نہ ہوں تو یہ فساد، جبر اور منافقت کو جنم دیتی ہے۔ لیکن

اگر یہی سیاست الٰہی ترتیب کا حصہ بن جائے، جہاں اقتدار کو امانت سمجھا جائے اور عوام کی خدمت عبادت ہو، تو یہی نظام انصاف کا ضامن بن جاتا ہے۔ حکومت نبوی ص وعلویؑ اس کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، جہاں سیاسی طاقت کو ذاتی ملکیت نہیں بلکہ اجتماعی ذمہ داری سمجھا گیا۔

معیشت کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں۔ اگر دولت کو صرف ذاتی مفاد، سرمائے کے ارتکاز اور منافع خوری کا ذریعہ بنایا جائے، تو یہی معیشت معاشرتی ناہمواری، غربت اور طبقاتی تصادم کو جنم دیتی ہے۔ لیکن اگر اسی نظامِ معیشت کو زکوٰۃ، صدقات، تجارتِ حلال، منصفانہ تقسیمِ وسائل اور حقِ معاش جیسے الٰہی اصولوں کے تابع کیا جائے تو معیشت معاشرے کے تمام طبقات کو زندگی کی بنیادی سہولیات فراہم کر سکتی ہے۔ سود سے پاک معیشت اور بیت المال کا تصور اسی "ایوری آرڈر" کی روح ہے۔

تعلیم اگر صرف ڈگریوں اور روزگار کی تلاش کے گرد گھومتی رہے تو وہ انسان کو محض ایک مشین یا صارف بناتی ہے۔ لیکن اگر تعلیم کا مقصد تزکیہ، معرفت، اخلاق، فہمِ وحی، اور شعورِ انسانی ہو تو یہی تعلیم نسلوں کو نظریاتی و اخلاقی قیادت فراہم کرتی ہے۔ پیغمبر اکرم صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں" اسی نظریۂ ترتیبِ ربانی کو بیان کرتا ہے کہ علم صرف ہنر نہیں بلکہ ذمہ داری اور ہدایت ہے۔

ابلاغیات یا میڈیا جب محض تفریح، منافع یا رائے سازی کا ہتھیار بن جائے تو وہ سچائی کو مسخ کر دیتا ہے، ذہنوں کو غلام بناتا ہے اور اقدار کو مٹا دیتا ہے۔ لیکن اگر میڈیا کو ایک مقدس امانت سمجھا جائے، اور اس کے ذریعے سچ، عدل، شعور اور اخلاق عام کیا جائے، تو یہ ادارہ

امت کے فکری وروحانی احیاء کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ قرآن کا خود "بلاغ مبین" ہونا، نبیؐ کا "مبشر و نذیر" ہونا، اور ائمہ معصومین ع کا "ناشرین حق" بننا، سب اسی نظریے کے مظاہر ہیں۔

سماجی اور عائلی نظام بھی اسی ترتیبِ الٰہی کا حصہ ہے۔ اگر خاندان صرف رسم و رواج، جذباتی دباؤ، یا ذاتی تسکین کے گرد گھومے تو اس میں انتشار، بے اعتباری اور ٹوٹ پھوٹ جنم لیتی ہے۔ لیکن اگر عائلی نظام کو محبت، مروّت، قوامیت، عفت، امانت اور تربیت کے اصولوں پر استوار کیا جائے، تو یہی خاندان معاشرے کے امن، تہذیب اور نسلوں کی درستگی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ نبیؐ کے گھرانہ، اہل بیتؑ کی حیات اور ائمہ کی سیرت، اس ترتیب کے زندہ مظاہر ہیں۔

دفاع، جنگ اور طاقت اگر محض غلبے اور تسلط کے لیے ہو تو یہ فساد، استبداد اور خونریزی کو جنم دیتا ہے۔ لیکن اگر دفاع، ظلم سے نجات، مظلوم کی حمایت، اور امن کے قیام کے لیے ہو، تو یہی قوت دنیا میں عدل کا توازن قائم کرتی ہے۔ اسلامی جہاد کا فلسفہ، دشمن سے پہلے صلح کی دعوت، قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک، جنگ میں بچوں، عورتوں، فصلوں اور عبادت گاہوں کی حفاظت — یہ سب اسی الٰہی ترتیب کے عملی مظاہر ہیں۔

"تھیوری آف ایوری آرڈر ان ریلیجن" کا یہ تقاضا ہے کہ زندگی کے تمام شعبے الگ الگ خانوں میں بند نہ ہوں، بلکہ ہر شعبہ دین کے مرکز سے جُڑا ہو۔ اللہ کے ہدفِ تخلیق سے ہٹ کر اگر کوئی نظام ترتیب پاتا ہے، تو وہ بظاہر کتنا ہی ترقی یافتہ ہو، اندر سے کھوکھلا اور انجام کے

اعتبار سے زوال پذیر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کے جدید،طاقتور اور ترقی یافتہ معاشرے اپنی معیشت، ٹیکنالوجی اور فوجی برتری کے باوجود روحانی بحران، ذہنی اضطراب، خاندانی ٹوٹ پھوٹ اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہو چکے ہیں۔

اسلام کا تصورِ زندگی اس بات کا اعلان ہے کہ انسان کا ہر عمل، ہر فیصلہ، ہر رشتہ، ہر ادارہ اور ہر تحریک ایک الٰہی ترتیب میں شامل ہو، نہ کہ اُس ترتیب کے منافی۔ یہ ترتیب وہی ہے جس میں رسولؐ کا اسوہ، قرآن کا ہدایت نامہ، اور اہلِ حق کی قربانیاں ہمیں زندگی کے ہر دائرے میں توازن، حق، اور کمال کا راستہ دکھاتی ہیں۔

اسلام کے اخلاقی، فقہی اور فلسفیانہ نظام کی بنیاد نہ صرف اعمال کی نوعیت پر ہے بلکہ اُن کے نتائج اور اثرات پر بھی گہری نظر رکھتا ہے۔ فقہِ اسلامی میں بہت سے ایسے اصول موجود ہیں جو "مآلِ فعل" یعنی کسی عمل کے انجام اور اس کے نتائج کو مد نظر رکھ کر حلال و حرام کا تعین کرتے ہیں۔ یہ صرف ظاہر پر حکم دینے کا نظام نہیں بلکہ باطن اور انجام تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ یہ بات ایک اصولی اور فطری حقیقت کے طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ ہر وہ عمل جس کا حتمی نتیجہ فساد، تباہی، بگاڑ، ظلم، بغاوت، بے چینی، فتنہ، اور منفی اثرات کی صورت میں ظاہر ہو، وہ شریعت میں حرام کے درجے میں آتا ہے، چاہے اُس کی صورت کتنی ہی مباح یا بے ضرر کیوں نہ ہو۔ اور اس کے برعکس، ہر وہ عمل جو بالآخر خیر، اصلاح، سکون، تعمیری رویے، عدل، علم، محبت، اور انسانی نجات کا ذریعہ بنے، وہ حلال، بلکہ مستحسن اور بابرکت قرار پاتا ہے، چاہے وہ ظاہری طور پر چھوٹا، معمولی یا غیر مؤثر ہی کیوں نہ لگے۔

یہ اصول قرآن کی متعدد آیات میں بالواسطہ اور براہ راست بیان ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " :واللہ لایحب الفساد —— " اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اور اسی طرح فرمایا گیا: ولا تعثوافی الأرض مفسدین، زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔ ان آیات میں صرف عملِ فساد ہی کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا، بلکہ وہ تمام رویے، ارادے اور حکمتِ عملی بھی، جو بالآخر فساد کا پیش خیمہ بنتی ہیں، ممنوع قرار پاتی ہیں۔ یہی بنیاد ہے کہ فقہاء نے وہ تمام اقتصادی، سیاسی، سماجی اور حتیٰ کہ ثقافتی وفکری اقدامات جو کسی طبقے، قوم یا پورے معاشرے کے لیے ضرر اور انحطاط کا سبب بنتے ہیں، ان کو دائرۂ حرام میں شامل کیا ہے، خواہ وہ سودی نظام ہو یا گمراہ کن تعلیم، غلط معلومات پر مبنی میڈیا ہو یا بگاڑ پیدا کرنے والا سیاسی بیانیہ، سب اس کلیے کے تحت ناجائز ٹھہرتے ہیں۔

یہی اصول ہمیں انفرادی سطح پر بھی رہنمائی دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص عبادت کے نام پر ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جو اس کے نفس میں تکبر پیدا کرے، یا اس کے رشتوں میں تلخی کا باعث بنے، یا وہ دین کو ایسا ظاہر کرے جو دوسروں کو دین سے دور کر دے، تو وہ ظاہری طور پر عبادت ہے، مگر اس کا انجام تباہی ہے، اور یہی انجام اُس کے عمل کو قابلِ گرفت بناتا ہے۔ اسی طرح کوئی عمل بظاہر کھیل، تفریح یا تجارت ہو، لیکن اگر اس کا نتیجہ نوجوان نسل کی بربادی، وقت کا ضیاع، ذہنی انتشار، یا معاشی استحصال ہو، تو وہ حرام کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے۔

دوسری جانب، وہ تمام اعمال جو انسان کو علم، سکون، معرفت، انصاف، صبر، ہمدردی، خیر خواہی اور تعمیرِ معاشرہ کی طرف لے جائیں، وہ اگرچہ ظاہراً دنیاوی کام ہوں، جیسے کسی کو تعلیم دینا، کسی کی کفالت کرنا، سچ بولنا، راستہ صاف رکھنا، علم پھیلانا، یا صحت مند تفریح فراہم کرنا، یہ سب شریعت کے مطابق "حلال" ہی نہیں بلکہ عبادت کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ ان کا مآل یعنی آخری نتیجہ تخلیق، امن اور خیر ہے۔

یہ اصول ہمیں دین کی روحانی اور عقلی گہرائی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اسلام کسی بھی چیز کو محض رسمی شکل پر نہیں پرکھتا بلکہ اس کے اصل مفہوم، نیت اور اثر پر نظر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار عقل، تدبر، تفقہ، اور بصیرت کی دعوت دی گئی ہے تاکہ انسان محض ظاہر نہ دیکھے بلکہ کسی بھی عمل کے دور رس اثرات کو سمجھے۔ اسی اصول کو "سد الذرائع" یعنی "فساد تک پہنچانے والے ذریعے کو بند کرنا" اور "فتح الذرائع" یعنی "بھلائی تک پہنچانے والے عمل کو جائز قرار دینا" کی صورت میں فقہ میں باقاعدہ اصول کی شکل دے دی گئی ہے۔

اس بنیاد پر دیکھا جائے تو اسلام نہ صرف فقہ بلکہ سوشیالوجی، اخلاق، سیاست، معیشت، تعلیم، میڈیا اور بین الاقوامی تعلقات تک کے لیے ایک جامع اصول فراہم کرتا ہے: جو چیز آخر کار بگاڑ پیدا کرتی ہے، وہ حرام ہے، چاہے وہ بظاہر کسی فائدے یا ضرورت کے نام پر کی جا رہی ہو؛ اور جو چیز آخر کار فلاح، تعمیر اور سکون کا ذریعہ بنتی ہے، وہ جائز ہے، بلکہ بعض اوقات واجب یا افضل بن جاتی ہے، چاہے وہ دنیاوی کام ہی کیوں نہ ہو۔

یہ اصول ہمیں زندگی کے تمام دائروں میں خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے کہ ہم محض کسی عمل کی نیت یا وقتی فائدے پر نہ جائیں، بلکہ اس کے طویل مدتی اثرات پر بھی غور کریں۔ یہی وہ گہرائی ہے جو اسلام کو محض رسمی مذہب نہیں، بلکہ ایک مکمل اخلاقی اور تمدنی نظام بناتی ہے۔

پس، اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ہر چیز کے لیے ایک ترتیب مقرر ہے اور ایک ہی فارمولا ہے، اور دین کا کام انسان کو اُس ترتیب کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے ہر عمل کے وقت اس اسکیل یا فارمولے کو مد نظر رکھنا ہے۔ یہ صرف عبادات کی ترتیب نہیں، بلکہ سیاست سے معیشت، تعلیم سے ابلاغ، خاندان سے ریاست، امن سے دفاع تک ہر چیز کی ایسی ہمہ گیر خدائی ترتیب ہے جس میں انسان کا سکون، دنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات چھپی ہوئی ہے۔ اور جو اس ترتیب کو قبول کرتا ہے، وہی دراصل خدا کے ہدفِ تخلیق کو پالیتا ہے۔

مسلمانوں کا سنہری دور اور ائمہ اہلبیتؑ کا کردار

مسلمانوں کے سنہری دور کو، جسے عموماً "اسلامی گولڈن ایج" (750ء تا 1258ء) کہا جاتا ہے، علم، حکمت، سائنس، فلسفہ اور تہذیب کا وہ درخشاں باب مانا جاتا ہے جس میں مسلمانوں نے علم کی دنیا کو نئی جہات عطا کیں۔ اس دور میں جن شخصیات نے سائنس، طب، ریاضی، فلکیات، کیمیا اور فلسفہ جیسے شعبہ جات میں بے مثال خدمات انجام دیں، ان میں ابنِ سینا، فارابی، رازی، خوارزمی، ابن الہیثم، نصیر الدین طوسی، جابر بن حیان، ابن رشد، اور کئی دیگر عظیم دماغ شامل ہیں۔ ان کی دریافتیں آج بھی انسانی تہذیب کی بنیادوں میں شمار ہوتی ہیں۔

ان مسلم دانشوروں کے مذہبی پس منظر یعنی فرقے کا جائزہ لیں تو ان میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد ملتے ہیں، تاہم قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان میں ایک قابلِ لحاظ تعداد ان افراد کی ہے جن کے عقائد و افکار اہلِ تشیع کے اصولوں سے قریب تر یا صریحاً شیعہ تھے، خصوصاً جابر بن حیان، نصیر الدین طوسی اور ابن سینا جیسے افراد۔

جابر بن حیان کو کیمیا (Alchemy) کا بانی کہا جاتا ہے۔ وہ امام جعفر صادقؑ کے براہِ راست شاگرد تھے۔ ان کی علمی بنیاد امام صادقؑ نے رکھی۔ جابر کے سینکڑوں رسائل و کتابیں علمی و سائنسی ذخیرے کا وہ گنجینہ ہیں جس سے بعد کی تمام سائنسی تحریکوں نے استفادہ کیا۔ جابر بن

حیان اپنے استاد امام جعفر صادقؑ کا تذکرہ نہایت ادب و احترام سے کرتے ہیں اور اپنی اکثر تحریروں میں ان کے اقوال اور علوم کو حوالہ بناتے ہیں۔ امام صادقؑ کی تعلیمات میں تجربہ، مشاہدہ، عقل، منطق، اور فطرت کے اصولوں پر خاص زور دیا گیا، جو سائنسی تحقیق کا بنیادی طریقہ ہے۔ یہی وہ علمی روح تھی جس نے جابر بن حیان کی فکری بنیادوں کو مستحکم کیا۔

نصیر الدین طوسی کا تعلق بھی اہل تشیع سے تھا۔ وہ ایک عظیم فلسفی، ریاضی دان، اور فلکیات دان تھے۔ ہلاکو خان کے ساتھ ان کی وابستگی اور مراغہ کی رصد گاہ کا قیام ان کی علمی بصیرت کا مظہر ہے۔ طوسی نے نہ صرف سائنس کے میدان میں کام کیا بلکہ عقائدِ اہلِ تشیع کی علمی و منطقی بنیادوں کو بھی تقویت بخشی۔ ان کے نظریات اور علمی رویہ معصومینؑ کی اس فکری و علمی روایت سے جڑا ہوا ہے جو عقل، علم، اور تفکر پر زور دیتی ہے۔

ابنِ سینا، جنہیں مغرب میں Avicenna کہا جاتا ہے، طب، فلسفہ اور منطق کے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق بخارا سے تھا اور اگرچہ ان کے فرقے کے بارے میں مکمل قطعیت سے بات نہیں کی جا سکتی، لیکن ان کے فلسفیانہ نظریات بالخصوص وجود، عقلِ فعّال اور واجب الوجود کے تصورات امامیہ مکتب فکر سے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔ ابنِ سینا کے نظریات پر امامیہ فلسفے کا اثر نمایاں ہے، اگرچہ انہوں نے اہلِ تسنن ماحول میں پرورش پائی، لیکن ان کا رجحان ایک عقلی، آزاد اور ماورائے فرقہ تحقیق کی طرف تھا جو اہل تشیع کے علمی طریقہ کار سے ہم آہنگ ہے۔

امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے علمی دور کو اگر مسلمانوں کی علمی بنیاد کا "سنٹرل پوائنٹ" کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہو گا۔ ان ائمہؑ نے نہ صرف علومِ دینیہ کی اشاعت کی بلکہ منطق، طب، کیمیا، ریاضی، فلکیات، اور طبیعیات جیسے علوم کی بھی تعلیم دی۔ امام صادقؑ کے حلقہ درس میں مختلف مکاتب فکر کے افراد شریک ہوتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں جابر بن حیان کے علاوہ ہشام بن حکم (فلسفہ و منطق)، مفضل بن عمر (روحیات و سائیکالوجی) اور کئی دیگر مشہور نام ہیں جنہوں نے اسلامی سائنسی روایت کو جنم دیا۔

یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ائمہ معصومینؑ کا علمی کردار صرف مذہبی دائرے تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ انسانی عقل و فہم کو اس کی اعلیٰ ترین منزلوں تک لے جانے والے رہنما تھے۔ ان کی روش یہ تھی کہ انسان فطرت کو سمجھے، اس میں غور کرے، اس کے اندر کار فرما قوانین کو دریافت کرے اور ان قوانین کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل کرے۔ یہی وہ راستہ تھا جسے بعد کے سائنسدانوں نے اختیار کیا، چاہے وہ شیعہ ہوں یا سنی، ان کی فکری جڑیں ائمہؑ کی اس علمی تحریک سے مربوط تھیں جس نے وحی و عقل کو ایک ساتھ چلنے کی ترغیب دی۔

سنہری اسلامی دور کی سائنسی تاریخ میں بہت سے ایسے دانشور اور سائنسدان شامل ہیں جنہوں نے نہ صرف مسلم دنیا کو علمی ترقی دی بلکہ یورپ کے نشاۃ الثانیہ (Renaissance) کو علمی غذا فراہم کی۔ ان میں سے کئی ایسے تھے جن کی مذہبی وابستگی یا تو واضح طور پر اہل تشیع کے مکتب سے تھی یا ان کا جھکاؤ عقلی و فلسفیانہ روش کے باعث اس

مکتب سے قریب تر تھا۔ یہ افراد علمی، فکری اور سائنسی روایت کے وہ چراغ تھے جنہوں نے ائمہ معصومینؑ کے فکری اثرات سے یا براہِ راست تعلیم سے کسبِ نور کیا۔

ابو سہل ویجن بن رستم القوھندی، جنہوں نے ریاضی اور فلکیات میں گراں قدر خدمات انجام دیں، اہلِ ری کے باشندے تھے۔ اہلِ ری کا شہر ایک طویل عرصے تک اہل تشیع کا علمی مرکز رہا اور وہاں کے اکثر دانشوروں کا علمی رجحان شیعی افکار سے متاثر رہا۔ القوھندی کے آثار میں علمِ ہئیت اور کونیاتی ساخت کے بارے میں شیعی کلامی مباحث کی جھلک ملتی ہے، بالخصوص جب وہ کائنات کے مبدء و معاد کی بات کرتے ہیں۔

ابو محمد الحسن بن موسیٰ النوبختی، جو بغداد کے عباسی دربار سے بھی وابستہ رہے، علم کلام، نجوم اور طبیعیات کے میدان میں نمایاں تھے۔ وہ صریحاً شیعہ امامیہ تھے اور ان کا خانوادہ اہل بیتؑ کا قدردان و پیرو تھا۔ ان کی تحریریں عقائدِ شیعہ کو منطقی بنیادوں پر استوار کرنے کے ساتھ ساتھ سائنسی مشاہدات سے بھی مزین تھیں۔ ان کے استاد درحقیقت وہی علمی فضا تھی جو امام جعفر صادقؑ اور ان کے بعد کے ائمہؑ نے پیدا کی، جو منطق، کلام اور فطری علوم کو یکجا کرتی تھی۔

ابو الفتح عبد الرحمن الخازنی، جو نیشاپور یا خراسان کے خطے سے تعلق رکھتے تھے، میکانکس، ہائیڈروسٹاٹکس، اور فلکیات میں یگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں طبیعی دنیا کی باریکیوں پر غیر معمولی گرفت نظر آتی ہے۔ اگرچہ ان کا مذہب قطعی طور پر معلوم نہیں،

مگر جن علاقوں سے ان کا تعلق تھا، وہ طویل عرصے تک شیعی تفکر کے مراکز رہے، اور ان کے علمی منہج میں عقل و مشاہدہ کی وہی ہم آہنگی ملتی ہے جو امامیہ مدرسہ فکر کا خاصہ رہی ہے۔

ابوزکریا یحییٰ بن عدی، ایک اور نمایاں فلسفی اور منطقی، اگرچہ مذہباً عیسائی تھے، لیکن ان کے تمام اساتذہ مسلمان تھے، جن میں ابو نصر فارابی اور ابو سلیمان سجستانی جیسے فلسفی شامل ہیں۔ خاص طور پر ابو سلیمان سجستانی کے متعلق روایت ہے کہ وہ شیعی رجحان رکھتے تھے اور علم کلام میں امامیہ تفکر کو عمیق نگاہ سے سمجھتے تھے۔ ابن عدی نے جن مباحث پر کام کیا وہ وحدتِ وجود، خالق و مخلوق کا تعلق، اور علت و معلول جیسے مسائل تھے جو شیعہ فلسفے کے بنیادی ستون ہیں۔

ابن زرقالہ (Zarqali) کا تعلق اندلس سے تھا اور وہ ماہر فلکیات و ریاضی دان تھے۔ ان کا رجحان فلسفہ اور فلکی مشاہدے کی طرف زیادہ تھا۔ اندلس اگرچہ سنّی غلبے کا علاقہ تھا، مگر وہاں کی علمی فضا آزاد تھی اور اہل تشیع کے فکری اثرات وہاں کے دانشور حلقوں میں موجود تھے، خاص طور پر ابن مسرہ اور ابن حزم جیسے فلسفیوں کے ذریعے، جنہوں نے کلامی مسائل کو عقلی بنیاد پر بیان کیا۔ ابن زرقالہ کی تحقیق میں جو عقلی تجزیہ دکھائی دیتا ہے وہ ان ہی اثرات کا عکس تھا۔

ابوریحان البیرونی، جو خیبر پختونخوا کے قریبی علاقے بیرون (موجودہ ازبکستان سے قریب) سے تعلق رکھتے تھے، سائنس، طب، جغرافیہ اور فلکیات میں ایک انقلابی مفکر تھے۔ ان کا

مذہب خود انہوں نے کھل کر بیان نہیں کیا، مگر ان کی کتب میں متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں وہ ائمہ اہل بیتؑ کے احترام میں گفتگو کرتے ہیں، اور ان کا منطقی و تحقیقی منہج امام جعفر صادقؑ کی فکر سے مشابہت رکھتا ہے۔ البیرونی کا تعلق خوارزم کے علمی حلقے سے تھا جو کئی صدیوں تک شیعی فکر کا گہوارہ رہا۔

اسی طرح قطب الدین شیرازی کا تعلق ایک صریحاً شیعہ گھرانے سے تھا۔ وہ خواجہ نصیر الدین طوسی کے شاگرد تھے اور انہوں نے "تحریر المجسطی" جیسے فلکیاتی و فلسفیانہ متون کی شرح لکھی۔ ان کے استاد طوسی اور ان کے علمی حلقہ نے انہیں جو وراثت دی، وہ عقل و تجربہ، مشاہدہ اور قیاس کی ایسی ترکیب تھی جو شیعہ فکری روایت کا حصہ رہی ہے۔

ان تمام دانشوروں کی تعلیم و تربیت یا تو براہ راست اہل بیتؑ کی قائم کردہ علمی روح سے متاثر ہوئی، یا ان اساتذہ کے ذریعے ان تک پہنچی جنہوں نے معصومینؑ کے علم سے سیرابی حاصل کی۔ علمی منہج، جو تجربہ، عقل، مشاہدہ، وحی اور منطق کا امتزاج تھا، دراصل وہی تھا جسے امام صادقؑ اور دیگر ائمہؑ نے اپنے دور میں جاری کیا۔ ان ائمہؑ کا یہ احسانِ عظیم تھا کہ انہوں نے علم کو عبادت کا درجہ دیا، فکر کو طہارت بخشی، اور عقل کو وحی کے ساتھ ہم آہنگ کر کے وہ ماحول فراہم کیا جہاں سائنس اور دین ایک دوسرے کے متضاد نہیں، بلکہ معاون و شریک دکھائی دیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی سنہری دور کے اکثر بڑے دماغوں کی فکری ساخت، چاہے وہ کسی ظاہری فرقے سے وابستہ ہوں، اہل بیتؑ کی فکری وراثت کی گواہی دیتی ہے۔

اسلامی سنہری دور کی سائنسی ترقی کو اگر ایک درخت مانا جائے تو اس کی جڑیں اہل بیتؑ کی تعلیمات میں پیوست ہیں۔ ان ائمہؑ نے علمی تحرک کو عبادت کا درجہ دیا، عقل کو ایمان کا ستون بتایا، اور علم کو نور قرار دیا۔ ان کا یہ پیغام تھا کہ دین اور سائنس، وحی اور عقل، روایت اور تجربہ، سب ایک ہی سرچشمے کے متفرق زاویے ہیں، اور یہی وہ اصول ہے جس نے مسلمانوں کو وہ درخشانی عطا کی جو قرونِ وسطیٰ کی تاریکیوں میں دنیا کے لیے مینارِ نور بنی۔

معصومؑ کے عَلَم، ذوالجناح اور حکومت کی شبیہ

شبیہ کا مفہوم اسلامی تہذیب اور اہلِ تشیع کی دینی روایت میں محض کسی چیز کی ظاہری نقل یا تصویری نمائندگی نہیں، بلکہ ایک روحانی اور معنوی علامت ہے جو اصل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کربلا کے واقعات کو زندہ رکھنے اور عوام الناس کے شعور میں ان کے اثر کو گہرائی کے ساتھ منتقل کرنے کے لیے جن اشیاء کو اختیار کیا جاتا ہے، جیسے تابوتِ علی اکبرؑ، علمِ حضرت عباسؑ، ذوالجناح، ضریح، خیمے، مشک، یا قمیصِ خون آلود، یہ سب اشیاء ان عظیم ہستیوں کی تمثیلی یادگار کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کا مقصد حقیقت کو مجسم کرنا نہیں بلکہ حقیقت کو ذہن و دل میں زندہ رکھنا ہوتا ہے۔ یہ چیزیں نہ تو معصوم کے قائم مقام ہیں اور نہ ہی ان کی برابری کی دعویدار، بلکہ ان کی طرف ذہنی و قلبی توجہ کا وسیلہ ہیں، جو ایک جیتی جاگتی تربیتی فضا پیدا کرتی ہیں تاکہ نسلِ انسانی تاریخ سے سبق سیکھ سکے، جذبات سے جڑ سکے، اور حق و باطل کی تمیز میں باریک فکری بصیرت حاصل کر سکے۔

جب اہلِ تشیع ان اشیاء کو حرمت، تقدس اور علامتی اہمیت کے ساتھ سنبھالتے ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ ان چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں یا انہیں اصل حقیقت کا بدل سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ علامتیں ان عظیم معانی کا مظہر ہیں جو ائمہ علیہم السلام کے کردار، قربانی، مقصد اور سیرت سے وابستہ ہیں۔ اور یہ چیز فقط عزاداری کے دائرے تک محدود

نہیں، بلکہ دینی، فکری، سیاسی اور تمدنی سطح پر بھی اسی اصول کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہی وہ زاویہ ہے جس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ معصومینؑ کی حکومت کی شبیہ بنانا، ان کی سیرت کے اصولوں پر مبنی نظام تشکیل دینا، اور کسی ایسی ولایت کو قائم کرنا جو ان کی ولایت کا پرتو ہو، درحقیقت عین اسی فکری سلسلے کی توسیع ہے۔

ولایت فقیہ اسی اصولی فکر کا ثمرہ ہے۔ معصومؑ کی حکومت کوئی فقط رسمی اور جسمانی سلطنت نہیں تھی بلکہ عدل، علم، تقویٰ، شجاعت، حکمت، عبادت، سماجی انصاف اور سیاسی حکمت عملی کا امتزاج تھی۔ اس حکومت کا جوہر یہ تھا کہ وہ بندوں کو خدا کی طرف لاتی تھی، ظلم کے خلاف تھی، اور حق کے لیے سینہ سپر تھی۔ جب معصومؑ پردہ غیبت میں چلے گئے، تب سوال یہ پیدا ہوا کہ اس نورانی و عادلانہ نظام کے فقدان میں امت کا عملی و اجتماعی راستہ کیا ہو؟ کیا حق و عدل کی حکومت کو محض ماضی کے صفحات میں بند کر دینا چاہیے؟ یا اس کے اصولوں پر مبنی ایک نظام تشکیل دینا چاہیے جو معصوم کی غیر موجودگی میں اس کے مشن کی نمائندگی کرے؟ اہلِ تشیع کی علمی روایت نے اس سوال کا جواب دیا—اور وہ جواب تھا: "ولایت فقیہ"۔

ولایت فقیہ معصومؑ کی حکومت کا قائم مقام نہیں، مگر اس کی شبیہ ضرور ہے۔ جیسے علمِ عباسؑ حضرت عباسؑ کا بدل نہیں بلکہ ان کی وفا، بہادری اور قربانی کا نشان ہے، ویسے ہی ولایت فقیہ معصومؑ کی براہِ راست حکومت نہیں، مگر اس کی عدل پر مبنی حکمت، فقہی بصیرت، عوامی خدمت، اور دینی قیادت کا مظہر ہے۔ اس نظام کا جوہر یہ ہے کہ فقیہ عادل، جو معصومؑ کی

تعلیمات کا وارث، قرآنی و حدیثی معارف کا ماہر، زمانے کی پیچیدگیوں سے واقف اور ظلم کے مقابل جرأت مند ہو، وہ معصومؑ کی غیر موجودگی میں امت کی رہنمائی کرے، اور ان اصولوں کو معاشرے میں نافذ کرے جن پر علیؑ و حسنؑ و حسینؑ نے عمل کیا۔

ولایت فقیہ کا قیام کوئی وقتی سیاسی حکمتِ عملی نہیں، نہ ہی کوئی انسانی اختراع، بلکہ یہ اس اصولی حقیقت کا اظہار ہے کہ دین فقط فرد کی اصلاح نہیں، بلکہ اجتماعی نظام کی اصلاح اور قیادت کا ضامن بھی ہے۔ قرآن کا واضح پیغام ہے کہ ظالموں کو زمین کی قیادت کا حق نہیں، اور اہلِ حق کو نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ظلم کے خلاف اٹھیں اور عدل کا نظام قائم کریں۔ اگر معصومؑ پردے میں ہے تو کیا عدل بھی پردے میں چلا جائے؟ کیا دین کا نظامِ زندگی صرف مسجد کے محراب میں محدود رہے؟ ولایت فقیہ اس سوال کا عملی جواب ہے کہ معصومؑ کی غیر موجودگی میں بھی دین اپنی اجتماعی صورت میں جاری رہ سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی قیادت اہلِ تقویٰ، اہلِ علم، اہلِ حکمت کے ہاتھوں میں ہو۔

جن لوگوں کو اس سے اختلاف ہے، وہ دراصل دو غلط فہمیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ شبیہ کو اصل کا قائم مقام سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ اسلامی فکر میں شبیہ، اصل کی طرف رہنمائی کا ذریعہ ہوتی ہے، اس کا نعم البدل نہیں۔ دوسری غلط فہمی یہ کہ وہ نظامِ ولایت کو فقط سیاسی قوت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ نظام درحقیقت دینِ اسلام کی تمدنی توسیع ہے۔ جس طرح فقہی استنباط معصومؑ کی فقہ کا تسلسل ہے، اسی طرح ولایت فقیہ، معصومؑ کی قیادت کے فکری

اصولوں کا تسلسل ہے۔ وہی اصول، وہی مقاصد، وہی معیار —بس صاحبِ وقت کی غیر موجودگی میں مجتہد جامع الشرائط کے ذریعے۔

لہٰذا اگر ذوالجناح کی شبیہ، خیمے، علم، اور دیگر شعائر ہمیں معصومینؑ کی طرف متوجہ کرنے اور ان کی راہ کو زندہ رکھنے کا ذریعہ ہو سکتے ہیں، تو پھر ایک ایسا نظامِ حکومت جو ان کے عدل و حکمت پر مبنی ہو، ان کے اصولوں کا ترجمان ہو، اور ان کی غیر موجودگی میں ان کی نیابت کا فریضہ سر انجام دے، وہ کیوں بدعت کہلائے؟ درحقیقت اس نظام کے انکار کا مطلب ہے کہ ہم معصومینؑ کی فکر کو صرف تاریخی روایت میں قید کر دیں، اور اسے حال اور مستقبل کے انسانوں کے لیے غیر متعلق بنا دیں۔ اور یہی وہ فکری جمود ہے جس سے بچنے کے لیے اہلِ بصیرت علمائے دین نے ولایت فقیہ کو نظریہ نہیں، بلکہ عملی نظام کی شکل میں امت کے سامنے پیش کیا۔

یہ شبیہ نہ صرف جائز ہے بلکہ عین تقاضائے وفاداری ہے، جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ دین کسی ماضی کا نوحہ نہیں بلکہ مستقبل کا دستور ہے۔ اور اگر ہم معصومینؑ کی تعلیمات، ان کی حکومت، ان کی قربانی، ان کی حکمت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، تو ہمیں ان کی راہ کی شبیہ بھی قائم رکھنی ہوگی، اور ان کی حکومت کا عکس بھی۔ ولایت فقیہ اسی عکس کا نام ہے۔

نئے عالمی نظام کی تلاش

عالمی سطح پر تیل، کرنسی، سونا، فاریکس، اور کرپٹو جیسے مالیاتی اور اجناس کے ریٹس بظاہر تو آزاد منڈی میں طلب ورسد کے اصولوں پر متعین ہوتے ہیں، لیکن جب اس نظام کو باریک بینی سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ محض ایک جزوی حقیقت ہے۔ عالمی مالیاتی منڈیوں کی اصل ہیت، جسے عام عوام کے لیے ایک خودکار، غیر جانب دار اور شفاف نظام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، درحقیقت کئی طاقتور اداروں، بین الاقوامی بینکوں، مالیاتی گروہوں اور خفیہ اجارہ دار قوتوں کی گرفت میں ہے۔ ان کے اثرات اتنے گہرے اور منظم ہیں کہ ایک عام تاجر یا تجزیہ کار کبھی بھی مکمل تصویر کو دیکھنے یا سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر، تیل کی قیمتوں کا تعین صرف رسد و طلب کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلاشبہ عالمی سطح پر اگر تیل کی پیداوار میں کمی ہو یا کوئی قدرتی آفت یا جنگی صورتحال ہو تو قیمتیں بڑھتی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ OPEC (Organization of Petroleum Exporting Countries) جیسے کارٹیلز تیل کی پیداوار کے فیصلے کرتے ہیں جو براہ راست قیمتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کارٹیلز کے پیچھے کون سے مفادات کارفرما ہوتے ہیں، یہ ہمیشہ شفاف نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں، امریکی ڈالر میں تیل کی قیمت طے ہونے کے سبب امریکی مالیاتی اداروں کو غیر معمولی کنٹرول حاصل

ہے۔ اس تناظر میں "پیٹرول-ڈالر" سسٹم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جو ایک ایسا ماڈل ہے جس نے امریکہ کو مالیاتی بالادستی فراہم کی ہوئی ہے۔

سونے کی قیمتوں کے حوالے سے ایک مشہور حقیقت یہ ہے کہ لندن میں موجود چند بینکوں کا ایک چھوٹا سا گروپ، جنہیں "London Bullion Market Association" (LBMA)" کہا جاتا ہے، روزانہ مخصوص وقت پر سونے کی قیمتیں "Fix" کرتا ہے۔ یہ عمل اگرچہ رسمی طور پر ایک مارکیٹ پروسیس کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، لیکن درحقیقت یہ طاقتور بینکاری اداروں کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ سونے کی قیمت کے ذریعے نہ صرف عالمی معاشی رجحانات بلکہ کرنسی کی قدر، مہنگائی اور سیاسی استحکام کو بھی کنٹرول کیا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض ناقدین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سونے کی قیمت کو جان بوجھ کر کم یا مستحکم رکھا جاتا ہے تاکہ کرنسی خصوصاً امریکی ڈالر کو غیر متزلزل ظاہر کیا جا سکے۔

فاریکس مارکیٹ جس کا یومیہ حجم کھربوں ڈالرز پر مشتمل ہوتا ہے، اپنی ہیئت میں ایک غیر مرکزی (Decentralized) اور انتہائی تیز رفتار مارکیٹ ہے، لیکن اس میں بھی چند بڑے کھلاڑی جیسےJPMorgan Chase ، Goldman Sachs، Citibank، Barclays، اور Deutsche Bank وغیرہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ بینک اپنی اعلیٰ لیول پر موجود ٹریڈنگ ڈیسک کے ذریعے نہ صرف رجحانات کا تعین کرتے ہیں بلکہ کبھی کبھار ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی ہوتی رہی ہے کہ وہ کرنسی کے ریٹس میں ہیرا

پھیری کرتے ہیں۔ کچھ برس قبل یہ بات سامنے آئی تھی کہ بڑی بینکوں نے باہم مل کر فاریکس ریٹس میں ہیرا پھیری کی، جس پر انہیں اربوں ڈالر جرمانے بھی ادا کرنے پڑے۔

کرپٹو کرنسی بظاہر ایک آزاد اور غیر مرکزی نظام پر مبنی تصور تھا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی طاقتور سرمایہ داروں اور "وہیلز" کا عمل دخل بڑھتا گیا۔ کرپٹو کی قیمتیں محض سپلائی اور ڈیمانڈ پر نہیں بلکہ Elon Musk جیسے افراد کے ایک ٹویٹ سے اوپر نیچے ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں، مختلف ایکسچینجز کی جانب سے کیے گئے اقدامات، حکومتی پالیسیاں، اور مخصوص میڈیا بیانیے بھی کرپٹو کے اتار چڑھاؤ میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بٹ کوائن یا دیگر کرپٹو اثاثے جنہیں "آزاد مالیات" کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا تھا، اب بڑے اداروں جیسے BlackRock یا Fidelity جیسے سرمایہ کاری فنڈز کی دلچسپی اور اجارہ داری کے تحت آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی پرانے بینکاری ادارے اور مالیاتی اسٹیبلشمنٹ اب نئی ٹیکنالوجی کے اندر بھی اپنے تسلط کو برقرار رکھنے کے لیے سرگرم ہیں۔

ان تمام حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ موجودہ عالمی مالیاتی نظام درحقیقت ایک قسم کا "نرم کنٹرولڈ" سرمایہ دارانہ ڈھانچہ ہے جسے آزاد معیشت کے نام پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کے خدوخال ایک ایسی خفیہ ہئیت رکھتے ہیں جس میں عالمی صہیونی بینکار، صنعتکار اور تجارتی گروہ غالب حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہی قوتیں ہیں جو عالمی میڈیا، بڑی کارپوریشنز اور یہاں تک کہ حکومتوں کو بھی پس پردہ کنٹرول کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

بعض معتبر تجزیہ کاروں اور ناقدین نے اس نظام کو "فنانشل ڈکٹیٹر شپ" قرار دیا ہے۔ اس تصور کو تقویت اس وقت ملتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں کسی ملک کی معیشت تباہ کرنے کے لیے صرف چند گھنٹوں کے لیے اس کی کرنسی یا مارکیٹ میں مصنوعی اتار چڑھاؤ پیدا کرنا کافی ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ دعویٰ کہ روزانہ لندن میں ایک خاص وقت پر سونے یا دیگر اشیاء کی قیمتیں طے کی جاتی ہیں، محض ایک افواہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے مخصوص پروسیسز کے ذریعے قابل قبول اور قانونی بنا دیا گیا ہے۔ عالمی مالیاتی نظام اگرچہ تکنیکی اعتبار سے پیچیدہ ہے، لیکن اس کی گہرائی میں داخل ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظام بہت حد تک منظم قوتوں کے اختیار میں ہے جن کا بنیادی مقصد منافع، تسلط اور نظام عالم کی تشکیل نو ہے، نہ کہ عام انسان کی خوشحالی یا آزادی۔

موجودہ عالمی اسٹیبلشمنٹ جسے آج کی دنیا میں مغربی سرمایہ دارانہ نظام، مالیاتی اجارہ داری، اور صہیونی-صنعتی گٹھ جوڑ کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے، محض ایک نظریاتی یا عسکری طاقت نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی و فکری، مالیاتی و تجارتی اور معلوماتی و ثقافتی نظام ہے۔ اس کا تسلط صرف حکومتوں پر نہیں بلکہ افراد کے شعور، ان کی خواہشات، ان کے خوابوں، اور حتیٰ کہ ان کی زبانوں، لباس، خوراک، علم اور دین کے تصور تک پھیل چکا ہے۔ ایسے نظام کو صرف فوجی طاقت یا وقتی انقلابات سے شکست نہیں دی جا سکتی بلکہ اس کے مقابلے میں ایک ایسا متبادل نظریہ، طرزِ فکر، معاشرتی و معاشی ڈھانچہ اور روحانی و تمدنی مرکز قائم کرنا ہو گا جو

صرف "نفی" پر قائم نہ ہو بلکہ "اثبات" کا حامل ہو، جس میں انسانیت کو ایک نئی امید اور نئی سمت دکھانے کی قابلیت موجود ہو۔

اختلافی یا مزاحمتی قوتیں جو اس نظام کو چیلنج کر رہی ہیں، ان میں ایران جیسی انقلابی ریاست، حزب اللہ، حماس، لاطینی امریکہ کی بعض انقلابی تحریکیں، بعض چینی اور روسی مفکرین، حتیٰ کہ افریقہ میں ابھرتے ہوئے سامراج مخالف اتحاد، اور یورپ و امریکہ میں سرمایہ داری مخالف فکری حلقے شامل ہیں۔ ان تمام قوتوں کی مزاحمت کی نوعیت مختلف ہے لیکن ایک مشترکہ قدر یہ ہے کہ وہ موجودہ عالمی اسٹیبلشمنٹ کو ایک جابرانہ، استحصالی، اور روحانی و اخلاقی دیوالیہ نظام سمجھتی ہیں۔ تاہم ان کے ہاں اختلاف اس بات پر ہے کہ متبادل کیا ہو؟ کچھ طاقتیں چاہتی ہیں کہ اسی نظام پر قبضہ حاصل کر لیا جائے، یعنی اس کے موجودہ اسٹرکچرز میں رہ کر اسے نئے مقاصد کے تحت استعمال کیا جائے۔ یہ نظریہ زیادہ تر طاقتور ریاستوں جیسے روس یا چین کے پالیسی سازوں کے ہاں پایا جاتا ہے، جن کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام کو مکمل طور پر ختم کرنا فی الحال ممکن نہیں بلکہ اس میں نئی طاقت کا داخل ہونا ضروری ہے تاکہ توازن بدل جائے۔

دوسری طرف وہ تحریکیں جن کی بنیاد دین، عقیدہ، اور روحانی مزاحمت پر ہے، مثلاً اسلامی جمہوریہ ایران، حزب اللہ، یا اسلامی بیداری کی مختلف لہریں، وہ اس نظام کو "باطل" سمجھتی ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ اس کی بنیاد میں ہی ظلم، سود، استحصال اور انسان دشمنی ہے، لہٰذا اسے ختم کر کے ایک نیا نظام قائم کرنا ہو گا۔ یہ نقطہ نظر اس بات پر زور دیتا ہے کہ سسٹم کو

صرف اوپر سے نہیں بلکہ جڑ سے بدلا جائے، اور اس کی جگہ ایک "الٰہی نظام" لایا جائے جس کی بنیاد توحید، عدل، اور انسانی کرامت پر ہو۔

نیا نظام کیسا ہو گا؟ اگر مزاحمت کامیاب ہو جائے، تو دو صورتیں ممکن ہیں۔ ایک، کہ نیا نظام جزوی طور پر بدلے اور موجودہ اسٹرکچر کو نئے مقاصد کے تحت ریفارم کیا جائے، جیسے چینی ماڈل یا کسی "نیو ملتوی قطبیت (multipolarity) "کی شکل میں۔ لیکن یہ ماڈل صرف طاقت کی مرکزیت کو بدلتا ہے، نہ کہ اس کے بنیادی اصولوں کو۔ دوسری صورت، جو زیادہ گہری اور مستقل تبدیلی کی علامت ہو گی، وہ ایک ایسا نظام ہے جو موجودہ سرمایہ دارانہ، سودی، منافع پرست اور استعماری سوچ کے بجائے انسان کو مقصدِ حیات سے جوڑے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی نظام ایک فکری، تمدنی اور روحانی متبادل کے طور پر سامنے آتا ہے۔

اسلامی نظام کوئی یوٹوپیا نہیں، بلکہ یہ ایک فطری اور عملی طرزِ حیات ہے جس کی بنیاد وحی، عقل، تجربہ اور فطرت پر ہے۔ اس میں معیشت سود سے پاک ہے، طاقت کا استعمال عدل پر مبنی ہے، سیاست خدمت اور امانت ہے، علم و دانش کا مرکز انسان کی نجات ہے، اور فرد کی آزادی کا مفہوم صرف جسمانی نجات نہیں بلکہ روحانی اور عقلی آزادی ہے۔ اس نظام میں ریاست ایک "خلافتِ عادلہ" کی مانند ہوتی ہے جہاں اقتدار کا محور قانونِ الٰہی ہوتا ہے، نہ کہ مفادات، اور جہاں معیشت کا ہدف نفع نہیں بلکہ فلاح ہوتا ہے۔

یہی وہ نظام ہے جو نہ صرف موجودہ عالمی اسٹیبلشمنٹ کو توڑ سکتا ہے بلکہ ایک ایسی دنیا کی بنیاد رکھ سکتا ہے جس میں مشرق و مغرب، شمال و جنوب، رنگ و نسل کی تفریق نہیں بلکہ انسانیت کے مشترکہ اصولوں پر مبنی عالمی ہم آہنگی ممکن ہو۔ البتہ اس نظام کے قیام کے لیے صرف سیاسی یا عسکری مزاحمت کافی نہیں، بلکہ ایک فکری و روحانی بیداری، علمی و ثقافتی انقلاب، اور سب سے بڑھ کر عوامی شعور کی تبدیلی ضروری ہے۔ جب تک دنیا کے مظلوم، محروم، اور متوسط طبقات یہ نہ سمجھیں کہ وہ ایک جابرانہ تہذیب کے زیر اثر ہیں، اس وقت تک تبدیلی محض نعرہ یا وقتی بغاوت ہی رہے گی۔

لہٰذا سوال یہ نہیں کہ نظام پر قبضہ کیا جائے یا اسے بدلا جائے، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسان اس قابل ہو چکا ہے کہ وہ سچائی، عدل اور توحید کو صرف مذہبی عقیدے کی حد تک نہیں بلکہ عالمی نظام کے متبادل کے طور پر اپنائے؟ اگر ہاں، تو اسلامی تمدن کی طرف واپسی صرف ممکن نہیں بلکہ ضروری ہے۔ اور اگر نہیں، تو یہ دنیا ایک نئی غلامی کی طرف بڑھتی رہے گی جس کا چہرہ بدلے گا، مگر روح وہی رہے گی۔

ناکامی و پریشانیوں میں کامیابی و سکون

انسان کی فطرت ہے کہ وہ چیزوں کو جلدی سے جانچنے، نتائج اخذ کرنے اور فیصلے سنا دینے کی عادت رکھتا ہے۔

انسان کی عقل، حساب اور تدبیر کی ایک حد ہے، اور ہر چیز کو منطق اور کیلکولیشن کے دائرے میں پرکھنے کی کوشش نہ صرف تھکا دینے والی ہے بلکہ بعض اوقات بے ایمانی اور بے چینی کا سبب بھی بن جاتی ہے۔ ذیل میں اس خیال کو تفصیل سے ایک مربوط اور فکری انداز میں بیان کیا گیا ہے:

ہم ایک ایسی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں "منطقی سوچ" اور "تجزیہ" کو کمال سمجھا جاتا ہے۔ ہر بات کو جانچنا، ہر رویے کی توجیہ تلاش کرنا، ہر نتیجے کا عقلی جواز ڈھونڈنا، اور ہر عمل کو ریاضیاتی کلیے میں تولنا آج کے انسان کا مزاج بن چکا ہے۔ گویا اگر کوئی چیز ہماری سمجھ میں نہ آئے تو وہ ناقابلِ قبول ہے، یا اگر کوئی واقعہ ہماری پلاننگ کے مطابق نہ ہو تو وہ یقیناً ناکامی ہے۔ ہم نے عقل کو خدا کے برابر لا بٹھایا ہے، اور ایمان، توکل اور غیب کو ایک طرف رکھ دیا ہے—حالانکہ یہ وہی غیب ہے جس پر ہمارا دین کھڑا ہے۔

قرآن بارہا کہتا ہے: يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ — مؤمن وہ ہے جو غیب پر ایمان رکھتا ہے۔ مگر ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ ہم ہر واقعے کو "سمجھنے" کی کوشش کرتے ہیں، ہر آزمائش کی "منطقی وجہ" تلاش کرتے ہیں، اور جب ہمیں وہ وجہ نہ ملے تو ہم یا تو اللہ سے شکوہ کرتے ہیں یا خود کو کوستے ہیں۔

یہ رویہ صرف عقل پر بھروسے کی علامت نہیں بلکہ روحانی بے چینی کی علامت بھی ہے۔ کیونکہ سچ یہ ہے کہ ہر چیز عقل سے قابلِ فہم نہیں ہوتی۔ کائنات میں بے شمار چیزیں ہیں جو ہماری سوچ، مشاہدے اور علم کے دائرے سے باہر ہیں۔ ہمارا علم محدود ہے، ہمارے زاویہ نظر تنگ ہیں، ہماری عقل ناقص ہے — اور ہم اس کے باوجود زندگی کو مکمل قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

قرآن کی مثالیں ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ اللہ کی تدبیر انسان کی تدبیر سے کہیں بلند ہے۔ حضرت یوسفؑ کو کنویں میں پھینکا گیا، بظاہر یہ ایک سانحہ تھا، مگر اسی کنویں سے مصر کے تخت تک اُن کا سفر شروع ہوا۔ حضرت موسیٰؑ کی ماں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے نوزائیدہ بیٹے کو دریا میں ڈال دیں — یہ عمل عقل کی دنیا میں دیوانگی ہے، مگر وحی کی دنیا میں کامل حکمت۔ اور یہی بچہ فرعون کے گھر پرورش پاتا ہے، وہی جو اُس کا دشمن تھا۔

یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ انبیاء نے ہر بات کو کیلکولیٹ کرنے کے بجائے اللہ پر بھروسا کیا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ ہر سوال کا جواب اس دنیا میں ضروری نہیں، اور ہر الجھن کو سلجھانا عقل کا کام نہیں بلکہ صبر، رضا اور ایمان کا امتحان ہے۔

آج جب ہم زندگی میں کسی پریشانی، ناکامی، تاخیر یا نقصان سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم فوراً اس کا "جواز" ڈھونڈنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں:

"ایسا کیوں ہوا؟"
"آخر میں نے کون سی غلطی کی؟"
"یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا؟"
"اس تاخیر کا مطلب کیا ہے؟"

مگر بعض سوالات کے جواب صرف اللہ جانتا ہے۔

اور یہ بات تسلیم کرنا بھی ایمان کا حصہ ہے کہ میں سب کچھ نہیں سمجھ سکتا — اور مجھے سب کچھ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں۔ بعض چیزیں بس تسلیم کرنی ہوتی ہیں، دل سے، خاموشی سے۔ بعض اوقات اللہ ہمیں جو راستہ دکھاتا ہے، وہ ہماری پسند کا نہیں ہوتا، لیکن وہی ہمارے لیے بہتر ہوتا ہے۔ جس کا راز ہمیں برسوں بعد سمجھ آتا ہے، یا کبھی سمجھ ہی نہیں آتا — اور تب بھی وہ قابلِ اعتماد ہوتا ہے کیونکہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

زندگی کا سکون تب شروع ہوتا ہے جب انسان عقل اور ایمان میں توازن قائم کرتا ہے۔ جب انسان منصوبہ بناتا ہے، لیکن دل سے مانتا ہے کہ "میرا رب بہتر منصوبہ بنانے والا ہے"۔ جب انسان سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی مانتا ہے کہ "جو چیز میری سمجھ سے باہر ہے، وہ کسی حکمت کی بنیاد پر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل ضرور دی ہے، مگر ہر راز کھولنے کی اجازت نہیں دی۔ بعض پردے قائم رکھنے ہی میں خیر ہے۔ اگر ہم ہر بات کو جان لیں، ہر نتیجے کو فوراً سمجھ لیں، تو پھر امتحان اور ایمان کا مطلب کیا رہ جاتا ہے؟

اس لیے جب زندگی آپ کے حساب سے نہ چلے، تو اُس پر بوجھ نہ بنیں۔ ہر چیز کو تجزیے کے ترازو میں نہ تولیں۔ بعض وقت خود کو اللہ کے حوالے کر دینا ہی سب سے بڑی دانشمندی ہوتی ہے۔

بس اتنا سوچا کیجیے:

"اگر میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا، تو شاید یہی مقام ہے جہاں مجھے بس اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔"

اور اللہ کبھی اپنے بھروسے کو ضائع نہیں کرتا۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:" کبھی تدبیر کے نتیجے میں موت ہو جاتی ہے۔"

یا ایک جگہ اور فرماتے ہیں:" قضاء و قدر امر خدا ہیں اس میں دخل نہ دو ورنہ گمراہ ہو جاو گے۔"

ہماری عقل اور آنکھیں صرف ظاہری اسباب کو دیکھتی ہیں۔ ہم کسی تاخیر، کسی حادثے، کسی ناکامی کو فوری طور پر بدقسمتی یا کوتاہی سے تعبیر کرتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا نظام صرف ظاہری اسباب سے نہیں چلتا۔ اس دنیا میں ایک ایسی قوت کارفرما ہے جو ہر چیز کو اپنے وقت، جگہ اور انداز سے وقوع پذیر ہونے دیتی ہے — اور وہ ہے اللہ کی تقدیر، اُس کی حکمت، اور اُس کا علم جو ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

قرآن مجید ہمیں کئی واقعات کے ذریعے اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ جو کچھ ہمیں نقصان یا پریشانی محسوس ہوتا ہے، وہ اکثر درحقیقت ایک بڑی رحمت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ سورۃ کہف میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ اسی نکتہ کو باریکی سے واضح کرتا ہے۔ کشتی میں سوراخ کیا گیا، ایک معصوم بچہ مارا گیا، اور ایک گرتی ہوئی دیوار کو بلا معاوضہ سیدھا کیا گیا — یہ سب اقدامات بظاہر غیر منصفانہ اور غیر معقول لگے، حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی بھی ان پر صبر نہ کر سکے۔ لیکن جب حضرت خضرؑ نے ہر عمل کے پس پردہ حکمت کو بیان کیا، تب پتا چلا کہ ہر نقصان نما کام، درحقیقت ایک بڑے نقصان سے بچاؤ کے لیے تھا۔ یہی وہ بنیادی نکتہ ہے جسے سمجھنا انسان کی فکری بلوغت اور روحانی وسعت کا دروازہ کھولتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں ایسے درجنوں واقعات ہیں جہاں وقتی ناکامی دراصل مستقبل کی کامیابی کا دروازہ بنی۔ جنگ اُحد میں مسلمانوں کو بظاہر شکست ہوئی، ستر کے قریب جانثار صحابہؓ شہید ہوئے، مگر اس واقعے نے انہیں اتحاد، نظم و ضبط، اور نافرمانی کے نتائج کا گہرا سبق سکھایا۔

اسی طرح صلح حدیبیہ کا معاہدہ بظاہر مسلمانوں کے حق میں کمزور لگتا تھا۔ صحابہؓ کو یہ معاہدہ سخت ناگوار گزرا، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ جیسے بہادر صحابی نے سوال کیا کہ کیا ہم حق پر نہیں؟ پھر کیوں جھکیں؟ لیکن بعد میں وہی معاہدہ اسلام کے پھیلاؤ کا سبب بنا۔ دس سال کی امن کی مدت نے دعوتِ دین کو سہولت دی، اور دو سال کے اندر ہی ہزاروں لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔

کربلا کی سرزمین پر امام حسینؑ کی قربانی کو بھی اگر صرف ظاہری آنکھ سے دیکھا جائے تو ایک المیہ، ایک شکست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس واقعے کی روح میں جھانکا جائے تو وہ شہادت محض افراد کی قربانی نہیں بلکہ حق کی بقا، ظلم کے خلاف قیام، اور انسانیت کی روحانی آزادی کی بنیاد تھی۔ خود امام حسینؑ نے فرمایا تھا: "مجھے موت کا سامنا ہو رہا ہے لیکن میں اسے کامیابی سمجھتا ہوں، کیونکہ میں حق کے لیے قربانی دے رہا ہوں۔"

اور یاد کریں امام حسینؑ کا یہ قول:

"جو مصیبت اللہ کی طرف سے ہو، وہ رحمت بن کر اترتی ہے۔"
کربلا میں بظاہر سب کچھ ختم ہو گیا، مگر حقیقت میں دین کو نئی زندگی ملی۔

یہ بات واقعی سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ایک بڑی کمپنی کا ایک اعلیٰ افسر صرف اس لیے 9/11 کے حملے سے بچ گیا کیونکہ وہ اُس صبح اپنے بیٹے کو پہلی بار کنڈر گارٹن لے گیا تھا؟

ایک شخص زندہ بچا کیونکہ اُس کی باری تھی کہ وہ ڈونٹ خریدنے جائے۔
ایک عورت دیر سے پہنچی کیونکہ اُس کی الارم گھڑی نہیں بجی۔
ایک اور ٹریفک میں پھنس گیا نیوجرسی ٹرن پائک پر۔
ایک بس چھوٹ گئی۔
ایک خاتون نے کپڑوں پر کافی گرادی اور بدلنا پڑا۔
ایک شخص کی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔
ایک نے گھر سے نکلنے سے پہلے فون کا جواب دیا۔
ایک کو کیب نہیں ملی۔

لیکن جو کہانی مجھے سب سے زیادہ متاثر کر گئی، وہ یہ ہے:

ایک شخص نے اس صبح نئے جوتے پہنے۔ راستے میں جوتے نے اُس کے پیر پر چھالہ دے دیا۔ وہ دواخانے رکا کہ پٹی خریدے۔

اسی لیے وہ زندہ ہے۔

تو اب جب بھی ٹریفک میں پھنسنا پڑے یا لفٹ چھوٹ جائے یا چابی لینے واپس جانا پڑے... تو یاد کرنے کی کوشش کریں:

شاید میں بالکل اُس جگہ ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے تھا۔

اگلی بار جب آپ کی صبح منصوبے کے مطابق نہ چلے، بچے دیر سے تیار ہو رہے ہوں، چابیاں نہ مل رہی ہوں، یا ہر ٹریفک سگنل سرخ ہو، تو ایک لمحے کے لیے رک جائیں۔ فکر نہ کریں، جلدی نہ کریں۔

آپ نہیں جانتے کہ قسمت کا کون سا موڑ آپ کی تاخیر میں آپ کی حفاظت کر رہا ہے۔

یہ سب ہمیں سکھاتے ہیں کہ ہر رکاوٹ، ہر تاخیر، ہر محرومی میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہو سکتی ہے، جو ہماری آنکھ نہیں دیکھ سکتی، مگر اللہ کی نظر دیکھ رہی ہوتی ہے۔ اسی تصور کو اگر ہم اپنی روزمرہ زندگی میں لاگو کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ کئی ایسی چھوٹی چھوٹی تاخیر، رکاوٹیں یا حادثات جن پر ہم جھنجھلا جاتے ہیں، درحقیقت کسی بڑی مصیبت سے بچاؤ کا ذریعہ بن رہی ہوتی ہیں۔ 9/11 کے حملوں سے بچنے والے لوگوں کی سچی کہانیاں سنیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ کیسے معمولی تاخیر، جیسے الارم نہ بجنا، کپڑوں پر کافی گر جانا، یا جوتے کے چھالے کی وجہ سے دواخانے جانا، کسی کی جان بچا گئی۔ یہ سب باتیں ہمیں یہ سکھاتی ہیں کہ ہمیں اپنے دن کی رکاوٹوں، پریشانیوں اور تاخیر پر صبر سے کام لینا چاہیے، کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ اللہ ہماری زندگی میں کیا سے کیا روک رہا ہے۔

بسا اوقات ہمیں جو چیز ناکامی لگتی ہے، وہ دراصل کامیابی کے لیے راہ ہموار کر رہی ہوتی ہے۔ جو چیز ہماری نظروں میں حادثہ ہوتی ہے، وہ خدائی پلان کا حصہ ہوتی ہے۔ ہمارے معمولی دن، جنہیں ہم "خراب دن" کہتے ہیں، وہ دراصل اللہ کی طرف سے ہمارے حق میں بہتر دن بنانے کی کوشش ہوتی ہے۔

زندگی ایک راز ہے، اور اللہ کی تدبیر اس راز کا سب سے گہرا پہلو۔ انسان جتنا اس حقیقت کو سمجھے گا، اُتنا ہی وہ سکون، صبر، اور اطمینان سے بھرپور زندگی گزارے گا۔ اگلی بار جب آپ کو کسی چیز کی تاخیر یا نقصان محسوس ہو، تو رک کر سوچیں:

شاید میں بالکل اُسی جگہ ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے تھا۔

شاید اللہ نے مجھے ایک نادیدہ آفت سے بچا لیا ہے۔

شاید یہ تاخیر دراصل میری حفاظت ہے، میری تربیت ہے، یا میرے حق میں کوئی بہتر منصوبہ ہے۔

امام علی علیہ السلام نے فرمایا: "جس چیز کو تم دشمن سمجھ رہے ہوتے ہو اکثر اسی میں بھلائی ہوتی ہے۔"

آخرکار، ہمارا رب کبھی ناحق نہیں کرتا۔ وہ سب کچھ جانتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ اور وہی بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

ہر حلال و جائز پر عمل ضروری نہیں

شریعتِ محمدیؐ میں حلال و حرام کی تقسیم محض فقہی سطح پر نہیں بلکہ روحانی و معاشرتی نتائج کے تناظر میں بھی دیکھی جاتی ہے۔ جو چیز حلال ہے، وہ اپنی ذات میں مباح ضرور ہے، لیکن اس کا ارتکاب ہر حال میں افضل یا مستحب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح جو چیز حرام ہے، اگرچہ وہ چھوٹی معلوم ہو، لیکن اس کے ترک میں نجات اور اس کے ارتکاب میں ہلاکت ہے۔

انسانی نفس ایک پیچیدہ ترکیب ہے۔ کبھی وہ حرام کو چھوٹا سمجھ کر انجام دیتا ہے، اور کبھی حلال کو اپنا حق سمجھ کر حد سے تجاوز کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس قول کی حکمت کھلتی ہے۔ شریعت کا مقصد صرف قانونی حد بندی نہیں بلکہ نفسِ انسانی کی تربیت ہے۔ امام علیؑ کا فرمان ہے کہ "حرام کو حقیر نہ جانو، کہ وہی تمہیں بڑے گناہ کی طرف لے جائے گا"۔ چھوٹے گناہ اگرچہ فقہی طور پر صغائر میں شمار ہوتے ہیں، لیکن ان کی تکرار انسان کے دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: "كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ" (المطففین:14)، یعنی ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چھا گیا ہے۔ زنگ وہی صغائر ہوتے ہیں جو مستقل کیے جاتے ہیں، حتیٰ کہ قلبِ سلیم کو تاریکی میں بدل دیتے ہیں۔

دوسری طرف حلال و مباح افعال میں بھی حکمت اور اعتدال کی ضرورت ہے۔ کوئی چیز اگرچہ شریعت میں جائز ہے، لیکن اس کا وقت، محل، مقدار اور نیت اگر درست نہ ہو تو وہی چیز نقصان دہ بن سکتی ہے۔ کھانا، بولنا، سونا، مال جمع کرنا، حتیٰ کہ دینی امور میں بھی اگر نفس غالب ہو جائے، ریا شامل ہو جائے، یا شہرت طلبی آجائے، تو حلال فعل زہر بن جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "جو عمل تمہارے لیے نقصان دہ ہو، اگرچہ وہ حلال ہو، اس سے پرہیز کرو"۔ یعنی شریعت کا مقصود صرف افعال کی درجہ بندی نہیں بلکہ انسان کی روحانی تکمیل ہے۔

یہی اصول ہمیں دینِ اسلام کے اجتماعی اور سیاسی پہلوؤں میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ حکومت کا قیام، قیادت اور فتوے دینا بعض شرائط کے ساتھ جائز اور حتیٰ واجب ہو سکتا ہے، لیکن جب یہ امور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجائیں جو خود پسند ہوں، شہرت طلب ہوں یا دینی بصیرت سے محروم ہوں، تو وہ جائز عمل فتنہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے آئمہ معصومینؑ نے اجتہاد و قیادت کو ان فقہاء کے لیے مخصوص کیا جو "صائنا لنفسه، حافظا لدينه، مخالفا لهواه" ہوں۔ یعنی اپنی خواہشات سے دور، دین کے محافظ، اور نفس کے غلام نہ ہوں۔ اگر کوئی فقیہ حلال راستے سے بھی اقتدار حاصل کرے، مگر مقصد میں اخلاص نہ ہو، تو وہی جائز فعل امت کے لیے وبال بن سکتا ہے۔ اور برعکس اس کے، اگر کوئی فرد یا جماعت، حکومت قائم نہ کرے مگر دین کو محفوظ رکھنے کے لیے تقیہ اختیار کرے، تو وہ ترکِ حکومت دراصل ترکِ دین نہیں بلکہ عین دین کی حفاظت ہے۔

پس تقلید ہو یا قیادت، فقہ ہو یا عرفان، حلال و حرام کا ظاہری حکم اپنی جگہ، مگر اس کے پیچھے نیت، اخلاص، تقویٰ اور بصیرت کی کسوٹی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ جو انسان صرف فقہی فتویٰ کو معیار بنائے، مگر تقویٰ و بصیرت سے غافل ہو، وہ حلال کو ظلم بنا دیتا ہے اور صغیرہ گناہ کو معمولی جان کر جہنم کی طرف بڑھتا ہے۔

اسلام کی سیرت ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ عمل قیمتی ہے جو "للّٰہ" ہو۔ ایک قطرہ آنسو، جو اخلاص سے بہے، لاکھ نوافل پر بھاری ہے۔ اور ایک مباح بات، جو کسی کا دل توڑ دے، ہزار عبادتوں کو ضائع کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی قربانی کو "اصلاحِ امت" کے لیے پیش کیا، نہ کہ صرف "اقتدار" کے لیے۔ اگرچہ اقتدار اہلِ حق کا حق تھا، مگر جب حالات ایسے ہوں کہ اقتدار خود دین کے خلاف استعمال ہونے لگے، تو خاموشی، صبر، اور قربانی افضل بن جاتی ہے۔

اسی اصول پر روزمرہ زندگی میں بھی ہمیں اپنے اعمال کو دیکھنا چاہیے۔ ہر جائز بات ہر وقت موزوں نہیں، ہر مباح خواہش ہر مقام پر اچھی نہیں، اور ہر چھوٹا گناہ معمولی نہیں۔ جو دل اللہ کی محبت سے روشن ہو، وہ جائز کو بھی اپنی روح کے مطابق چنتا ہے، اور حرام سے اس طرح ڈرتا ہے جیسے وہ جہنم کا دہانہ ہو۔ یہ خوف، یہ بصیرت، اور یہ عشقِ خداوندی ہی انسان کو "عبد" بناتی ہے، ورنہ دین صرف حلال و حرام کے جدول میں گم ہو کر رہ جائے۔

دین کی روح یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کی ظاہر و باطن ہر دونوں سطحوں پر نگرانی کرے۔ جہاں شریعت "کیا حلال ہے" کا جواب دیتی ہے، وہاں تقویٰ "کیا مناسب ہے" کا سوال

اٹھاتا ہے۔ اور جب انسان "کیا پسندیدہ ہے اللہ کے نزدیک" کی منزل پر پہنچتا ہے، تو وہ نہ صرف ہر چھوٹے حرام سے بچتا ہے بلکہ حلال میں بھی اعتدال، اخلاص اور ترک کو اختیار کرتا ہے، صرف اس لیے کہ اس کا محبوب راضی ہو جائے۔ یہی عبدیت ہے، یہی فلاح ہے، یہی اصلِ دین ہے۔

چند مثالوں سے واضح کرتے ہیں کہ شریعتِ محمدیؐ میں حلال و حرام کی تقسیم محض فقہی سطح پر نہیں بلکہ روحانی و معاشرتی نتائج کے تناظر میں بھی دیکھی جاتی ہے۔ جو چیز حلال ہے، وہ اپنی ذات میں مباح ضرور ہے، لیکن اس کا ارتکاب ہر حال میں افضل یا مستحب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح جو چیز حرام ہے، اگرچہ وہ چھوٹی معلوم ہو، لیکن اس کے ترک میں نجات اور اس کے ارتکاب میں ہلاکت ہے۔

فرض کیجیے کہ کوئی شخص روزانہ دیر رات تک جاگتا ہے، فلمیں دیکھتا ہے، یا دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ یہ تمام افعال اپنی ذات میں اگر گناہ نہ ہوں تو مباح ضرور ہیں، لیکن جب یہ عمل نمازِ فجر کے فوت ہونے، قرآن سے دوری، یا ذہنی سستی کا سبب بنے، تو یہی حلال فعل نقصان دہ بن جاتا ہے۔ ایک اور مثال یہ کہ کوئی انسان بہت زیادہ کھانے کا عادی ہے۔ کھانا حلال ہے، لیکن جب اعتدال ختم ہو جائے، صحت کو نقصان پہنچے، یا عبادت میں سستی آئے، تو یہی حلال چیز غفلت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

انسانی نفس ایک پیچیدہ ترکیب ہے۔ کبھی وہ حرام کو چھوٹا سمجھ کر انجام دیتا ہے، جیسے غیبت، چغلی، نظر کی خیانت، یا دل آزاری۔ بظاہر یہ گناہ کبیرہ نہیں لگتے، لیکن قرآن کہتا ہے: كَلَّا

بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ (المطففين:14)، یعنی ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ چھا گیا ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں کسی کی غیر حاضری میں اس کا مذاق اڑانا، اس کی نیت پر شک کرنا، یا اپنے مزاح کے لیے کسی کو شرمندہ کرنا، یہ سب وہ معمولی باتیں لگتی ہیں جن سے کوئی شرم محسوس نہیں کرتا، لیکن یہی صغائر دل کو زنگ آلود کر دیتے ہیں، حتیٰ کہ وہ وعظ و نصیحت سے متاثر ہونا بند کر دیتا ہے۔

اسی طرح ایک عالم دین، جسے حلال ہے کہ وہ دینی قیادت کرے، تقریر کرے، عوام کو فتوے دے، اگر اس کا مقصد نفس کی تسکین، مقبولیت، اور شہرت بن جائے، تو وہی جائز افعال اس کی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی عالم خاموشی سے گوشہ نشینی اختیار کرتا ہے، ظاہر میں کچھ نہیں کرتا، لیکن دل سے دین کی خدمت، دعا، اور اصلاحِ نفس میں مشغول ہے، تو وہ اللہ کے نزدیک زیادہ مقرب ہو سکتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کا یہ قول کہ "جو عمل تمہارے لیے نقصان دہ ہو، اگرچہ وہ حلال ہو، اس سے پرہیز کرو" اسی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔

خاندان کی سطح پر بھی مثال دی جاسکتی ہے۔ اگر کسی مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے، لیکن اگر وہ اپنے نفس، اپنی مالی حیثیت، یا عدل کی صلاحیت سے واقف ہو کہ وہ انصاف نہیں کر سکے گا، تو اس کے لیے یہ حلال عمل فتنے کا دروازہ بن جائے گا۔ بعینہٖ اگر کوئی عورت بار بار دوسروں سے اپنی سسرال یا شوہر کی شکایت کرے، بظاہر اپنا درد بیان کرنا حرام نہیں، لیکن

اگر یہ ماحول کو خراب کرے، یا دوسروں کے دل میں کینہ پیدا کرے، تو یہی مباح بات گناہ کے دروازے کھولتی ہے۔

اسلام کی سیرت ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ عمل قیمتی ہے جو "للّٰہ" ہو۔ ایک قطرہ آنسو، جو اخلاص سے بہے، لاکھ نوافل پر بھاری ہے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب انہیں کھانے کے وقت سائل کی صدا آئی، تو وہ اپنا پورا کھانا دے دیتی ہیں، حالانکہ کھانا ان کے لیے حلال اور ضروری تھا، مگر ایک بلند روحانی مقام پر مباح کو ترک کرنا افضل بن گیا۔ اور اس کے برعکس، اگر کوئی شخص اذان کے فوراً بعد مسجد جاتا ہے، صفِ اول میں کھڑا ہوتا ہے، لیکن نیت ریاکاری کی ہو، تو یہ حلال و مستحب عمل اس کے لیے وبال بن جاتا ہے۔

یہی اصول ہمیں دینِ اسلام کے اجتماعی اور سیاسی پہلوؤں میں بھی نظر آتا ہے۔ اگرچہ حکومت کا قیام، قیادت اور فتوے دینا بعض شرائط کے ساتھ جائز اور حتیٰ واجب ہو سکتا ہے، لیکن جب یہ امور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ جائیں جو خود پسند ہوں، شہرت طلب ہوں یا دینی بصیرت سے محروم ہوں، تو وہ جائز عمل فتنہ بن جاتا ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مذہبی افراد اپنی جماعتوں کے لیڈر بنتے ہیں، دینی نعرے بلند کرتے ہیں، لیکن آپس میں جھگڑے، الزامات، اور اقتدار کی دوڑ ان کے عمل کو بے اثر کر دیتی ہے۔ وہ کام جو امامتِ حق کے لیے تھا، اب دنیاوی سیاست کا روپ دھار لیتا ہے۔

امام حسینؑ نے اقتدار کو ٹھکرا کر یہ سکھایا کہ ہر جائز چیز ہر وقت مطلوب نہیں ہوتی۔ اگر اقتدار کی قیمت دین کی مصلحت ہو، تو خاموشی، صبر، اور قربانی افضل ہے۔ اسی طرح حضرت علیؑ نے کئی مواقع پر خلفاء کو مشورے دیے، حالانکہ ان کی خلافت غصب ہوئی تھی، لیکن دین کی وحدت اور امت کی مصلحت کو مقدم جانا۔

پس تقلید ہو یا قیادت، فقہ ہو یا عرفان، حلال و حرام کا ظاہری حکم اپنی جگہ، مگر اس کے پیچھے نیت، اخلاص، تقویٰ اور بصیرت کی کسوٹی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ جو انسان صرف فقہی فتویٰ کو معیار بنائے، مگر تقویٰ و بصیرت سے غافل ہو، وہ حلال کو ظلم بنا دیتا ہے اور صغیرہ گناہ کو معمولی جان کر جہنم کی طرف بڑھتا ہے۔ دین کی روح یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کی ظاہر و باطن ہر دونوں سطحوں پر نگرانی کرے۔ جہاں شریعت "کیا حلال ہے" کا جواب دیتی ہے، وہاں تقویٰ "کیا مناسب ہے" کا سوال اٹھاتا ہے۔ اور جب انسان "کیا پسندیدہ ہے اللہ کے نزدیک" کی منزل پر پہنچتا ہے، تو وہ نہ صرف ہر چھوٹے حرام سے بچتا ہے بلکہ حلال میں بھی اعتدال، اخلاص اور ترک کو اختیار کرتا ہے، صرف اس لیے کہ اس کا محبوب راضی ہو جائے۔ یہی عبدیت ہے، یہی فلاح ہے، یہی اصلِ دین ہے۔

ایسی صلاحیت حاصل کرنے کے لیے محض علمی قابلیت یا ظاہری فہم کافی نہیں ہوتا بلکہ ایک ہمہ جہت تربیت درکار ہوتی ہے جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو سنوارے۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے اندر صدق نیت ہو۔ اگر نیت میں خلوص نہ ہو اور عمل کی بنیاد خود نمائی، شہرت، یا دنیوی فائدہ ہو، تو چاہے انسان علم میں بہت بلند ہو، اس کی نگاہ باطن تک

رسائی حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ راستہ وہی طے کر سکتا ہے جو اپنے نفس کو پہچانے، اس کی خامیوں کو سمجھے اور مسلسل اس کے خلاف جہاد کرے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسان کے پاس بنیادی دینی علم ہونا ضروری ہے تاکہ وہ شریعت کی حدود کو سمجھے۔ صرف فقہی مسائل یاد کرنا کافی نہیں، بلکہ ان کے پیچھے کارفرما حکمتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ، آئمہؒ کی سیرت کا فہم، اور فقہی اصولوں میں بصیرت انسان کو یہ قابلیت عطا کرتی ہے کہ وہ محض ظاہر شریعت پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے باطن میں اترے۔

اس کے ساتھ ساتھ انسان کو تقویٰ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ تقویٰ محض حرام سے بچنے کا نام نہیں، بلکہ مباح اور حلال امور میں بھی خدا کی رضا کو مقدم رکھنا ہے۔ جو دل خدا کے ذکر سے زندہ ہو، وہ ایک جائز بات کو بھی انجام دینے سے پہلے سوچتا ہے کہ آیا یہ خدا کے قرب کا ذریعہ ہے یا نفس کی غذا؟ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جہاں انسان "کیا کرنا حلال ہے" سے آگے بڑھ کر "کیا کرنا اللہ کے نزدیک بہتر ہے" کی سطح پر پہنچتا ہے۔

اس مقام تک پہنچنے کے لیے انسان کو مسلسل محاسبہ نفس کی عادت ڈالنی ہوتی ہے۔ ہر عمل کے بعد یہ دیکھنا کہ میں نے یہ کیوں کیا، کس نیت سے کیا، اس کے اثرات کیا ہوں گے، اور کیا یہ عمل خدا کے لیے تھا یا کسی اور کے لیے؟ یہ اندرونی سوالات اگر مسلسل انسان کے دل میں اٹھتے رہیں، تو وہ بتدریج وہ قابلیت حاصل کر لیتا ہے جس کے ذریعے وہ نہ صرف صغیرہ گناہوں سے بچتا ہے بلکہ حلال و مباح اعمال میں بھی پرکھ کی کسوٹی قائم رکھتا ہے۔

مزید یہ کہ انسان کو اہلِ معرفت اور اہلِ تقویٰ کی صحبت اختیار کرنی چاہیے۔ تنہا چلنے والے اکثر دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ جب انسان کو کوئی رہبر، کوئی مرشد، یا کوئی باصفا عالم مل جائے جو خود اس راستے پر چلا ہو، تو وہ اس کے آئینہ دل میں اپنی خطاؤں کو پہچان سکتا ہے۔ یہ تربیت، یہ صحبت، اور یہ روحانی رہنمائی بھی اس قابلیت کے لیے ضروری ہے۔

آخرکار یہ بات سمجھنا بھی ضروری ہے کہ یہ مقام کسی دن یا سال میں حاصل نہیں ہوتا۔ یہ ایک مسلسل سفر ہے، جو خلوص، علم، عبادت، تقویٰ، اور مسلسل اصلاحِ نفس کے ذریعے طے ہوتا ہے۔ جو شخص مسلسل اللہ کی طرف پلٹتا رہے، اپنی خامیوں کو پہچانتا رہے، اور ہر دن ایک نیا قدم تقربِ الٰہی کی طرف اٹھائے، وہی اس صلاحیت کا اہل بنتا ہے کہ حلال و مباح میں بھی بصیرت سے کام لے، اور صغیرہ گناہوں کو بھی پہاڑ کی مانند دیکھے۔ یہی وہ عبد ہے جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: إِنما يخشى الله من عباده العلماء — صرف وہی لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں جو علم و معرفت رکھتے ہیں۔

مقصد حیات کیا ہونا چاہیے؟

مقصدِ حیات کا سوال انسان کی فطرت سے جڑا ہوا ہے۔ ہر انسان، چاہے وہ کسی بھی خطے، مذہب یا معاشرت سے تعلق رکھتا ہو، اپنے وجود کی حقیقت کو جاننے کے لیے کبھی نہ کبھی ضرور متفکر ہوتا ہے۔ یہ سوال کہ "میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ اور کہاں جانا ہے؟" دراصل وہی سوال ہے جو انسان کو کسی نہ کسی مقام پر جھنجھوڑ کر بیدار کرتا ہے، اور یہی بیداری دراصل زندگی کے اصلی سفر کی شروعات ہوتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے مقصدِ حیات اللہ کی بندگی اور اس کے بتائے ہوئے نظام کے مطابق زندگی گزارنا ہے۔ قرآن مجید میں واضح الفاظ میں بیان ہوا: * "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" * یعنی "ہم نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے"۔ لیکن یہ عبادت صرف نماز، روزہ اور ظاہری عبادات تک محدود نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جس میں ہر پہلو، چاہے وہ تعلیم ہو، معیشت ہو، سیاست ہو یا معاشرت، سب اللہ کی اطاعت اور رضائے الٰہی کے تحت آتے ہیں۔

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے اہداف اس شعور کے ساتھ طے کرے کہ وہ دنیا میں آزمائش کے لیے آیا ہے اور اس کا ہر عمل اس کی آخرت پر اثر انداز ہوگا۔ اسے یہ جان لینا چاہیے کہ کامیابی کا مطلب صرف مادی ترقی، شہرت یا دولت نہیں بلکہ کامیابی اس میں ہے کہ وہ اپنے رب کو راضی کرے اور اہل بیتؑ کے نقش قدم پر چل کر ایک پاکیزہ، با مقصد اور با اثر زندگی

گزارے۔ یہی وہ راستہ ہے جو اسے نہ صرف دنیا میں عزت عطا کرتا ہے بلکہ آخرت میں نجات بھی۔

اہل بیتؑ علیہم السلام کی معرفت درحقیقت دین کی روح ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: * "میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، کتاب اللہ اور میری عترت، اہل بیتؑ۔ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر مجھ سے آ ملیں۔" * اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی سمجھ بھی اہل بیتؑ کے در سے وابستہ ہے۔ معرفتِ اہل بیتؑ حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلا قدم ان کی سیرت کا مطالعہ ہے۔ ہمیں ان کی زندگیوں کے واقعات کو صرف تاریخی کہانیاں سمجھ کر نہیں بلکہ رہنمائی کے دستور کے طور پر پڑھنا ہو گا۔

جب ہم امام علیؑ کی عدالت، ان کی زہد و شجاعت، امام حسنؑ کی صلح میں حکمت، امام حسینؑ کی قربانی میں دین کی بقا، امام زین العابدینؑ کے صحیفہ میں مناجات، امام باقرؑ کی علمی گہرائی، امام جعفر صادقؑ کی تدریسی حکمت، اور بقیہ آئمہ معصومینؑ کی حیات میں دشمن کے مقابل صبر، تقویٰ، عزتِ نفس، اور دین کی حفاظت کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں رہنمائی ملتی ہے۔

اہل بیتؑ کی معرفت محض محبت تک محدود نہیں بلکہ محبت کے تقاضے کو نبھانا یعنی ان کے نقش قدم پر چلنا اصل معرفت ہے۔ ہم زبان سے یا حسینؑ کہیں، یا علیؑ کے نعرے لگائیں لیکن اگر ہمارا کردار ظلم سے سمجھوتا کرے، ہماری تجارت دھوکہ پر ہو، ہمارا علم غرور کا

ذریعہ ہو، ہماری زندگی مقصد سے خالی ہو، تو یہ محض جذبات ہیں، جن کا اہل بیتؑ کے مشن سے کوئی تعلق نہیں۔ اہل بیتؑ ہمیں بتاتے ہیں کہ معرفت عمل کے بغیر ادھوری ہے۔

زندگی کو اہل بیتؑ کے بتائے ہوئے طریقے سے گزارنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں اپنی نیتوں کو خالص کرنا ہوگا۔ ان کی تعلیمات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ انسان کی سب سے بڑی طاقت اس کا تقویٰ ہے۔ ان کی زندگی سادگی، سخاوت، عدل، حلم، صداقت، دیانت، اور علم سے عبارت ہے۔ ہمیں اپنی زندگی میں ان اوصاف کو شامل کرنا ہوگا۔ عبادات، معاملات، اخلاق، حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی ہمارا سلوک ایسا ہو کہ وہ گواہی دیں کہ یہ اہل بیتؑ کے ماننے والے ہیں۔

اہل بیتؑ کے طریقے سے زندگی گزارنے کے لیے ہمیں تعلیم حاصل کرنی ہوگی، نہ صرف دینی بلکہ دنیاوی علوم بھی تاکہ ہم امت کے مسائل کو سمجھ کر ان کا حل تلاش کر سکیں۔ ہمیں ظالم نظاموں کے خلاف کھڑے ہونے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا۔ ہمیں اپنی نسل کو یہ شعور دینا ہوگا کہ وہ صرف ایک کامیاب انسان نہیں بلکہ ایک باوقار، صاحبِ معرفت، اور اہل بیتؑ کے مقصد کے محافظ بنیں۔ ہمیں سچ بولنا ہوگا، عدل کے ساتھ کھڑا ہونا ہوگا، جھوٹے لبادوں سے باہر نکل کر صداقت کی راہ پر چلنا ہوگا۔

مقصدِ حیات یہی ہونا چاہیے کہ ہم معرفتِ خدا اور معرفتِ امام زمانہؑ حاصل کریں، اور اس معرفت کو عمل میں تبدیل کر کے ایک ایسی زندگی گزاریں جس پر ہمارے امامؑ اگر نظر ڈالیں تو ہم شرمندہ نہ ہوں بلکہ ان کی سپاہ کا ایک چھوٹا سا پرزہ بننے کے قابل ہوں۔ زندگی

اس وقت کامیاب ہے جب وہ امامؑ کے مشن کی خدمت کرے، ورنہ وہ محض وقت کا ضیاع ہے۔

کسی بھی قوم یا امت کے اجتماعی اہداف کا حصول تبھی ممکن ہوتا ہے جب اس کے افراد، خواہ وہ مختلف سماجی پس منظر، تعلیم، معاشرتی درجے، یا مذہبی و فکری گروہوں سے تعلق رکھتے ہوں، ایک مشترکہ روحانی و اخلاقی مرکز پر متحد ہوں۔ اسلامی تعلیمات، خاص طور پر اہل بیت علیہم السلام کی روشنی میں، یہی بتاتی ہیں کہ اصل بنیاد معرفت ہے، اور معرفت وہ نور ہے جو فطرتِ انسانی کے اندر پہلے ہی سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اس نور کو جگانے کے لیے صرف فکری رابطہ نہیں بلکہ قلبی بیداری بھی ضروری ہے۔

جب معاشرہ مختلف طبقات، زبانوں، ثقافتوں اور مسلکی تنوع پر مشتمل ہو تو بظاہر یہ انتشار کا سبب لگتا ہے، لیکن اگر ان سب کو ایک اعلیٰ تر اور جامع مقصد کے تحت منظم کیا جائے تو یہی تنوع طاقت بن سکتا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم انسان کو اس کی اصل حیثیت سے پہچنوائیں، یعنی وہ ایک عبد ہے، مخلوق ہے، اور اس کے اندر حق و باطل کو پہچاننے کی صلاحیت ہے۔ یہ شعور سب کے اندر جگایا جا سکتا ہے، چاہے وہ ایک ان پڑھ دیہاتی ہو یا کسی یونیورسٹی کا پروفیسر، ایک مزدور ہو یا صنعتکار، ایک صوفی ہو یا فلسفی۔

مقصدِ حیات کو سب کے لیے قابلِ فہم بنانے کے لیے لازم ہے کہ دین کو طبقاتی زبان سے نکال کر انسانی فطرت کی زبان میں بیان کیا جائے۔ مثال کے طور پر جب امام حسینؑ نے کربلا میں فرمایا کہ "میں اصلاحِ امتِ جدی کے لیے نکلا ہوں"، تو یہ اصلاح کسی خاص فرقے، قبیلے، یا معاشرتی گروہ کے لیے نہ تھی بلکہ پوری انسانیت کی فطری ضرورت تھی۔ ہر وہ انسان

جو ظلم، دھوکہ، جبر، حرص، غرور، اور بے معنویت کے خلاف لڑنا چاہتا ہے، وہ اس پیغام سے جڑ سکتا ہے۔

تعلیم اور شعور کی سطح مختلف ہو سکتی ہے، لیکن اگر زبان و انداز کو ہر گروہ کی سمجھ کے مطابق ڈھالا جائے تو ایک عام دکاندار کو بھی امامؑ کی قربانی کا مقصد سمجھ آ سکتا ہے، اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور کو بھی۔ ہمیں ہر طبقے تک ان کی زبان، ان کے انداز، اور ان کے رجحانات کے مطابق بات پہنچانی ہے۔ یہی اہل بیتؑ کا طریقہ تھا۔ کبھی وہ محراب میں علم کی بارش کرتے تھے، کبھی غلام سے بات کر کے اخلاق سکھاتے تھے، کبھی دشمنوں کو حلم و کرم سے رام کرتے تھے، اور کبھی مناظرے میں عقل کو قائل کرتے تھے۔

سماجی مقام کی تفریق کو مٹانے کا سب سے مؤثر ذریعہ عملی اخلاق اور خدمت ہے۔ اگر ایک دینی کارکن یا داعی اپنے قول و عمل میں مخلص ہو، اور کسی امیر و غریب، شیعہ و سنی، عالم و جاہل کے درمیان فرق نہ کرے بلکہ ان سب کے سامنے خود کو عبدِ خدا اور خادمِ خلق سمجھے، تو دلوں کے بند دروازے کھلتے ہیں۔ جب ہم کسی کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں، اس کی ضرورت کو سمجھتے ہیں، اس کی عزتِ نفس کا خیال رکھتے ہیں، تو ہم وہ دروازے کھولتے ہیں جہاں سے پیغامِ اہلبیتؑ رسائی حاصل کرتا ہے۔

مذہبی و فرقہ وارانہ تنوع کو دشمنی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ہم اسے حقیقت کے شعور تک پہنچنے کا وسیلہ بنائیں۔ اہل بیتؑ کا طریقہ یہ نہیں تھا کہ وہ دوسروں کو صرف ظاہری اختلاف پر رد کرتے، بلکہ وہ انسانوں کو ان کی فطرت، نیت، اور سچ کی تلاش پر پرکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے چاہنے والے نہ صرف اہل تشیع میں تھے بلکہ اہل سنت، زاہدین، صوفیاء، اور

عام لوگ بھی ان کی عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ ہمیں بھی یہی حکمت اپنانی ہوگی۔ کسی کو دشمن نہ سمجھا جائے بلکہ ایک بھولا ہوا بھائی تصور کیا جائے جو اپنی اصل سے دور ہو چکا ہے۔

ان سب کے ساتھ ایک اور ضروری نکتہ یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی جگہ ایک "مرکزِ تبدیلی" بننے کا شعور دیا جائے۔ وہ گھر ہو یا مدرسہ، مسجد ہو یا بازار، فیکٹری ہو یا میڈیا، سب میں اپنے مقام پر ایک اصلاحی اور ایمانی تحریک کا بیج بویا جائے۔ اس کام کے لیے ہمیں صرف کتابیں یا خطبے نہیں بلکہ زندہ مثالیں، روابط، اور تربیتی تسلسل کی ضرورت ہے۔ ہر فرد، اپنے ظرف، تعلیم، مقام اور دائرہ اثر کے مطابق اس مقصد کا ایک کارکن بن سکتا ہے۔

جب ہم ہر انسان کو مخاطب کریں، اس کی عزتِ نفس کو مجروح کیے بغیر، محبت، حکمت، اور خدمت کے ساتھ، اور مقصدِ زندگی کو اہل بیتؑ کی روشنی میں ایک جیتا جاگتا ہدف بنائیں، تو تب ایک ایسا معاشرہ جنم لیتا ہے جس میں تنوع باہمی احترام میں بدل جاتا ہے، فکری اختلاف تعلیم و حکمت کا دروازہ بن جاتا ہے، اور ہر دل سے لبیک یا حسینؑ کی صدا نکلتی ہے، جس کا مطلب صرف ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک جہت ہے، ایک شعور ہے، اور ایک راستہ ہے امامِ زمانہؑ کی نصرت کا۔

الٰہی ہمیں اس حکمت، وسعتِ نظر، محبت، استقامت، اور اخلاص کی توفیق دے کہ ہم ہر دل کو تیرے ولی کی طرف موڑ سکیں، چاہے وہ کسی بھی قوم، قبیلے یا طبقے سے ہو۔ الٰہی ہمیں مقدس ہستیوں کی معرفت عطا فرما، ان کی اطاعت کی توفیق دے، اور ان کے ظہور کے لیے ہمیں انصارِ صادق بنا۔ آمین یارب العالمین۔

سوال کی اقسام

سوال، انسانی عقل و شعور کی سب سے بنیادی حرکت ہے۔ یہ صرف گفتگو کا ایک ذریعہ نہیں بلکہ انسان کے اندر موجود تجسس، شک، جستجو، اضطراب یا اطمینان کی کسی نہ کسی سطح کا مظہر ہوتا ہے۔ سوال کرنا محض کسی بات کو جاننے کی خواہش نہیں، بلکہ یہ انسان کی داخلی دنیا، نفسیاتی کیفیت، اور سماجی مقام کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ "سوال آدھا علم ہوتا ہے" —یہ جملہ ایک سادہ علمی محاورہ ہی نہیں بلکہ انسانی فکری ارتقاء کی جڑوں کو بیان کرتا ہے۔ تاہم، ہر سوال علم کی جانب نہیں جاتا، بعض سوال راستہ بناتے ہیں تو بعض سوال دھند پھیلاتے ہیں۔ ان کا مقصد مختلف ہو سکتا ہے: جاننا، آزمانا، چیلنج کرنا، شرمندہ کرنا، یا کبھی کبھی صرف سننے والے کو تولنا۔

سوالوں کی نفسیاتی اقسام کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ محض خارجی اقسام (جیسے معلوماتی، تحقیقی، تفتیشی، تنقیدی) نہیں بلکہ داخلی محرکات کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایک سوال وہ ہوتا ہے جو لاعلمی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس میں خلوص پایا جاتا ہے، سیکھنے کا جذبہ ہوتا ہے، اور اگر اسے مناسب جواب دے دیا جائے تو وہ علم میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسا سوال عام طور پر طالب علم، محقق یا عام آدمی کی طرف سے آتا ہے جو کسی موضوع پر الجھن یا ابہام محسوس کرتا ہے۔ اس کا ذہن خالی یا نیم خالی ہوتا ہے، اور وہ سوال کو ایک سیڑھی کے

طور پر استعمال کرتا ہے تاکہ آگے بڑھ سکے۔ ایسے سوال کا جواب دینا نہ صرف درست ہے بلکہ ضروری بھی، کیونکہ یہ نہ دیا جائے تو سائل کسی غلط فہمی یا گمراہی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

دوسرا سوال وہ ہوتا ہے جو شک یا عدم اعتماد کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہاں سائل کو کسی بات کا اندازہ ہوتا ہے لیکن وہ مطمئن نہیں، یا جاننا چاہتا ہے کہ سامنے والے کے علم، نیت یا دیانت کا درجہ کیا ہے۔ یہ سوال ظاہری طور پر تعلیمی ہو سکتا ہے مگر اس کے پس پردہ ایک امتحان ہوتا ہے۔ ایسا سوال اکثر شاگرد، تنقید کرنے والے، یا مختلف مسالک و نظریات کے حامل افراد کی طرف سے آتا ہے۔ ان کا مقصد سیکھنا کم اور تولنا زیادہ ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب دینا صرف علمی نہیں، بلکہ حکیمانہ ہونا چاہیے، کیونکہ سائل کی نفسیاتی ضرورت صرف معلومات نہیں، بلکہ ایک قابلِ اعتماد، باوقار، اور پر اثر شخصیت کا تاثر حاصل کرنا بھی ہوتی ہے۔ اگر اس قسم کے سوال کو خشک معلومات سے جواب دیا جائے تو وہ مطلوبہ اثر پیدا نہیں کرتا، اور اگر جذباتی یا ردعمل میں جواب دیا جائے تو سائل مزید دور ہو جاتا ہے۔

تیسری قسم کے سوالات وہ ہوتے ہیں جو صرف آزمانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ان میں سائل کو معلوم ہوتا ہے کہ جواب کیا ہوگا، مگر وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مخاطب کیسے ردعمل دیتا ہے۔ یہ اکثر وہ لوگ کرتے ہیں جو خود کو ذہین سمجھتے ہیں یا جنہیں دوسروں کی سطح جانچنے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ سوالات غرور، انا یا علمی برتری کے احساس سے نکلتے ہیں۔ ان کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں بلکہ اپنے اندرونی تفاخر کی تسکین ہوتا ہے۔ ان سوالات کا جواب دینا اگر لازمی ہو تو تحمل، وقار اور انکساری کے ساتھ دینا بہتر ہوتا ہے، اور اگر محسوس ہو کہ

جواب دینے سے سائل کی انا کو خوراک ملے گی اور فتنہ بڑھے گا، تو خاموشی یا سوال کو سوال سے موڑ دینا زیادہ دانشمندانہ ہوگا۔

چوتھی قسم وہ ہوتی ہے جو طنز، تمسخر یا ذہنی تحقیر کے لیے کی جاتی ہے۔ ان سوالات میں علمی یا فکری مقصد نہیں ہوتا، بلکہ یہ دوسرے کو نیچا دکھانے، اس کی کمزوری عیاں کرنے یا سامعین پر اثر جمانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ایسا سوال عام طور پر بحث مباحثوں، مناظروں، یا سوشل میڈیا پر ہوتا ہے، جہاں سائل کی نیت علم نہیں بلکہ فتح حاصل کرنا ہوتی ہے۔ اس نوعیت کے سوالات کے پیچھے ایک گہری نفسیاتی ناامنی یا برتری کا خبط بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے سوالات کا جواب دینے سے پہلے یہ طے کرنا چاہیے کہ کیا جواب سے کسی فرد یا گروہ کو فائدہ ہوگا، یا یہ صرف مزید فساد اور نفرت کو جنم دے گا۔ اگر جواب دینا ضروری ہو تو وہ اتنا متوازن اور وقار بھرا ہو کہ سائل کی بے ادبی خود ظاہر ہو جائے اور سننے والے فرق کو سمجھ جائیں۔

سماجی طبقات کے حوالے سے بھی سوالات کی نوعیت اور اہمیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک کم علم، دیہی یا غریب طبقے سے تعلق رکھنے والا شخص جو سوال کرتا ہے، اس میں اکثر سادگی اور فطری الجھن ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، تعلیمی، شہری، یا اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کا سوال زیادہ نظریاتی، پیچیدہ یا تہ دار ہو سکتا ہے۔ ایسے میں سائل کی سماجی حیثیت کو نظر انداز کرنا علمی بددیانتی ہوگی۔ استاد، محقق، یا عالم کو چاہیے کہ وہ سائل کی سماجی سطح کے

مطابق جواب دے، نہ اتنا پیچیدہ کہ سائل مزید الجھ جائے، اور نہ اتنا آسان کہ وہ محسوس کرے کہ اسے بچہ سمجھا جا رہا ہے۔ یہی تدریج، حکمت اور بصیرت کی علامت ہے۔

بعض اوقات سوالات مختلف موضوعات میں الجھے ہوتے ہیں۔ جیسے ایک سوال مذہبی لگتا ہے، مگر اس کے پیچھے سیاسی یا معاشی سوال ہوتا ہے۔ ایک سوال فلسفیانہ زبان میں ہوتا ہے مگر اس کا مقصد نفسیاتی الجھن کو حل کرنا ہوتا ہے۔ ایسے سوالات کا تجزیہ ضروری ہے، کیونکہ اگر ہم اس کے ظاہر کو لے کر جواب دیں تو مقصد حل نہیں ہوتا۔ سائل کی اصل الجھن وہی ہوتی ہے جو پوشیدہ ہے۔ اس لیے سننے اور سمجھنے کی صلاحیت، الفاظ کے ماوراء دیکھنے کی اہلیت، اور انسان کے نفسیاتی زاویے کو پڑھنے کی مہارت ایک اچھے معلم، مبلغ یا محقق کے لیے لازم ہے۔

سوال کی ایک قسم وہ بھی ہے جو سائل نہیں، بلکہ سامعین کے لیے کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ مجلس، کلاس یا گفتگو میں سوال اس لیے کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو معلوم ہو کہ وہ بھی موجود ہیں، وہ بھی سوچتے ہیں، اور ان کی بھی کوئی رائے ہے۔ یہ سوال اکثر خود نمائشی ہوتا ہے، اور اس کا مقصد سامنے والے سے علم حاصل کرنا نہیں بلکہ خود کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ ایسے سوال کا جواب اگر علم سے دیا جائے تو سائل مطمئن نہیں ہوتا کیونکہ اس کا مقصد معلومات نہیں بلکہ توجہ ہوتی ہے۔ ان سوالات کا بہتر جواب وہ ہوتا ہے جو سنجیدگی کے ساتھ مگر دوسروں کی تعلیم کا ذریعہ بن جائے، اور سائل کو بھی وہ توجہ مل جائے جس کی اسے ضرورت ہے — مگر اس انداز میں کہ وہ علم کا حصہ بن جائے، شوبازی کا نہیں۔

آخر میں وہ سوالات بھی ہیں جو کیے ہی نہیں جاتے، مگر جنہیں کیا جانا چاہیے۔ یعنی وہ سوالات جو سائل کے ذہن میں ہوتے ہیں مگر وہ خوف، جھجک، یا ماحول کے دباؤ کی وجہ سے پوچھ نہیں پاتا۔ ایسے "غیر موجود سوالات" کو پہچاننا استاد یا مبلغ کا سب سے بڑا کمال ہوتا ہے۔ اگر کسی مجلس میں سب خاموش ہوں اور آپ محسوس کریں کہ ایک سوال سب کے ذہن میں ہے مگر کوئی پوچھ نہیں رہا، تو وہ سوال سننے کی صلاحیت اصل بصیرت ہے۔

پس، سوالات کی اقسام کا یہ تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر سوال کو ایک جیسا نہ لیا جائے۔ سوال کی نیت، وقت، سیاق، سائل کی کیفیت اور مقصد — سب کو سمجھ کر ہی اس کا جواب دینا چاہیے۔ ہر سوال کا جواب دینا فرض نہیں، اور ہر سوال سے بچنا بھی دانشمندی نہیں۔ اصل دانش یہ ہے کہ آپ سوال کی نوعیت کو سمجھیں، سائل کی منزل کو پہچانیں، اور اس کا جواب اس طرح دیں کہ وہ نہ صرف مسئلہ حل کرے بلکہ سائل کو بہتر انسان بننے کی طرف بھی لے جائے۔ یہی وہ فن ہے جو تعلیم کو صرف معلومات کا تبادلہ نہیں، بلکہ انسان سازی کا عمل بناتا ہے۔

دین کے طالب اور دین کے دشمن میں فرق

عصر حاضر میں دینی حلقوں میں سوال، تحقیق اور اعتراض جیسے الفاظ تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ ہر طرف گفتگو کا ماحول ہے، ہر شخص علم، دلیل، منطق، اور شعور کا دعویٰ کر رہا ہے، مگر ان نعروں اور اصطلاحات کی دھند میں وہ باریک فرق اکثر نظر انداز ہو جاتا ہے جو ایک طالب علم کو ایک فتنے پرور سے جدا کرتا ہے۔ دین کو سمجھنے کی کوشش اور دین کو مجروح کرنے کی سازش میں کبھی صرف لفظوں کا نہیں بلکہ نیت، اسلوب اور رویے کا فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق نہ صرف علمی حلقوں بلکہ عام دینی معاشروں میں بھی انتہائی اہم ہو چکا ہے، اور اس فرق کو پہچاننے کی اہلیت آج کے مؤمن کی سب سے بڑی ضرورت بن گئی ہے۔

پہلی قسم وہ لوگ ہوتے ہیں جو دین کو سیکھنا چاہتے ہیں، لیکن وہ محض سن لینے پر قانع نہیں، وہ سوال کرتے ہیں، تحقیق کرتے ہیں، ہر بات کو دلیل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، اور اپنے ذہن میں موجود اشکالات کو کھل کر بیان کرتے ہیں۔ ان کا انداز نرم بھی ہو سکتا ہے یا کبھی کبھی تیز بھی، کیونکہ وہ سچائی کی تلاش میں شدت محسوس کرتے ہیں۔ ان کے سوالات کا مقصد دین کو گرانا نہیں، بلکہ سمجھنا، صاف کرنا اور دل و دماغ کو مطمئن کرنا ہوتا ہے۔ وہ کبھی کبھی کسی عالم کی بات سے اختلاف بھی کرتے ہیں، مگر ان کا طرزِ گفتگو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ عالم کی شخصیت یا دین کے وقار کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے، بلکہ اس کی بات کو سمجھنا یا واضح کروانا

چاہتے ہیں۔ ایسے افراد اگرچہ سخت بات بھی کریں، ان کے اندر دین کا احترام، حق کی تلاش اور انصاف کا جذبہ چھپا ہوتا ہے۔ وہ عام طور پر تنقید کے بعد خود خاموشی سے مطالعہ کرتے ہیں، مزید سوالات کرتے ہیں، اور اگر انہیں دلیل مل جائے تو اس پر راضی ہو جاتے ہیں۔

ان سے بات کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے سوالات کو توجہ سے سنا جائے، جذباتی یا غصے سے نہیں بلکہ فکری طور پر جواب دیا جائے۔ اگر جواب معلوم نہ ہو تو ان سے وعدہ کیا جائے کہ تحقیق کر کے بتائیں گے، اور واقعی تحقیق کر کے واپس ان سے بات کی جائے۔ انہیں دشمن یا گستاخ نہ سمجھا جائے، بلکہ ایک متلاشی انسان کی طرح ان سے تعامل کیا جائے۔ ان کے سوالات پر شکر ادا کیا جائے کہ ان کی وجہ سے دین کے بعض گوشے واضح ہو رہے ہیں۔ اگر وہ بعض اوقات انداز میں سختی کریں تو وسعتِ نظر سے برداشت کیا جائے، اور ان سے امید رکھی جائے کہ وہ حق تک پہنچنے کی کوشش میں ہیں۔

دوسری طرف کچھ لوگ ہوتے ہیں جو بظاہر دین پر سوالات کرتے ہیں، لیکن ان کے سوالات کا مقصد نہ سمجھنا ہوتا ہے نہ اصلاح، بلکہ دین، اس کے نمائندوں، اور اس کے ماننے والوں کو ہدف بنانا ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف علماء کی توہین کرتے ہیں بلکہ ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں، ان کی نیتوں پر حملہ کرتے ہیں، ان کی زندگیوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے سوالات کے پیچھے حق کی تلاش نہیں بلکہ دین سے نفرت، ذاتی بغض، یا کسی مخصوص فکری یا سیاسی ایجنڈے کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ دلیل کو سننے پر آمادہ نہیں ہوتے، ان کا لہجہ عام طور پر تمسخر آمیز، نفسیاتی دباؤ ڈالنے والا اور دوسروں کو کم تر دکھانے والا ہوتا ہے۔ وہ مومنین کو

جاہل، رجعت پسند، ڈرپوک، یا منافق جیسے القابات دیتے ہیں، اور اگر کوئی عالم دین نرمی سے بات کرے تو اس پر بھی تضحیک کرتے ہیں۔ ایسے افراد اگر کبھی دلیل سے لاجواب ہو جائیں تو موضوع بدل دیتے ہیں یا ذاتی حملے پر آجاتے ہیں۔

ایسے افراد سے بات کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ پرکھنا ضروری ہے کہ آیا ان کے اندر کوئی صداقت کی چنگاری باقی ہے یا نہیں۔ اگر معلوم ہو کہ وہ صرف غصے، لاعلمی، یا ماضی کی کسی تلخی کی وجہ سے دین سے بدظن ہوئے ہیں، تو ان کے ساتھ صبر، خیر خواہی، اور تدریج سے بات کرنی چاہیے۔ ان کے ساتھ ذاتی دشمنی نہ کی جائے، بلکہ ان کے الفاظ کے پیچھے موجود درد کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ البتہ اگر یہ یقین ہو جائے کہ وہ صرف فتنہ پھیلانے، مخلص افراد کو مایوس کرنے، اور دین کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے آئے ہیں، تو ان سے کھل کر مگر حکیمانہ انداز میں بات کی جائے۔ ان کی باتوں کا مدلل جواب دیا جائے، ان کے طنز کا جواب طنز سے نہیں، مگر حکمت سے دیا جائے، اور جہاں ضروری ہو وہاں ان کی باتوں کا رد اجتماعی سطح پر بھی کیا جائے تاکہ ان کا اثر کم ہو۔

یہ مضمون دراصل ایک فکری تجزیہ ہے جو اس فرق کی تہوں کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ دین پر سوال کرنے والا ہر شخص دین کا دشمن نہیں ہوتا، اور ہر تنقید کرنے والا شخص گستاخ نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض افراد وہ ہوتے ہیں جو دل سے دین کو سمجھنا چاہتے ہیں، مگر وہ صرف سنی سنائی باتوں پر مطمئن نہیں ہوتے۔ ان کی فطرت میں سوال ہے، ان کی روح میں تلاش ہے، اور ان کی عقل بے چین ہے۔ ان کا انداز کبھی نرم اور کبھی

تیز ہو سکتا ہے، مگر اس میں جوہرِ صداقت پوشیدہ ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی عالم کی بات پر سوال اٹھاتے ہیں تو اس کا مقصد توہین نہیں ہوتا بلکہ وضاحت اور تحقیق ہوتا ہے۔ ایسے افراد تنقید کے بعد خاموشی سے مطالعہ کرتے ہیں، کبھی لوٹ کر دوبارہ سوال کرتے ہیں، اور اگر دلیل مل جائے تو اسے تسلیم کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سوال کو سیڑھی بناتے ہیں، راستہ نہیں روکتے۔ ان کے سوالات سے دین کے مبہم گوشے واضح ہوتے ہیں، سچ اور جھوٹ الگ ہوتا ہے، اور حق کے چراغ روشن ہوتے ہیں۔

مگر یہی انداز جب کسی بدنیت، فتنہ پرور اور نفرت انگیز ذہن میں آتا ہے تو سوال کا روپ بدل جاتا ہے۔ وہی منطق جو ہدایت کے لیے استعمال ہونی تھی، اب گمراہی کا ہتھیار بن جاتی ہے۔ ایسے لوگ سوال اس لیے نہیں کرتے کہ وہ دین کو سمجھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ دین کو چیلنج کرنا، مومنین کو شرمندہ کرنا اور علماء کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں استہزاء چھپا ہوتا ہے، ان کے سوالات میں زہر ہوتا ہے، اور ان کا مقصد اصلاح نہیں انتشار ہوتا ہے۔ وہ ہر عالم کو ظالم یا منافق ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں، ہر مکتبِ فکر کو اپنی دلیل سے تباہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ہر بات کا اختتام بدگمانی، بداعتمادی اور بیزاری پر کرتے ہیں۔ ان کے سوال میں نہ جستجو ہوتی ہے، نہ عاجزی، نہ تعظیم، اور نہ علمی دیانت۔ ان کے لہجے میں برتری، طنز، اور تعصب ہوتا ہے، اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ دین کی ساکھ کمزور ہو، دیندار افراد کمزور دل ہو جائیں، اور عوام میں دین سے دوری پیدا ہو۔

یہاں پر ایک نہایت اہم سماجی سوال جنم لیتا ہے: ان دونوں میں فرق کیسے پہچانا جائے؟ اور جب فرق پہچان لیا جائے، تو رویہ کیا اختیار کیا جائے؟

اس کا جواب ایک نہایت عمدہ فکری اصول کی صورت میں دیا جاسکتا ہے: پہچان کی کسوٹی نیت، لہجہ، اسلوب، تسلسل، اور نتائج ہیں۔ اگر کوئی شخص دلیل سے بات کرے، خود بھی سننے کو تیار ہو، سیکھنے کا جذبہ رکھتا ہو، اور اپنی گفتگو کے بعد تحقیق کرے، تو وہ طالب علم ہے۔ اس کے ساتھ محبت، علم، وقت اور احترام کے ساتھ گفتگو ہونی چاہیے۔ اس کے سوالات پر شکر ادا کیا جانا چاہیے کہ ان کے ذریعے دین کے پہلو نکھر رہے ہیں۔ اور اگر وہ کہیں تیز ہو بھی جائے تو وسعتِ قلبی سے برداشت کیا جائے، کیونکہ اس کی جڑ نیتِ خیر ہے۔ سادہ اصول یہ ہے کہ پہلا گروہ علم اور تحقیق کو ذریعہ بناتا ہے تاکہ وہ دین کے قریب آسکے، اور دوسرا گروہ انہی ذرائع کو ہتھیار بناتا ہے تاکہ دین کو مجروح کر سکے۔ پہلا گروہ اگر سوال کرتا ہے تو خود بھی مطالعہ کرتا ہے، سیکھنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ سوال کے پردے میں صرف نفرت پھیلاتا ہے، اور اسے جواب میں دلائل نہیں بلکہ بحث میں غلبہ درکار ہوتا ہے۔

مگر اگر کوئی شخص بار بار انہی اعتراضات کو دہراتا ہے، دلیل سننے سے انکاری ہوتا ہے، ہر مکالمے میں طنز کا تیر چلاتا ہے، اور سوال کے پردے میں طعن و تشنیع کی چھری گھونپتا ہے، تو وہ طالب علم نہیں بلکہ فتنے کا پجاری ہے۔ ایسے شخص سے پہلے اس کی نیت کو پرکھا جائے، اگر اس میں کوئی سچائی باقی ہو تو خیر خواہی سے بات کی جائے، مگر اگر یقین ہو جائے کہ وہ صرف

زہر پھیلانے آیا ہے تو اس سے حکمت اور استقامت کے ساتھ نمٹا جائے۔ اس کی باتوں کو علمی انداز میں بے نقاب کیا جائے، اور اگر ضرورت ہو تو اس سے فاصلہ بھی رکھا جائے تاکہ سادہ دل عوام اس کے اثر سے محفوظ رہ سکیں۔

یہی وہ بصیرت ہے جس کا مطالبہ آج ہر عالم، ہر معلم، اور ہر داعی سے کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ دین کے خلاف فکری یلغار کا سب سے مہلک ہتھیار آج کا "دانشورانہ اعتراض" ہے، جو دلائل کی شکل میں، مہذب زبان میں، اور آزادیٔ فکر کے پردے میں پیش ہوتا ہے۔ اگر ہم سوال اور اعتراض، تحقیق اور استہزاء، سیکھنے اور بگاڑنے، طالب علم اور فتنہ پرور کے درمیان فرق نہ کر سکے، تو ہم یا تو ناحق سچوں کو رد کر دیں گے، یا ناحق فتنہ پروروں کو جگہ دے بیٹھیں گے۔

نہ ہر سوال کرنے والا گستاخ ہے، اور نہ ہر دلیل دینے والا مصلح۔ اصل معیار نیت، روش، اور ثمرات ہیں۔ اگر ہم اس فرق کو پہچاننے کا ہنر سیکھ لیں تو نہ صرف اپنے ایمان کو بچا سکتے ہیں بلکہ دین کے روشن چہرے کو فتنے کے گرد سے نکال کر دنیا کے سامنے نمایاں کر سکتے ہیں۔ یہ بصیرت ہمیں اہل بیتؑ کی سیرت، قرآن کے پیغام، اور رسول اکرمؐ کی حکمت سے سیکھنی چاہیے — کیونکہ یہی وہ چراغ ہیں جو ہر دور کے فتنے کے اندھیرے میں روشنی دیتے ہیں۔ دین کا طالب اور دین کا دشمن بظاہر ایک سے لگ سکتے ہیں، مگر ان کے دل، رویے اور نتائج ہمیشہ مختلف ہوتے ہیں۔ ان سے تعامل میں یہی فرق دیکھ کر چلنا چاہیے: جو طالب ہے، اسے علم و محبت دی جائے؛ جو دشمن ہے، اسے حکمت اور استقامت سے روکا جائے۔

مغربی فلسفے اور اسلام کی مختصر تاریخ

مغربی فلسفوں (Western Philosophies) اور ازمز (Isms) کی تاریخ انسانیت کے فکری ارتقاء (intellectual evolution)، معاشرتی وسیاسی تبدیلیوں (socio-political transitions)، اور سائنسی و عقلی مکاشفوں (scientific and rational discoveries) کے ساتھ گہری معنوی نسبت رکھتی ہے۔ یہ ایک طویل اور متنوع سفر ہے جو انسانی عقل کی تلاش (quest for reason), وجود کے معنی (meaning of existence), اخلاقی اقدار (moral values), اور سماجی نظم (social order) کے بارے میں مسلسل سوالات اور جوابات پر مشتمل ہے۔ اس فکری تاریخ کو اگر اسلامی تاریخ (Islamic Intellectual Tradition) کے ساتھ مربوط کیا جائے، تو ہمیں دو مختلف مگر متقابل جہانوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک طرف وحی (Revelation) اور عقل (Reason) کی ہم آہنگی پر مبنی تسلسلِ ہدایت (continuity of divine guidance) ہے، جو بعثتِ نبویؐ (Prophethood of Muhammad ﷺ) سے لے کر غیبتِ امام زمانہؑ (Occultation of Imam Mahdiؑ) تک ایک متصل الٰہی نظام کی صورت میں جلوہ گر ہے، اور دوسری طرف مغرب کی وہ فکری تاریخ ہے جو ردِ عمل

(reaction)، انکار(negation) ، اور جزوی سچائیوں (partial truths)پر قائم ہے اور مسلسل تضاد (contradiction) اور تغیر (fluidity)کا شکار رہی ہے۔

قدیم یونانی دور (Ancient Greek Period) میں، جب کائنات کے اسرار کو اسطوری تصورات (mythological explanations) سے بیان کیا جاتا تھا، فلسفۂ فطرت (natural philosophy) کا آغاز تھیلیز (Thales)کے اس دعویٰ سے ہوا کہ کائنات کی اصل (origin of cosmos)پانی ہے۔ ہیر قلیطس (Heraclitus) نے ہر شے کے مسلسل تغیر (perpetual change)میں ہونے کو حقیقت کا جوہر قرار دیا۔ سقراط (Socrates)نے انسانی معرفت (epistemology) اور اخلاقیات (ethics) کو گفتگو اور سوال و جواب (Socratic Method)کی بنیاد پر استوار کیا۔ افلاطون (Plato) نے ایک نظریاتی کائنات (Ideal World) کی تشکیل کی، جہاں خیالات یا Formsاصل حقیقت ہیں، جبکہ دنیا محض ان کا سایہ ہے۔ ارسطو (Aristotle) نے منطق(logic)، طبیعیات(physics) ،اور سیاسیات (politics) کے میدان میں اس قدر نظم و ضبط پیدا کیا کہ صدیوں تک مغربی فلسفہ اسی کی بنیاد پر استوار رہا۔ ان تمام کوششوں میں ایک فکری جستجو (intellectual inquiry) اور کائناتی معنویت کی تلاش (search for cosmic meaning) نمایاں تھی، مگر یہ سفر وحی کی روشنی سے محروم تھا۔

اس سے تقریباً ایک ہزار سال بعد، 610 عیسوی میں، اللہ کے آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مکہ (Makkah) کی سرزمین پر وحی (divine revelation) کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ جب مغرب فکری زوال (intellectual decline) اور مذہبی گمراہی (religious confusion) میں ڈوبا ہوا تھا، تو اسلام ایک جامع نظامِ ہدایت (comprehensive system of guidance) کی صورت میں سامنے آیا، جو وحی، عقل، فطرت (nature) ، اخلاق، اور سیاست کو ایک وحدت (holistic unity) میں سمیٹتا ہے۔ قرآن محض ایک مذہبی کتاب نہیں بلکہ ایک عقلی (rational) اور اخلاقی تحریک (ethical movement) بھی ہے، جو انسان کو اس کے نفس (self) ، کائنات (universe) ، اور خالق (Creator) سے مربوط کرتا ہے۔

اس کے بعد گیارہ امامانِ معصومؑ (Eleven Infallible Imams) نے اس ہدایت کو علم و عمل، زہد و عدل، اور عقل و فطرت کے جامع انداز میں جاری رکھا۔ امام علیؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک ایک مسلسل فکری، فقہی، فلسفی اور روحانی میراث (continuous intellectual, jurisprudential, philosophical and spiritual legacy) محفوظ رہی۔ خاص طور پر امام جعفر صادقؑ کے دور میں اسلامی علوم کو ایک باقاعدہ ادارتی بنیاد (institutional foundation) ملی، جہاں فلسفہ (philosophy) ، منطق (logic) ، کیمیا (alchemy) ، طب (medicine) ، فقہ

(jurisprudence)، اور علم الکلام (Islamic theology) کی عظیم تحریکیں اُبھریں۔

اس کے بعد امام مہدیؑ کی غیبتِ صغریٰ (Minor Occultation of Imam Mahdi) اور پھر غیبتِ کبریٰ (Major Occultation) کا دور شروع ہوتا ہے، جس میں امام کی ہدایت فقہاء (jurists)، محدثین (traditionists) ، اور مجتہدین (scholars of ijtihad) کے ذریعہ جاری رہتی ہے۔ اسی دوران مغرب اپنے قرون وسطیٰ (Medieval Ages) میں کلیسائی جبر (Church oppression) اور فکری جمود (intellectual stagnation) کا شکار رہتا ہے۔ 1100 سے 1500 کے درمیان Scholasticism ابھرتا ہے جو عیسائی عقائد کو افلاطونیت اور ارسطویت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس کی حدود کلیسا کی مرضی سے بندرہتی ہیں۔ تھامس ایکوئناس (Thomas Aquinas) جیسے مفکرین نے عقل وایمان (faith and reason) کو جوڑنے کی سعی کی، مگر وحی کی حقیقی روح (true essence of revelation) سے محروم رہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ میں Renaissance کی تحریک ابھرتی ہے، جو انسانی عقل، فن اور جمالیات کو کلیسائی تسلط سے آزاد کرنے کی جدوجہد تھی۔ رینی ڈیکارٹ (René Descartes) ، اسپینوزا (Spinoza) ، اور لائبنز (Leibniz) جیسے مفکرین عقل کو علم کا بنیادی ذریعہ (rationalism) قرار دیتے ہیں، جب کہ جان لاک (John Locke) ، ڈیوڈ ہیوم (David Hume) ، اور بارکلی (George

(Berkeley) تجربے پر زور دیتے ہیں(empiricism) ۔ مغرب میں فلسفہ اب مذہب کے خلاف ردِ عمل (intellectual reaction) بن چکا تھا، اور علم کی بنیاد صرف انسان کے حواس (senses) یا عقل (reason) میں دیکھی جا رہی تھی۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغرب Enlightenment کے دور میں داخل ہوتا ہے، جہاں لبرلزم(Liberalism) ، فائدہ پرستی (Utilitarianism)اور ڈئیزم (Deism) جیسے نظریات تشکیل پاتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جہاں مذہب کو نجی مسئلہ بنا دیا گیا اور خدا کو ایک غیر مداخلت کار خالق (non-interventionist creator) کے طور پر تسلیم کیا گیا، جبکہ فرد کو آزادی کا مرکز بنا دیا گیا۔ اس مرحلے پر مغرب فرد پرستی(individualism) اور مادی ترقی (material progress) کے خمار میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔

انیسویں صدی میں تصوریت(Idealism) ، مارکسزم(Marxism) ،وجودیت (Existentialism)، اور مثبتیت (Positivism) جیسے ازم سامنے آتے ہیں۔ کانٹ (Immanuel Kant) عقل اور تجربہ کو ملا کر Categorical Imperativeکا تصور دیتا ہے۔ ہیگل (Hegel) جدلیاتی عمل (dialectics)کو فلسفہ کا محور بناتا ہے۔مارکس (Karl Marx) تاریخ کو طبقاتی جدوجہد (class struggle) کا میدان سمجھتا ہے اور دین کو "افیون" قرار دیتا ہے۔ نطشے (Nietzsche) خدا کو "مردہ" کہتا ہے اور فردِ خودمختار

(übermensch) کے تصور کو فروغ دیتا ہے۔ یہ دور دراصل وحی سے مکمل انکار اور انسان کو مرکز قرار دینے کی انتہا تھا۔

بیسویں صدی میں یہ فکری انتشار مابعد جدیدیت (Postmodernism)، فیمینزم (Feminism)، ساختیات (Structuralism)، اور پوسٹ اسٹرکچرلزم (Post-structuralism) کے نظریات میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ ژاک ڈریدا (Jacques Derrida)، فوکو (Michel Foucault)، بودریار (Jean Baudrillard) اور لیوتارڈ (Jean-François Lyotard) جیسے مفکرین مغربی انسان کی فکری شکست (intellectual breakdown) کے آئینہ دار بن جاتے ہیں، جہاں کوئی مرکزی سچائی، اخلاقی اصول یا قطعی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

اکیسویں صدی میں فلسفہ Transhumanism، Digital Philosophy، AI Ethics، اور Cultural Marxism جیسے تصورات میں ظاہر ہوتا ہے۔ اب انسان خدا کے بغیر دائمی بقا، غیر محدود آزادی، اور ماورائی اختیار حاصل کرنے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں مغربی فلسفہ نہ صرف فطرت (nature) سے کٹ چکا ہے بلکہ اپنی ذات، معاشرہ، اور اخلاقی شناخت سے بھی بیگانہ ہو چکا ہے۔

اس کے مقابل، اسلامی ہدایت جو بعثتِ نبویؐ سے شروع ہوئی اور غیبتِ امامؑ کے دور میں علمائے ربانی (divinely-guided scholars) کے ذریعے جاری ہے، ایک مسلسل روشنی (light) ہے۔ یہ روشنی عقل و وحی (reason and revelation) کی ہم آہنگی، فطرت کی رہنمائی (guidance of nature)، اخلاقی اصولوں کی پائیداری (sustainability of moral

(values، اور روحانی بالیدگی (spiritual elevation) پر قائم ہے۔
مغربی فکری تاریخ تضاد(contradiction) ، انکار(rejection) ، اور تغیر (instability) کا منظر نامہ ہے، جبکہ اسلامی فکری تاریخ تسلسل (continuity)، حکمت(wisdom) ، اور فطرت سے ہم آہنگی (alignment with nature)کی علامت ہے۔
یہی وہ تقابل ہے جو ہمیں سمجھاتا ہے کہ فلسفہ اگر وحی سے منقطع ہو جائے تو وہ انسان کو سوالات کی دلدل (quagmire of doubt) میں دھکیل دیتا ہے، لیکن اگر وہ وحی اور فطرت کے نور (light of revelation and nature) سے جڑا ہو تو وہ انسان کو مقام عبدیت(status of servitude) ، خلیفگی (vicegerency)، اور عدل (justice) تک پہنچاتا ہے۔ مغربی فلسفوں کی یہ ٹائم لائن، اسلامی تاریخ کے ساتھ رکھ کر، دراصل حق و باطل کی فکری کشمکش (intellectual struggle between truth and falsehood) کی تصویر بن جاتی ہے۔
مغربی فلسفہ وحی(Revelation) ، روحانیت(Spirituality) ، اور ماورائی حقیقت (Metaphysical Reality)کو یا تو غیر ضروری سمجھتا ہے یا غیر عقلی (Irrational). یہ انسان کو خود مختار (Autonomous) اور خود تعریف کرنے والا (Self-Defining)فرد تصور کرتا ہے، جو اپنی مرضی سے سچ(Truth) ، اخلاق (Ethics)اور مقصد (Purpose) کو طے کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں شناختی بحران (Identity Crisis)، معاشرتی بگاڑ(Social Disintegration) ،خاندانی نظام کی

تباہی(Collapse of Family System) ، اور ماحولیاتی بحران (Environmental Crisis) جیسے عوارض سامنے آتے ہیں۔

یہ ازمز زیادہ تر ردِ عمل (Reactive Thought) میں پیدا ہونے والے خیالات تھے۔ مارکسزم، کلیسا اور جاگیرداری کے خلاف؛ فیمینزم، صنفی جبر (Gender Oppression) کے خلاف؛ لبرلزم، بادشاہت (Monarchy) اور کلیسا (Church) کے گٹھ جوڑ کے خلاف۔ مگر ردعمل کے جذبات نے ایک متوازن فکری نظام (Balanced Intellectual Framework) پیدا کرنے کے بجائے اکثر انتہاپسندی (Extremism) کو جنم دیا۔ یہ ازمز بظاہر آزادی (Freedom) اور ترقی (Progress) کے داعی ہیں، مگر ان کی تہہ میں الٰہی حدود (Divine Limits) کا انکار اور فطری قانون (Natural Law) کی تحقیر چھپی ہوئی ہے۔

مغرب کا انسان خود مختار (Autonomous) اور خود معین (Self-Determined) ہے، جبکہ اسلام کا انسان عبد (Servant of God) ہے، خلیفۃ اللہ (Vicegerent of God) ہے اور فطرت (Fitrah) پر پیدا کیا گیا ہے۔ مغربی علم، تجربے (Empiricism) اور سائنسی طریقہ (Scientific Method) پر موقوف ہے، جبکہ اسلام میں علم کا ماخذ عقل (Reason) ، فطرت (Nature) اور وحی (Revelation) ہیں۔ مغربی اخلاقیات افادیت (Utility) ، آزادی (Freedom) اور نسبیت (Relativism) پر مبنی ہیں، جبکہ اسلام کی اخلاقیات توحید (Monotheism)، عدل (Justice) ، امانت (Trustworthiness) ، عفت (Chastity) اور ذمہ داری (Responsibility) کے اصولوں پر استوار ہیں۔

مغرب کی تہذیب سیکولر(Secular) ، صارفیت زدہ (Consumerist) اور دنیا پرست (Materialistic) ہے، جبکہ اسلامی تہذیب عبادت(Worship) ، تزکیہ (Purification of Soul)اور خدمتِ خلق (Service to Creation) پر مبنی ہے۔

سیاسی سطح پر مغربی ازمز یا تو طاقت کی مرکزیت (Power Centralization, e.g., Foucault) پر زور دیتے ہیں یا طبقاتی جدوجہد (Class Struggle, e.g., Marx) کو اصل مانتے ہیں، جبکہ اسلام میں سیاست عدل(Justice) ،شوریٰ(Consultative Governance)،اورولایت (Guardianship) پر استوار ہے۔ مغرب میں جنس و نسل کی بحث فیمینزم اور کیئر تھیوری (Queer Theory) جیسے تصورات سے مربوط ہے، جبکہ اسلام میں جنس (Gender) ایک فطری حقیقت ہے جسے پاکیزہ اور متوازن طریقے سے برتا گیا ہے۔

ان ازمز کو صرف علمی تجسس(Academic Curiosity) کی چیز سمجھنا خطرناک ہے۔ درحقیقت یہ ازمز مغربی تہذیب کے فکری ہتھیار (Intellectual Tools of Domination)ہیں، جن سے وہ دنیا پر فکری تسلط (Ideological Control) قائم کرتی ہے۔ اسلامی دنیا کو ان کے سحر سے آزاد ہونے کے لیے ایک متبادل فکر (Alternative Thought)، متبادل اخلاق(Alternative Ethics) ، اور متبادل اصطلاحات (Alternative Terminologies) کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان مفکرین(Muslim Thinkers) ، اساتذہ(Educators) ، اور طلبہ (Students) ان ازمز کو محض نقل (Blind Imitation) کرنے کے

بجائے تنقید کی آنکھ (Critical Insight) سے دیکھیں، انہیں وحی اور عقل کی روشنی میں پرکھیں، اور اپنے لیے ایک ایسا نظامِ فکر (Intellectual Framework) تشکیل دیں جو اسلام کے اصل پیغام، یعنی فطرت، عدل، توحید اور خلافت کے اصولوں پر قائم ہو۔ یہی وہ علمی و فکری جہاد (Intellectual Jihad) ہے جو عصر حاضر میں اُمت مسلمہ کے لیے سب سے اہم میدانِ کارزار بن چکا ہے۔

مغربی فلسفوں کی ٹائم لائن پر اگر تنقیدی اور تہذیبی نگاہ ڈالی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر دور کا مخصوص فلسفہ یا ازم محض ذہنی مشق یا خالص علمی تجسس کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس کے پیچھے ایک تاریخی سیاق، معاشرتی بحران، سیاسی ہلچل یا وجودی اضطراب موجود تھا۔ ان فلسفوں نے ردِ عمل، نفی، یا محرومی سے جنم لیا، اور ان میں اکثر کی بنیاد ایسے نفسیاتی محرکات پر رکھی گئی جو یا تو خوف، الجھن، خواہشِ نجات یا طاقت کے حصول سے جُڑے ہوئے تھے۔ اب ہم مغربی فلسفوں کی تاریخی ترتیب کو سامنے رکھ کر ان کے ظہور کے اسباب اور نفسیاتی محرکات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

قدیم یونانی فلسفہ جس دور میں ابھرا، وہ زمانہ ایک مشرکانہ، دیومالائی اور فطرت پرستی پر مبنی معاشرتی ڈھانچے سے عبارت تھا۔ انسان مظاہرِ فطرت سے خائف تھا، اور ہر شے کو کسی دیوی یا دیوتا سے منسوب کرتا تھا۔ تھیلیز، ہیرقلیطس اور بعد میں سقراط، افلاطون اور ارسطو نے اس خوف زدہ اور مذہبیاتی فہم کو عقل و منطق کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں محرکات میں بنیادی عنصر "کائنات کی حقیقت" جاننے کی انسانی خواہش اور غیر سائنسی توہمات سے آزادی تھی۔ یہ وہ ابتدائی نفسیاتی اضطراب تھا جو شعور، تجزیہ، اور فکر کا محرک بنا۔ سقراط کا فلسفہ اس بات کی علامت تھا کہ انسان اپنے نفس اور اخلاقیات کو سمجھنے

کی جدوجہد کر رہا ہے، کیونکہ یونانی معاشرہ سیاسی زوال، طبقاتی فرق اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو چکا تھا۔

قرون وسطیٰ کا فلسفہ مسیحی تھیولوجی کے زیر اثر تھا۔ یہ وہ دور تھا جب کلیسا کا مکمل اقتدار قائم تھا اور انسانی عقل پر وحی کا غلبہ تھا۔ اس زمانے میں فلسفہ دراصل ایمان و عقل کے درمیان مفاہمت کی ایک کوشش تھی۔ آگوستین اور ایکوئناس جیسے مفکرین نے افلاطونی و ارسطوی فکر کو عیسائیت کے اندر جذب کرنے کی سعی کی۔ اس دور کا محرکاتی پہلو یہ تھا کہ انسان خدا کے نزدیک ہونا چاہتا تھا مگر عقل کے دروازے بند دیکھ کر الجھن کا شکار تھا۔ ایک طرف ایمان کی طاقت تھی تو دوسری طرف فطری تجسس اور منطق کی کشش، چنانچہ یہ فلسفہ دراصل ایمان اور عقل کے مابین توازن قائم کرنے کی نفسیاتی جدوجہد کا نتیجہ تھا۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں انسان نے کلیسا کی اجارہ داری اور مذہبی جبر سے آزادی کا خواب دیکھا۔ اس وقت یورپ میں شدید علمی پسماندگی، سائنسی دریافتوں کی مخالفت، اور انسانی آزادی پر بندشیں تھیں۔ چنانچہ انسان نے فرد کو مرکزِ کائنات قرار دینے کی کوشش کی، جو کہ ایک نفسیاتی بغاوت کا مظہر تھا۔ یہ دور بنیادی طور پر خودی کی دریافت، خوداعتمادی، اور انفرادی شناخت کی تلاش کا دور تھا۔ عقلیت پسندی، انسان پرستی، اور تجربیت سب اس باطنی محرک کی نشانیاں تھیں کہ انسان اپنی محرومی، جہالت، اور بے اختیاری سے نکل کر "جاننے والا"، "فیصلہ کرنے والا" اور "آزاد" بننا چاہتا ہے۔

روشنی کا دور، یعنیEnlightenment ، درحقیقت نشاۃ ثانیہ کے شعوری ارتقاء کا تسلسل تھا، لیکن زیادہ جارحیت کے ساتھ۔ اس زمانے میں یورپ میں سائنسی انقلاب آ چکا تھا، مذہبی عقائد کو پرکھنے کی فضا عام ہو چکی تھی، اور ریاستی مطلق العنانی کے خلاف نظریاتی

مزاحمت پیدا ہو چکی تھی۔ اس دور کے ازم جیسے لبرلزم، یوٹیلیٹیرین ازم اور ڈیئزم دراصل فرد کی خواہشِ آزادی، تحفظ ذات، اور خدا سے فاصلہ پیدا کرنے کی کوشش کے نفسیاتی مظاہر تھے۔ انسان خدا سے خائف نہیں بلکہ بیزار ہو چکا تھا، کیونکہ اس نے دین کو جبر، گھٹن اور استحصال کے نظام کے طور پر دیکھا تھا۔ اسی لیے ڈیئزم میں خدا کو مانا تو گیا مگر اسے الگ کر دیا گیا، اور لبرلزم میں خود فرد کو ہی قانون بنا دیا گیا۔ یہاں بنیادی محرک شناخت کی آزادی اور سماجی جکڑبندیوں سے نجات تھا۔

انیسویں صدی میں مارکسزم، وجودیت، اور آئیڈیالزم جیسے نظریات سامنے آئے، جن کے پیچھے خالص ردعمل کی طاقت تھی۔ مارکسزم ایک شدید طبقاتی استحصال، صنعتی انقلاب کے نتیجے میں انسان کی مشینی زندگی، اور سرمایہ دارانہ ظلم کے خلاف صدائے احتجاج تھی۔ اس نظریے کے پیچھے وہ نفسیاتی کرب تھا جس میں انسان نے خود کو ایک بے جان پرزہ محسوس کیا۔ وجودیت کے اندر وہ وجودی خوف (existential anxiety) کارفرما تھا جو موت، بے معنویت، اور تنہائی کے احساس سے جنم لیتا ہے۔ کیرکیگارڈ، نطشے، اور سارتر جیسے مفکرین اس انسانی بے بسی کے علامتی ترجمان بن گئے۔ یہاں فلسفہ ایک تھراپی کی صورت اختیار کر چکا تھا، تاکہ انسان اپنی داخلی تنہائی اور المیے سے کچھ مفہوم کشید کر سکے۔

بیسویں صدی میں، خاص طور پر دونوں عالمی جنگوں کے بعد، مغرب کا انسان مکمل طور پر شکست خوردہ، بے یقین، اور اخلاقی طور پر خالی ہو چکا تھا۔ اسی پس منظر میں مابعد جدیدیت، فیمینزم، اور کلچرل تھیوریز نے جنم لیا۔ پوسٹ ماڈرن ازم حقیقت کے انکار، معانی کی تحلیل، اور مرکزی اقدار کی نفی کا اعلان تھا، جو دراصل ایک شدید نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ (psychic disintegration) کا اظہار تھا۔ انسان اب نہ تو کسی ایک سچائی پر یقین رکھتا

تھا، نہ کسی مرکز پر اعتماد کرتا تھا، اور نہ کسی مقصد پر راضی تھا۔ فیمینزم اور LGBTQ جیسے نظریات کے پیچھے بھی وہی گہری نفسیاتی محرومیاں، جبر، اور شناخت کا بحران کارفرما تھا جنہیں تاریخ میں صدیوں تک دبایا گیا۔ ان افکار میں فطرت کے ساتھ ٹکراؤ بھی شامل ہے کیونکہ یہ اپنی ہی فطری ساخت کو جبر سمجھنے لگے۔

اکیسویں صدی کے ازمز جیسے ٹرانس ہیومینزم، ڈیجیٹل فلسفہ اور AI Ethics ایک نئے قسم کی نفسیاتی بے چینی کی نمائندگی کرتے ہیں: یعنی فنا کا خوف، محدودیت کا انکار، اور خدا کے بغیر ابدیت کی تمنا۔ یہ ازمز دراصل "موت سے انکار" کی فلسفیانہ صورتیں ہیں، جو اب انسان کو ٹیکنالوجی کے ذریعے خدا بننے کا خواب دکھا رہی ہیں۔ یہ ایک شدید نفسیاتی واہمہ ہے، جسے روحانی زوال اور وحی سے انقطاع نے جنم دیا ہے۔

اس پوری تاریخ میں واضح ہوتا ہے کہ مغربی فلسفے نہ صرف خارجی حالات کا ردعمل ہیں بلکہ ہر نظریہ ایک مخصوص داخلی نفسیاتی کیفیت کا ترجمان بھی ہے۔ کبھی خوف، کبھی بغاوت، کبھی خواہشِ نجات، کبھی شناخت کا بحران، اور کبھی خواہشِ خدائی، ہر ازم کے پیچھے کوئی نہ کوئی داخلی تشویش یا محرک موجود ہے۔ اس کے برعکس اسلامی فکر چونکہ وحی، عقل، فطرت اور فطری ہدایت کے ہم آہنگ نظام پر قائم ہے، اس لیے اس میں نہ تو داخلی اضطراب پایا جاتا ہے، نہ تضاد، نہ انتہاپسندی۔ یہ انسان کو اُس کے فطری دائرے میں، اس کی اصل منزل یعنی قربِ الٰہی کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور اسی لیے اسے کسی نفسیاتی پیچیدگی کے ذریعے خود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اسلام نہ تو ردعمل ہے، نہ احتجاج، بلکہ الٰہی نظمِ فطرت کا شعوری تسلسل ہے۔

مغرب کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) اور اس کے بعد آنے والے دورِ عقلیت (Age of Reason / Rationalism) کو عموماً یورپ کی داخلی بیداری، کلیسا کے خلاف بغاوت، قدیم یونانی و رومی علوم کی بازیافت، اور سائنسی ترقی کے تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر اس دور کے فکری پس منظر کو گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اسلامی دنیا، بالخصوص بنو امیہ و بنو عباس کے ادوار میں اور خاص طور پر ائمہ معصومینؑ کی تعلیمات کے زیرِ اثر جو علمی و فکری تحریکات اٹھیں، وہ یورپ کے فکری احیاء کا ایک بنیادی ماخذ تھیں۔

یورپ صدیوں تک فکری جمود کا شکار رہا اور کلیسا نے وحی کی تعبیر کو اس حد تک محدود کر دیا کہ عقل، تجربہ اور مشاہدہ کو گناہ سمجھا جانے لگا۔ اسی وقت مشرق میں اسلامی دنیا علم، فلسفہ، منطق، طب، ریاضی، ہیئت، فلکیات، کیمیا، کلام اور تصوف کے بے مثال عروج پر تھی۔ عباسی خلافت کے زیرِ سایہ بغداد، کوفہ، بصرہ، نیشاپور، قاہرہ اور قرطبہ جیسے مراکزِ علم قائم ہوئے، جہاں نہ صرف یونانی فلسفے کا ترجمہ و تنقید ہوئی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک نیا اسلامی علمی منہج تشکیل پایا۔

ان تمام تحریکات کی تہہ میں جو اصل روح کارفرما تھی، وہ ائمہ معصومینؑ کی وہ تعلیمات تھیں جو عقل، فطرت، وحی اور تجربہ کی ہم آہنگی پر مبنی تھیں۔ امام علیؑ سے لے کر امام حسن عسکریؑ تک ہر امامؑ نے اپنے وقت کی فکری ضروریات کو نہ صرف سمجھا بلکہ امت کو عقل، حکمت، عدل اور علم کے ذریعے مہذب اور باوقار بنایا۔ امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کے ادوار بالخصوص اسلامی علمی تاریخ میں ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امام صادقؑ کا حلقہ درس، جس میں ہشام بن حکم جیسے فلسفی، جابر بن حیان جیسے کیمیادان، اور امام ابو حنیفہ

جیسے فقیہ بھی شاگرد تھے، ایک ایسی جامع علمی تحریک کی بنیاد بن گیا جس نے عقل و نقل، فطرت و شریعت، اور تجربہ و وحی کو ہم آہنگ کیا۔ امام صادقؑ نے عقلی استدلال کو صرف یونانی منہج پر نہیں چھوڑا بلکہ اسے وحی کی روشنی میں پاکیزہ، متوازن اور الٰہی حدود کے اندر رہ کر ارتقاء دیا۔

یہ وہ علمی منہج تھا جو بعد میں اسلامی دنیا کے توسط سے یورپ پہنچا۔ اسپین (اندلس) کے مسلم علاقوں میں مسلم فلسفیوں، مفسرین، اور سائنس دانوں کے کام لاطینی میں ترجمہ ہوئے۔ ابن رشد، ابن سینا، فارابی، اور نصیر الدین طوسی جیسے مفکرین جو براہ راست یا بالواسطہ اہل بیتؑ کے علم سے مستفید تھے، ان کے نظریات نے مغربی مفکرین جیسے تھامس ایکوئناس، البرٹ دی گریٹ، اور راجر بیکن کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ یوں ائمہ معصومینؑ کے علمی منہج، جنہوں نے علم کو بند دروازے نہیں بلکہ ایک زندہ، متحرک، اور ربانی حقیقت سمجھا، اس بات میں اہم کردار ادا کیا کہ مغرب فکری جمود سے باہر نکلے۔

اگرچہ نشاۃ ثانیہ کے محرکات میں یورپی ذہن نے مسلم دنیا کی علمی میراث کو "پراپر کریڈٹ" نہیں دیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فکری اور سائنسی بنیادیں جو یورپ نے سولہویں صدی میں تلاش کیں، ان کی خشتِ اول امام صادقؑ کے حلقہ درس میں رکھی جا چکی تھی۔ امام علیؑ کی نہج البلاغہ میں بیان کردہ حکمتیں، امام باقرؑ کے علمی تجزیے، امام رضاؑ کی مامون کے دربار میں دی گئی عقلی و کلامی گفتگوئیں، یہ سب تاریخِ انسانیت کی وہ دریاں ہیں جن سے مغرب نے اپنے فکری قحط میں سیرابی حاصل کی۔

لہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ و عقلیت کا ظاہری مرکز اگرچہ یورپ تھا، لیکن اس کا باطنی سرچشمہ اسلامی مشرق تھا، اور اس مشرق میں وہ نور جو فکر، فطرت، وحی اور

عقل کو ایک وحدت میں جوڑتا ہے، وہ ائمہ معصومینؑ کی تعلیمات میں جلوہ گر تھا۔ مغرب نے اس سرچشمہ ہدایت کو مکمل طور پر تو تسلیم نہ کیا، مگر اس کے اثرات کی گونج ان کے علمی انقلابات میں واضح طور پر سنائی دیتی ہے۔ ان ائمہ نے انسان کو "عبدِ خدا" کی حیثیت سے دیکھ کر جو علم سکھایا، وہ مغرب کے خود مختار انسان کے تصور سے بالکل مختلف مگر در حقیقت زیادہ مکمل، متوازن اور الٰہی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آج مغرب کی عقل مادے میں الجھ کر تھک چکی ہے، تو دوبارہ روح، اخلاق، اور فطرت کی طرف رجوع کر رہی ہے، اور وہی بنیادیں تلاش کر رہی ہے جن کی تعلیم ائمہ معصومینؑ نے چودہ صدیاں قبل دے دی تھیں۔

مغربی ازمز کا اگر ہم فطرت کے تناظر میں تجزیہ کریں تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان فکری نظریات کی بنیاد انسان کو فطرت سے کاٹ کر اس کی خود ساختہ آزادی، خود مرکزیت اور خود مختاری پر قائم کی گئی ہے، جبکہ اسلامی فکر کا مرکز و محور یہ ہے کہ ہر شے ایک فطری نظام کے تحت وجود میں آئی ہے اور اسی فطرت کا شعور، حفاظت اور ارتقاء، انسانی ذمہ داری بھی ہے اور اس کا راستہ بھی۔ قرآن مجید بارہا اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ، ہر نظام، ہر شے اپنے رب کی طرف سے ایک تکوینی حکم کے تحت منظم ہے، اور انسان بھی اس کا ایک جزو ہے، نہ کہ اس نظام کا خود مختار خالق یا منکر۔ سورہ روم کی آیت 30 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے " :فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ "یعنی "اپنے رخ کو دینِ حنیف کی طرف سیدھا رکھو، یہ اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے"۔ یہاں فطرت کو ایک اصولی قانون کی حیثیت دی گئی ہے جو نہ صرف انسان کے اندر موجود ہے بلکہ ہر مخلوق کے وجود میں جاری و ساری ہے۔

اب اگر ہم مغربی ازمز کو اس فطری تناظر میں دیکھیں تو سب سے پہلے ان کی وہ بنیادی ساخت سامنے آتی ہے جو فطرت کے انکاری ہے۔ مارکسزم مثلاً انسانی تاریخ کو محض معاشی جدوجہد قرار دیتا ہے اور فطرت کو محض مادّی وسائل کا ذخیرہ تصور کرتا ہے، نہ کہ ایک زندہ، بامقصد، اور خدا کی طرف اشارہ کرتی کائناتی حقیقت۔ فیمینزم صنف (Gender) کی فطری تقسیم اور تکمیلی نسبت کو جبر سمجھ کر رد کر دیتا ہے اور مرد و عورت کے فطری فرق کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ قرآن میں مرد و عورت کی تخلیق کو ایک دوسرے کی سکون و لباس کے طور پر پیش کیا گیا ہے، نہ کہ طبقاتی مخالفین کے طور پر۔ اسی طرح وجودیت (Existentialism) اس تصور پر قائم ہے کہ انسان پہلے وجود میں آتا ہے اور بعد میں اپنے معنی خود بناتا ہے، جبکہ فطرت کا اصول یہ ہے کہ وجود کے ساتھ ہی مقصد بھی متعین ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" : وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ "یعنی "ہم نے جن و انس کو پیدا ہی عبادت کے لیے کیا ہے"۔ یہاں عبادت صرف عبادت گاہوں کی رسم نہیں بلکہ فطرت کی اُس ترتیب کو قبول کرنا ہے جو رب نے ہر شے کے لیے مقرر کی ہے۔

لبرلزم، جو فرد کی آزادی کو حتمی معیار مانتا ہے، فطرت کے اس قانون کو نظرانداز کرتا ہے کہ ہر آزادی ایک حد کے ساتھ مشروط ہے، اور کائنات کا کوئی نظام بھی غیر مشروط آزادی پر قائم نہیں۔ سورج، چاند، ہوا، پانی، حتیٰ کہ درخت بھی ایک معیّنہ انداز میں اپنی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان کو بھی اللہ نے عقل دی مگر اس کے ساتھ وحی کا ترازو عطا کیا تاکہ وہ اپنی راہ کو فطرت کے مطابق پرکھ سکے۔ لبرل فکر میں نہ تو کسی آسمانی ہدایت کا اعتبار

ہے اور نہ ہی کسی الہیاتی مقصد کا، اس لیے یہ فلسفہ انسان کو اس کی فطری جڑ سے کاٹ کر ایک کٹی پتنگ کی مانند بنا دیتا ہے جو کبھی نفسانی خواہشات، کبھی سرمایہ پرستی، اور کبھی سیاسی جبر کا شکار ہو جاتا ہے۔

پوسٹ ماڈرن ازم فطرت کے اس بنیادی اصول کو ہی رد کرتا ہے کہ حق و باطل کوئی مستقل چیزیں ہیں۔ یہ کہتا ہے کہ ہر معنی نسبی ہے، ہر حقیقت محض تاثر ہے، اور کوئی بھی مرکزی سچائی نہیں۔ لیکن قرآن و اہل بیتؑ کی تعلیمات اس تصور کی سخت مخالفت کرتی ہیں۔ قرآن بارہا کہتا ہے کہ "جاء الحق و زھق الباطل "یعنی حق آیا اور باطل مٹ گیا، کیونکہ باطل مٹنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ امام علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں کہ "حق وہی ہے جو فطرت کے مطابق ہو اور جو چیز باطل ہو وہ خواہشات کا تابع ہو جاتی ہے"۔ یہ تعلیمات فطرت کو ایک روشن چراغ کی حیثیت دیتی ہیں جو انسان کو اندھیرے میں منزل دکھاتا ہے۔

فطرت کا قانون توازن، حدود، اور حکمت پر قائم ہے۔ مغربی ازم میں یہ تینوں اجزاء مفقود ہیں۔ مغربی فرد لامحدود آزادی کا متمنی ہے، بغیر اس کے کہ وہ اپنی نفس، جسم، یا معاشرت پر اس کے نتائج کا سامنا کرے۔ قرآن کہتا ہے" :وَكُلُّ شَيْءٍ عِندَهُ بِمِقْدَارٍ "یعنی"ہر چیز اس کے پاس ایک ناپ کے مطابق ہے"۔ یہی توازن اور مقدار فطرت کی روح ہے۔ اہل بیتؑ کی سیرت میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تمام چیزوں میں اس توازن کو قائم رکھتے ہیں، چاہے وہ عبادت ہو یا معیشت، سیاست ہو یا عدل، جنگ ہو یا صلح۔ ان کا عمل قرآن کی تفسیر عملی ہے اور قرآن خود فطرتِ الٰہی کا زبانی اظہار۔

مغربی ازمز نہ صرف اس فطری ہم آہنگی کو بگاڑتے ہیں بلکہ انسان کو اپنے رب سے، اپنی ذات سے، اپنے ماحول سے، اور اپنی آخرت سے کاٹ کر ایک "نفع کمانے والی مشین" میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی تعلیمات انسان کو ایک ایسے خلیفہ کی حیثیت سے دیکھتی ہیں جو کائنات میں فطرت کے مطابق عدل، رحم، اور علم کا نمائندہ ہو۔

لہٰذا یہ ازمز فطرت کی نفی ہیں، اور جو بھی چیز فطرت کے خلاف ہو، وہ تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کے برعکس، جو چیز فطرت کے مطابق ہو، وہ بقاء، سکون اور کمال کی طرف لے جاتی ہے۔ اسلامی فکر، قرآن، اور اہل بیتؑ کی تعلیمات فطرت کے ان قوانین کو اجاگر کرتی ہیں تاکہ انسان زمین پر اپنی اصل جگہ پہچانے، اپنی ذمہ داری سمجھے، اور اس توازن کو بحال کرے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔ یہی وہ راہ ہے جو انسان کو گمراہی کے ازمز سے نکال کر فطرت کے اصل نور کی طرف لے جاتی ہے۔

مغربی فلسفے، نظریات اور ازمز کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ان میں گہرے اندرونی تضادات (inherent contradictions) موجود ہیں، اور یہ تضادات محض زمانی، مکانی یا شخصی حالات کی بنا پر ظاہری اختلاف نہیں رکھتے بلکہ ان کی فکری بنیادوں اور جوہری ساخت ہی میں تصادم اور انکار موجود ہے۔ ان تضادات کا آغاز خود اس فلسفیانہ جستجو سے ہوتا ہے جس نے خدا، وحی، اور ماورائے عقل حقیقت کو علم کے دائرے سے خارج کر دیا، اور انسان کو ہر چیز کا معیار، مرکز اور خود مختار فیصلہ ساز قرار دے دیا۔ جب انسان کو اپنے وجود، معنی، اخلاق اور غایت کا خود منبع مان لیا جائے، تو تضاد ناگزیر ہو جاتا ہے، کیونکہ انسان فطرتاً محدود، متغیر اور ناقص ہے، لہٰذا اس کا سوچا ہوا کوئی بھی 'ازم' مستقل، ہم آہنگ اور مکمل نظامِ فکر نہیں بن سکتا۔

مثلاً عقل پرستی (Rationalism) اور تجربیت (Empiricism) آپس میں مکمل طور پر متضاد زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ پہلا کہتا ہے کہ علم صرف عقل سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ صرف حواس اور تجربہ ہی علم کا ذریعہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی اساس کو رد کرتے ہیں اور مغرب میں ان دونوں کے مابین دو صدیوں تک علمی کشمکش رہی، حتیٰ کہ کانٹ کو آکر کہنا پڑا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔ لیکن کانٹ کی تجویز بھی مسئلے کو جڑ سے حل نہ کر سکی کیونکہ وہ وحی کو علم کے دائرے میں لانے سے گریز کرتا رہا۔ اس کے برعکس اسلامی تعلیمات عقل، تجربہ اور وحی کو ایک ہی کلی نظام میں ہم آہنگی کے ساتھ جگہ دیتی ہیں۔ عقل وحی کی روشنی میں درست سوچتی ہے، تجربہ حقیقت کی تصدیق کرتا ہے، اور وحی حق کو کسوٹی مہیا کرتی ہے۔

اسی طرح مارکسزم اور لبرلزم، جو بظاہر انسان کی نجات کا دعویٰ کرتے ہیں، ایک دوسرے کے متضاد نظام ہیں۔ مارکسزم معاشی مساوات اور طبقاتی جنگ کے ذریعے ایک اشتراکی ریاست کا خواب دکھاتا ہے، جہاں فرد کے مفاد کو کچل کر اجتماعی نظم قائم ہو، جبکہ لبرلزم انفرادی آزادی، نجی ملکیت، اور محدود ریاست کو اعلیٰ اقدار مانتا ہے۔ مارکسزم سرمایہ داری کی مخالفت کرتا ہے اور لبرلزم اسی سرمایہ داری کا محافظ ہے۔ لیکن مغرب میں ایک عجیب تضاد یہ بھی ہے کہ فکری سطح پر لوگ مارکسزم سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن عملی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کو ہی اختیار کرتے ہیں۔ اس تضاد کی جڑ یہ ہے کہ ان دونوں نظریات کا کوئی الٰہی یا فطری جواز موجود نہیں، بلکہ محض ردِ عمل اور جذباتی احتجاج کی پیداوار ہیں۔

فیمینزم اور وجودیت میں بھی گہرا تضاد ہے۔ فیمینزم صنفی شناخت کو ایک سیاسی و معاشرتی تعمیر (social construct) کہتا ہے اور اس کے خاتمے کا مطالبہ کرتا ہے، جب کہ

وجودیت کہتی ہے کہ انسان اپنی ذات کو خود تخلیق کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر عورت اپنی نسوانیت کو قبول کرتی ہے تو وجودیت کے مطابق وہ آزاد ہے، مگر فیمینزم اسے جبر کہتا ہے۔ دونوں افکار ایک دوسرے کے معنی کو الجھا دیتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مغرب میں آج صنفی، نفسیاتی، اور خاندانی سطح پر شدید الجھن پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام مرد و عورت کو فطری فرق کے ساتھ، ہم آہنگ، تکمیلی اور باعزت رشتے میں جوڑتا ہے، جس میں نہ تو جبر ہے، نہ استحصال اور نہ ہی مسخ شدہ شناخت۔

پوسٹ ماڈرنزم اور ڈیئزم، بظاہر مخالف مگر باطن میں ہم نفس ہیں۔ ڈیئزم خدا کو مانتا ہے مگر اس کے کسی عملی کردار کا منکر ہے، جبکہ پوسٹ ماڈرنزم کسی بھی مطلق حقیقت کے وجود کا ہی منکر ہے۔ دونوں کا مشترکہ تضاد یہ ہے کہ وہ سچائی کے وجود کے قائل نہیں، مگر خود اپنے نظریے کو سچ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پوسٹ ماڈرنزم کہتا ہے کہ کوئی بھی بیانیہ قطعی نہیں، ہر حقیقت صرف ساختہ جاتی ہے، لیکن وہ یہ بات قطعی انداز میں کرتا ہے، گویا وہ خود اپنے نظریے کا انکار کر رہا ہو۔ یہی داخلی خودکشی (intellectual suicide) مغربی ازمز کا المیہ ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بظاہر جو تضادات نظر آتے ہیں، جیسے بعض مواقع پر نرمی اور بعض پر سختی، یا بعض جگہ فرد کی آزادی اور بعض جگہ جماعت کی ترجیح، وہ درحقیقت تضاد نہیں بلکہ حکمتِ موقعیت (contextual wisdom) ہیں۔ قرآن خود اس بات کو بیان کرتا ہے کہ اللہ کے احکام میں ناسخ و منسوخ کا نظام کیوں موجود ہے؛ کیونکہ حالات، افراد اور زمانے کے تقاضے بدلتے ہیں مگر اصولِ فطرت تبدیل نہیں ہوتے۔ امام علیؑ فرماتے ہیں کہ "قرآن ایسا بولنے والا ہے جو خاموش نہیں ہوتا، وہ ہر زمانے کے سوالات کا جواب رکھتا ہے"۔ یہی

اصول اجتہاد اور فقہ کی اساس ہے، جو ہر نئے مسئلے کو قرآن و سنت کے ثابت اصولوں کی روشنی میں پرکھتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں وحدت، توازن، اور حکمت موجود ہے، اور اسی لیے ان میں ظاہری اختلاف کے باوجود اندرونی ہم آہنگی باقی رہتی ہے۔

جبکہ مغربی افکار، ردِ عمل، انکار، یا جزوی سچائیوں پر قائم ہوتے ہیں، ان کے اندر کسی اعلیٰ اصول، واحد ہدایت یا فطری مرکز کی عدم موجودگی انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا دیتا ہے۔ ان کے تضادات علمی، اخلاقی اور تہذیبی سطح پر نہ صرف ظاہر ہوتے ہیں بلکہ مغربی معاشرت میں بحران کی صورت میں محسوس بھی ہوتے ہیں۔ یہی وہ فرق ہے جو وحی پر مبنی جامع فکری نظام اور انسان پر مبنی غیر مربوط نظام کے درمیان ہمیشہ رہے گا۔ اسلام کا پیغام زمان و مکان کے فطری اور الٰہی ضابطوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے، اس لیے وہ ہمیشہ انسانی فطرت سے قریب تر رہتا ہے، جبکہ مغربی ازمز، چونکہ فطرت کے انکاری ہیں، اس لیے آخرکار خود سے ٹکرا جاتے ہیں۔

مشکلات سے فرار مزید مشکلات کا سبب

انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ تکلیف، درد، خوف، غم اور ناکامی جیسے منفی تجربات سے فرار اختیار کرے۔ انسان خواہ جسمانی درد ہو یا جذباتی و نفسیاتی زخم، اس سے بچنا چاہتا ہے، اسے دبا دینا چاہتا ہے، نظر انداز کرنا چاہتا ہے یا وقتی مصروفیات کے پردے میں چھپا دینا چاہتا ہے۔ لیکن یہ فطری سادکھتا عمل در حقیقت نفسیاتی صحت کے لیے ایک گہرا زہر بن سکتا ہے۔

جب انسان تکلیف سے بھاگتا ہے، تو وہ دراصل اپنی اصل حقیقت سے، اپنے باطن سے، اور اپنے شعور کی گہرائیوں میں پلتے مسائل سے آنکھیں چرا رہا ہوتا ہے۔ یہ فرار وقتی طور پر اسے سکون دے سکتا ہے، مگر اندرونی خلفشار، اضطراب اور الجھنوں کی جڑیں مزید گہری ہو جاتی ہیں۔ ایسا انسان جو اپنے دکھوں کا سامنا نہیں کرتا، وہ انہیں کبھی سمجھ نہیں پاتا، اور نہ ہی ان سے سیکھ پاتا ہے۔ نتیجتاً، وہی درد مختلف شکلوں میں بار بار اس کے سامنے آتا ہے، کبھی تعلقات میں، کبھی بیماری کی صورت میں، کبھی ذہنی دباؤ یا بے مقصد زندگی کی شکل میں۔

یہاں یہ بات انتہائی اہم ہے کہ درد اور تکلیف سے بچنے کی کوشش بذات خود ایک نفسیاتی مزاحمت پیدا کرتی ہے، جسے نفسیات کی زبان میں "avoidance behavior" کہا جاتا ہے۔ یہ رویہ انسان کو موجودہ لمحے کی حقیقت کو تسلیم کرنے سے روکتا ہے اور اسے ایسے خیالی دائروں میں الجھاتا ہے جہاں ماضی کی تلخیاں یا مستقبل کا خوف چھایا رہتا ہے۔ انسان جب دکھ اور درد سے فرار اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے شعور میں اس زخم کو دبانے لگتا ہے، لیکن

وہ زخم لاشعور میں ایک متحرک اور غیر محسوس دباؤ بن کر موجود رہتا ہے، جو وقتاً فوقتاً غیر متوقع رد عمل، غصہ، بے چینی یا اداسی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جب انسان ہمت کرتا ہے کہ وہ اپنی تکلیف کی طرف دیکھے، اسے سمجھے، اس کا سامنا کرے، اور اسے پوری طرح محسوس کرے، تو وہ خود کو اس زخم کے روبرو لے آتا ہے۔ یہ لمحہ ابتداء میں بہت اذیت ناک ہوتا ہے کیونکہ انسان کو اپنے سب سے نازک حصے، سب سے گہرے خوف، اور سب سے زیادہ دبائے گئے احساسات سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن یہی لمحہ شفاء کی پہلی سیڑھی ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر وہ چیز جو شعور کی سطح پر آجائے، وہ قابو میں آ سکتی ہے۔ احساسات کو مکمل طور پر جینے سے، ان کے اندر پوری طرح اترنے سے، انسان اپنے باطن میں موجود اندھیرے سے روشنی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جسے ماہرین نفسیات "emotional processing" کہتے ہیں، اور یہی روحانی مکاتب فکر اسے "تزکیہ نفس" کا ابتدائی مرحلہ کہتے ہیں۔

اسلامی عرفان اور صوفیانہ فکر بھی انسان کو اپنے نفس کے سچ کا سامنا کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ قرآن کریم کی روشنی میں بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کے لیے صبر، تفکر، توبہ اور انابت کی راہیں اسی وقت کھلتی ہیں جب وہ اپنے نفس کے ساتھ صدق اختیار کرے، اور خود سے فرار کی روش چھوڑ دے۔ "انسان پر وہ وقت بھی آیا جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا" یہ آیت انسان کی بنیادی بے بسی کی یاد دہانی ہے، اور اسی بے بسی کو تسلیم کرکے، انسان اللہ کی مدد کا مستحق بنتا ہے۔

درد، انسان کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے کہ اس کے اندر یا اس کی زندگی میں کچھ ایسا ہے جسے نظر انداز کیا گیا ہے، دبایا گیا ہے، یا جسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہر تکلیف ایک پکار ہے —

شفقت، توجہ، اور فہم کی۔ اگر ہم اس پکار کو سننے کے بجائے اس سے فرار اختیار کریں، تو یہ پکار شور میں بدل جاتی ہے، جو اندرونی بے چینی، جسمانی بیماری یا نفسیاتی بحران کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم رکیں، سنیں، اور اس تکلیف سے بات کریں، تو ہم جان سکتے ہیں کہ ہمیں اصل میں کس چیز کی ضرورت ہے۔

اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ تکلیف سے فرار خود تکلیف کو بڑھا دیتا ہے، جبکہ اس کا سامنا، اسے پوری طرح محسوس کرنا، اور اس سے سیکھنا، شفاء کا آغاز ہے۔ جو دل ٹوٹتا ہے، وہی کھلنے کے لائق بنتا ہے۔ جو آنکھ روتی ہے، وہی بینا ہوتی ہے۔ جو انسان اپنے دکھ کے اندھیرے میں سچائی سے جیتا ہے، وہی نور کے قابل ہوتا ہے۔ اس عمل میں انسان نہ صرف خود کو بہتر طور پر جانتا ہے، بلکہ وہ دوسروں کے دکھ کو بھی بہتر طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ یہی شعور، یہی احساس اور یہی دردمندی، انسان کو انسان بناتی ہے۔

قرآن کریم اور احادیث معصومینؑ کی تعلیمات اس بات کی گہرائی سے تائید کرتی ہیں کہ انسان کی نجات اور روحانی ارتقاء کا راستہ درد و ابتلاء کا سامنا کرنے، اس پر صبر کرنے، اور اسے شعور کے ساتھ جینے سے جُڑا ہوا ہے۔ قرآن مجید انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو نہ صرف ایک آزمائش کے تناظر میں بیان کرتا ہے، بلکہ اس پر تفکر، صبر، اور انابت کے رویوں کو انسان کے قربِ خداوندی کے لازمی زینے قرار دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ (البقرۃ:155)۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ تکلیف، خوف، نقصان اور فقر انسانی زندگی کا حصہ ہیں، اور ان سے بچنا نہیں بلکہ ان کا سامنا کرنا اصل

امتحان ہے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کا دامن تھامتے ہیں، اللہ ان کے لیے خوشخبری کا اعلان فرماتا ہے۔ یہ خوشخبری نہ صرف روحانی تسلی ہے بلکہ اس صبر کے نتیجے میں وہ انسان باطنی پاکیزگی اور عرفانِ رب تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا۔(الشرح:6)۔ یہ آیت دراصل اُس الٰہی منطق کو آشکار کرتی ہے کہ تنگی اور کشادگی، دکھ اور راحت، آزمائش اور انعام ایک ہی سلسلے کے دو پہلو ہیں۔ اللہ بندے کو درد سے گزارتا ہے تاکہ وہ آسانی کا ذائقہ پوری بصیرت سے چکھے۔ درد کی گہرائی دراصل شکر کی بلندی کا سبب بنتی ہے۔ اس لیے دکھ سے فرار انسان کو اس روحانی بلندی سے محروم کر دیتا ہے جو صرف شعور سے گزارے گئے صبر کے راستے سے حاصل ہوتی ہے۔

امام علیؑ کا فرمان ہے :الصبرُ مطيّةُ الفرج۔ صبر فَرَج یعنی نجات و آسانی کی سواری ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ دکھ اور مصیبت سے بھاگنا نجات سے دوری کا ذریعہ بن جاتا ہے جبکہ درد کو محسوس کر کے صبر کے ساتھ گزارنے والا شخص فَرَج اور سکون کی طرف بڑھتا ہے۔ اسی طرح امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: من لم يصبر على البلاء فليس منا یعنی جو مصیبت پر صبر نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں۔ یہ فرمان ہمیں بتاتا ہے کہ اہل بیتؑ کے راستے پر چلنے کا مطلب صرف محبت نہیں بلکہ ان کی روش، ان کی برداشت، اور ان کے ساتھ جینے کے انداز کو اپنانا ہے۔

روایات میں بارہا آیا ہے کہ مومن کی آزمائش سخت ہوتی ہے کیونکہ اللہ اُسے بلند مرتبہ عطا کرنا چاہتا ہے۔ امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں :إِذَا أَحَبَّ اللهُ عَبْدًا اغَتَّهُ بِالْبَلَاءِ غَتًّا، وَإِنْ غَرِق

نَجَّاهُ۔ یعنی جب خدا کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائشوں میں اس طرح ڈبوتا ہے جیسے پانی میں غوطہ دیا جائے، لیکن اگر وہ غرق ہونے لگے تو خدا اسے بچا لیتا ہے۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ درد اور مصیبت دراصل عشقِ الٰہی کی علامت ہیں، نہ کہ خدا کی ناراضی کی۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: أَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الأَنْبِيَاءُ، ثُمَّ الأَمْثَلُ فَالأَمْثَلُ۔ یعنی سب سے زیادہ آزمائش انبیاء پر آتی ہے، پھر اُن پر جو ان سے قریب تر ہیں۔ یہ فرمان اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ درد اور آزمائش کوئی اتفاقی یا ناپسندیدہ شے نہیں بلکہ قربِ خدا کی ایک راہ ہے، جو اللہ کے چنے ہوئے بندوں کا نصیب بنتی ہے۔

اسی تسلسل میں امام زین العابدینؑ کا مشہور دعا ہے جو صحیفۂ سجادیہ میں ملتی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى سَرَّائِهِ وَ ضَرَّائِهِ، وَ شُكْرًا لَهُ عَلٰى عَافِيَتِهِ وَ بَلَائِهِ۔ امام سجدہ شکر کرتے ہیں نہ صرف عافیت پر بلکہ بلا و مصیبت پر بھی، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہر حال میں خدا کی رحمت جاری ہے۔ یہ رویہ دراصل اس روحانی توازن کی نمائندگی کرتا ہے جہاں انسان دکھ اور راحت دونوں کو الٰہی تربیت کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ درد سے فرار درحقیقت اللہ کی تربیت سے انکار ہے، اور تکلیف کو شعور سے جینا خدا کی قربت کا راستہ۔ جو انسان اس شعور کے ساتھ درد کو محسوس کرتا ہے، وہی دراصل اپنے زخموں سے شفا حاصل کرتا ہے، اور وہی حقیقی انسان بننے کی طرف بڑھتا ہے۔

بچے کیوں بگڑ جاتے ہیں؟

بچے بگڑتے نہیں، بگاڑ دیے جاتے ہیں۔ ان کی فطرت پاک، ذہن روشن، اور دل شفاف ہوتے ہیں۔ ہر بچہ محبت، توجہ، معنویت اور تحفظ کا متلاشی ہوتا ہے۔ جب یہ بنیادی انسانی ضروریات والدین، گھر، اسکول یا معاشرے کی جانب سے مسلسل نظر انداز کی جائیں، تو ان کے اندر وہ خلاء پیدا ہونے لگتا ہے جو وقت کے ساتھ صرف تنہائی، الجھن، یا ضد کی صورت میں نہیں بلکہ بعض اوقات مکمل انکار، بغاوت، اور حتیٰ کہ خودکشی جیسے انتہائی عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔

جب بچہ والدین کے درمیان محبت، ہم آہنگی، اور اعتبار کا رشتہ ٹوٹتا ہوا دیکھتا ہے، یا اس پر لاپرواہی، سختی، یا ضرورت سے زیادہ توقعات کا بوجھ ڈالا جاتا ہے، تو اس کے دل میں اپنے وجود کے متعلق سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ "کیا میری حیثیت صرف کامیابی ہے؟ کیا میں صرف اس وقت قابلِ محبت ہوں جب میں دوسروں کی امیدوں پر پورا اتروں؟ اگر میں ناکام ہو گیا، یا اگر میں مختلف ہوں تو کیا میں ناقابلِ قبول ہوں؟" یہی سوالات بچے کے دل میں ایک بے یقینی اور اضطراب پیدا کرتے ہیں۔ جب وہ ان سوالات کا جواب نہ گھر سے پاتا ہے، نہ تعلیمی نظام سے، اور نہ سوسائٹی سے، تو وہ اپنی ذات سے بیزار ہونے لگتا ہے۔

خودکشی کے جذبات یا بغاوت کا آغاز کبھی اچانک نہیں ہوتا، یہ ایک مسلسل دباؤ، بے رخی، احساسِ کمتری، اور عدمِ قبولیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب بچے کی بات سنی نہ جائے، اس کے جذبات کا احترام نہ کیا جائے، جب اس کے وجود کو کسی موازنہ، طنز، یا کنٹرول کے نیچے دبا دیا جائے، تو وہ یا تو خود کو مکمل طور پر مٹا دینے کا سوچتا ہے یا پھر ایک ایسا ردعمل دیتا ہے جو پورے خاندانی یا معاشرتی ڈھانچے کو چیلنج کرتا ہے۔

بعض والدین نادانستہ طور پر بچوں پر اپنے ادھورے خواب تھوپ دیتے ہیں۔ وہ انہیں ہمیشہ بہترین، اول، کامیاب، مشہور، اور سبقت کرنے والا دیکھنا چاہتے ہیں، جبکہ بچہ محض یہ چاہتا ہے کہ اسے ویسا ہی قبول کیا جائے جیسا وہ ہے۔ بعض اوقات والدین بچوں کی نفسیاتی تبدیلیوں کو سمجھنے کے بجائے انہیں ڈانٹ کر، نظر انداز کر کے یا الزامات لگا کر ان کی الجھن کو مزید گہرا کر دیتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب بچے کا دل والدین سے دور ہونے لگتا ہے، اور وہ کسی اور طرف پناہ ڈھونڈنے لگتا ہے، چاہے وہ انٹرنیٹ ہو، غلط صحبت، مصنوعی دنیا، یا خود کو نقصان پہنچانے کا تصور۔

اس بگاڑ کو روکنے کے لیے والدین کو شعور، صبر، اور محبت سے کام لینا ہوگا۔ انہیں بچوں کی باتیں سننی ہوں گی، نہ صرف زبان سے بلکہ دل سے۔ انہیں بچوں کی خامیوں کو تنقید کے بجائے تربیت کے ذریعے درست کرنا ہوگا۔ والدین کو خود اپنے کردار میں وہ مثالی پن لانا ہوگا جو بچے کی شخصیت پر اثر ڈالے۔ بچوں کی پرورش صرف مالی آسائش یا تعلیم دلوانے کا نام

نہیں بلکہ ان کی روح کی پرورش، ان کی شخصیت کی شناخت، اور ان کے وجود کو ایک باوقار جگہ دینا بھی ہے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ روزانہ کی بنیاد پر بچوں سے بات کریں، ان کے ساتھ وقت گزاریں، ان کی بات کو بغیر جلد بازی، فیصلہ یا مداخلت کے سنیں۔ وہ اگر اپنے بچے کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں کہ "تم چاہے جیسا بھی محسوس کرو، تم ہمارے لیے عزیز ہو"، تو وہ بچے کے اندر ایک ایسی داخلی طاقت پیدا کر سکتے ہیں جو اسے دنیا کے دباؤ سے بچا سکتی ہے۔

اسلامی تعلیمات میں بچوں کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بچوں سے شفقت سے پیش آتے، ان کے ساتھ کھیلتے، ان کے جذبات کو سراہتے، حتیٰ کہ ان کی خامیوں پر بھی نرمی سے رہنمائی کرتے۔ اگر ہم اس نبویؐ اسلوب کو اپنی گھریلو زندگی کا حصہ بنا لیں تو بگڑنے کا عمل نہیں بلکہ سنورنے کا سفر شروع ہو سکتا ہے۔

یاد رکھیں، بچے بگڑتے نہیں، وہ صرف سنے جانے، سمجھے جانے، اور محبت کیے جانے کی آس میں بھٹک جاتے ہیں۔ اگر ہم انہیں وقت پر سنبھال لیں، تو وہی بچے کل کا سرمایہ، روشنی، اور اصلاح کی قوت بن سکتے ہیں۔ اگر نہ سنبھالا جائے، تو وہی بچے خود کے خلاف یا معاشرے کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارے انتخاب پر ہے کہ ہم انہیں مجرم بنائیں یا مجاہد۔

عالمی برادری اور خدائی نظامِ امامت

دنیا میں آج جو سائنسی ترقی، تکنیکی ایجادات اور بلند و بانگ تحقیقی منصوبے چل رہے ہیں، ان کی چمک دمک کے پیچھے ایک بہت بڑی ناانصافی چھپی ہوئی ہے۔ جبکہ ایک طرف ٹیکنالوجی، خلائی تحقیق، آرٹیفیشل انٹیلیجنس، اور بایو انجینئرنگ جیسے میدانوں میں کھربوں ڈالرز خرچ کیے جا رہے ہیں، وہیں دوسری طرف زمین کی 70 فیصد آبادی ایسی ہے جسے بنیادی ضروریاتِ زندگی، جیسے کھانا، لباس، پانی، دوا، اور پناہ، بھی میسر نہیں۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جدید دنیا کا علمی اور تکنیکی نظام اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس کا اصل فائدہ چند عالمی طاقتوں، ملٹی نیشنل کمپنیوں، عسکری صنعتی نظام، اور سرمایہ دار ایلیٹ تک محدود ہو جاتا ہے، جبکہ باقی انسانیت غربت، بھوک، اور محرومی کے جہنم میں جھلس رہی ہے۔

یہ سب کچھ کسی حادثاتی یا غیر شعوری عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طے شدہ استعماری منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ جدید تحقیق اور ٹیکنالوجی کو انسانی خدمت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اسے استحصال، کنٹرول، اور نسلوں کی تباہی کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ سامراجی طاقتیں اپنی خواہشات کے تحفظ اور دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے ایسے منصوبے بنا رہی ہیں جو نہ صرف غریب اقوام کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں بلکہ ان کی آبادی گھٹانے، ثقافتیں مٹانے، معیشتیں کمزور کرنے، اور نسلوں کو روحانی و اخلاقی گمراہی کی طرف دھکیلنے

کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ویکسین، خوراک، پانی، دواؤں، حتیٰ کہ تعلیمی نصاب تک میں وہ زہر چھپایا جا رہا ہے جو انسان کی فطرت، روح، اور عزت کو مسخ کر دیتا ہے۔
یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ آج کا عالمی نظام مہربان خدا کے الٰہی نظام سے منہ موڑ چکا ہے۔ خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہادیوں، انبیاء، اور اوصیاء کی تعلیمات کو نظر انداز کر کے دنیا نے اپنے معاملات ان لوگوں کے ہاتھ دے دیے ہیں جو خود خدا کے منکر، انسانیت کے دشمن، اور صرف ذاتی مفادات کے غلام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج زمین پر نہ عدل ہے، نہ امن، نہ رحم، نہ شرافت، نہ حیا، نہ روحانیت۔ جو نظام معصوم بچوں کے لیے خوراک اور دوا میسر نہیں کرتا، مگر اربوں ڈالرز کا اسلحہ بنا کر انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے، وہ کبھی بھی انسانی ہمدردی کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ پوری انسانیت کو مصنوعی ذہانت کے ذریعے کنٹرول کرنا چاہتے ہیں، وہ دراصل انسانوں کو غلام بنانے کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔
خدائی نظام، جو اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات، انبیاء علیہم السلام کی سیرت، اور فطرتِ انسانی کے مطابق ترتیب پاتا ہے، صرف وہی ایسا نظام ہے جو انسان کو اس کے مقام، عزت، اور فطری حقوق تک پہنچا سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے منتخب کیے گئے رہنما، وہی حقیقی رحمت اور عدل کے علمبردار ہوتے ہیں جو اپنی خواہش، نسل، قوم، مفاد سے بالاتر ہو کر پوری انسانیت کے لیے خیر و فلاح کا پیغام لاتے ہیں۔
خدائی نظام کی حقانیت اور افضلیت پر تاریخ میں بے شمار روشن مثالیں موجود ہیں، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ صرف وہی نظام جو اہل بیت علیہم السلام کی امامت اور انبیاء علیہم السلام کی سیرت پر مبنی ہو، انسانیت کو نجات اور عدل و رحمت کا حقیقی راستہ دکھا سکتا ہے۔
جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے میں اسلامی حکومت قائم کی تو یہ حکومت

قبیلوں، نسلوں یا علاقائی مفادات پر نہیں بلکہ وحی، عدل، اور اخلاق پر مبنی تھی۔ رسول اللہؐ نے مہاجرین و انصار کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا اور ریاستی قانون کو ذاتی رشتوں پر مقدم رکھا۔ جب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے حق میں بھی عدالتی و حکومتی انصاف قائم نہ رہ سکا تو اہل بیتؑ نے خاموشی سے یہ بتایا کہ خلافت کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اس کا حقیقی عدل پر مبنی ہونا ضروری ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی خلافت بھی خدائی نظام کی عملی مثال تھی۔ جب ایک غیر مسلم عورت کی کلائی سے زبردستی زیور اتار لیا گیا تو امامؑ کے نزدیک یہ اتنا بڑا ظلم تھا کہ فرمایا: "اگر کوئی اس خبر پر مر جائے تو بجا ہے۔" اور جب اپنے بھائی عقیل نے بیت المال سے زائد حصہ مانگا تو آپ نے جلتی ہوئی لوہا ان کی طرف بڑھا دیا اور فرمایا کہ اگر دنیا کا مال چاہتے ہو تو یہ آگ برداشت کرو۔ یہاں امامؑ نے یہ ثابت کیا کہ خدا کا نظام اقربا پروری یا سیاسی مفادات پر نہیں بلکہ عدل مطلق پر قائم ہوتا ہے۔

واقعہ کربلا بھی اسی خدائی نظام کی ایک نمایاں مثال ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے ایک ظاہری فاسق اور جابر حکومت کو یہ کہہ کر چیلنج کیا کہ "مثلی لا یبایع مثلہ" یعنی "میرے جیسا شخص، اس جیسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا۔" امامؑ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا مگر ظالم کے ہاتھ پر بیعت نہ کی، کیونکہ یزید کا نظام انسانی فطرت، قرآن، اور نبوی سنت کے برخلاف تھا۔ کربلا میں دین کو اقتدار کے بجائے قربانی، سچائی، اور اخلاق سے بچایا گیا۔ ایک اور مثال امام سجادؑ کی دعاؤں میں دکھائی دیتی ہے۔ جب ظاہری حکومت ظالموں کے ہاتھ میں تھی، امامؑ نے صحیفہ سجادیہ کے ذریعے اندرونی اصلاح، بندگی، اور خدا کی طرف رجوع کا ایسا نظام پیش کیا جو فطرتِ انسانی اور انبیائی حکمتوں سے مکمل ہم آہنگ ہے۔

اسی طرح امام جعفر صادقؑ کے دور میں، جب بنو امیہ اور بنو عباس کی ظالم حکومتیں فقہ اور شریعت کو سیاست کا آلہ بنائے ہوئے تھیں، امامؑ نے ایک ایسا تعلیمی و فکری نظام قائم کیا جس نے ہزاروں شاگردوں کی تربیت کی، جن میں ابو حنیفہ و مالک بھی شامل تھے۔ امام صادقؑ کا یہ علمی انقلاب بھی بتاتا ہے کہ خدائی نظام ظلم کے رد اور انسان کے فطری ارتقاء کے لیے کیسے کام کرتا ہے۔

لہٰذا اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جب تک دنیا کے مظلوم، مفکر، متقی، مخلص اور بیدار انسان ایک آواز ہو کر دنیاوی، قومی، لسانی، مسلکی، اور گروہی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر خدا کے منتخب کردہ رہبر کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوں گے، تب تک ظلم کا یہ عالمی نیٹ ورک مسلسل طاقت پکڑتا رہے گا اور انسانیت کو فنا کی طرف لے جاتا رہے گا۔ خدا کا عدل، اس کا نور، اس کی رحمت تب ہی ظاہر ہو گی جب زمین پر اس کا نمائندہ نظام قائم ہو گا۔ اور یہ نمائندہ نظام صرف وہی لائے گا جو خود خدا کی طرف سے منتخب، معصوم، اور خالصتاً انسانیت کا خیر خواہ ہو گا۔

لہٰذا جو لوگ واقعی انسانیت کے ہمدرد ہیں، ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ صرف وقتی و سطحی اصلاحات پر قناعت نہ کریں بلکہ اس عالمی فکری و تہذیبی نظام کو چیلنج کریں جو خدا کے خلاف بغاوت پر کھڑا ہے۔ اسی فکری بغاوت کو زیر کرنے کے لیے ہمیں الٰہی نظام، روحانی تربیت، اخلاقی قیادت، اور فطری معاشرت کی طرف لوٹنا ہو گا۔ کیونکہ اگر انسان نے وقت پر اپنے اصل کو نہ پہچانا تو وہ مشینوں، سرمایہ داروں، اور دھوکہ باز حکمرانوں کا دائمی غلام بن جائے گا۔ اور یہی وہ زنجیر ہے جسے توڑنا، ہر بیدار انسان کی ذمہ داری ہے۔

جدید دنیا میں مجبوریاں اور عادل نظام کی جدوجہد

دورِ حاضر میں جب انسان نے سائنسی ترقیات، ٹیکنالوجی کی جدتوں اور دنیاوی سہولیات کے وسیع تر امکانات کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے تو اس کے ذہن میں ایک سوال مسلسل گردش کرتا ہے کہ کیا وہ دینی تہذیب، جو چودہ سو سال قبل ایک صحرائی خطے میں نازل ہوئی تھی، آج کے جدید دور کے لیے بھی قابل عمل ہے یا وہ اب فرسودہ اور دقیانوسی ہو چکی ہے؟ یہ سوال درحقیقت ایک غلط بنیاد پر اٹھتا ہے، کیونکہ یہ جدید تہذیب کی چکاچوند اور ظاہری ترقی کو معیار بنا کر اٹھایا جاتا ہے، جبکہ وہ اصول، اقدار، اور تہذیبی روح جو دینی نظامِ حیات کی بنیاد ہے، نہ صرف آج کے مسائل کا حل رکھتی ہے بلکہ آنے والے کل کی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے۔

جدید تہذیب کی بنیاد چونکہ تجرباتی سائنس، سرمایہ دارانہ منطق، اور لذت پرستی پر رکھی گئی ہے، اس لیے اس میں انسانیت کے روحانی اور فطری تقاضوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جہاں ایک طرف انسانی ذہن کو تکنیکی ترقی کی طرف متوجہ کیا گیا، وہیں اس کی روح کو مادہ پرستی، مقابلہ بازی، انفرادیت پسندی اور شہوت پرستی کے دلدل میں دھنسا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان بے چینی، اضطراب، ذہنی دباؤ، خاندانی ٹوٹ پھوٹ، اخلاقی زوال، اور روحانی خلا کا شکار ہے۔ اس جدید تہذیب کی چمک دمک کے پیچھے ایک تاریک سچائی چھپی ہے جسے وہی انسان دیکھ سکتا ہے جس کی آنکھ اب بھی فطرت کی روشنی سے منور ہے۔ اس

جدید تہذیب نے انسان کو تعلیم تو دی، مگر وہ تعلیم جو ظالم کو مزید طاقتور بناتی ہے اور مظلوم کو مزید بے بس۔ وہ سائنس جو قدرت کو تسخیر کرنے کے بجائے اسے مسخ کرنے کا ذریعہ بن گئی۔ وہ سیاست جو عدل کے قیام کے بجائے طاقت کے تحفظ کا آلہ کار بن گئی۔

ایسے وقت میں جب دینی تہذیب کی بات کی جاتی ہے تو اسے محض ماضی پرستی یا قدامت پسندی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ دینی تہذیب کی بنیاد علم، حکمت، عدل، احسان، محبت، ایثار، اور انسانی فطرت کی گہرائیوں میں پوشیدہ تقاضوں پر ہے۔ یہ وہ تہذیب ہے جو نہ صرف خالقِ کائنات سے تعلق کو مضبوط کرتی ہے بلکہ انسانوں کے درمیان ربط، شفقت، اور ہمدردی کو فروغ دیتی ہے۔ دینی تہذیب علم کی دشمن نہیں، بلکہ وہ تو علم کا سرچشمہ ہے؛ لیکن وہ علم جو بندگی، اخلاق اور فلاحِ انسانیت سے جڑا ہو۔ وہ تہذیب جدید سائنسی ایجادات کی مخالف نہیں، بلکہ ان کی سمت درست کرنے والی ہے۔ وہ طرزِ زندگی جو سہولت فراہم کرے مگر ظلم، استحصال، جبر، تکبر اور حرص سے پاک ہو۔

آج دینی تہذیب کو اس لیے کمزور سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ نظامی سطح پر نافذ نہیں، وہ ایک اجتماعی نظام کے طور پر نظر نہیں آ رہی، اس کے ادارے، اس کا قانون، اس کی معیشت، اس کی سیاست اور اس کی ثقافت معاشروں پر حاوی نہیں۔ نتیجتاً، دین دار افراد جدید نظاموں کے تابع ہو کر مجبوراً ان کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں، اور کبھی کبھی اسی کو حق سمجھنے لگتے ہیں۔

خواتین کی ملازمت، نو سے پانچ کی غلامی نما نوکری، سرمایہ پر مبنی تعلیم، صارفیت پر مبنی معیشت، دکھاوے پر مبنی ثقافت اور انتخابی سیاست کے مصنوعی کھیل، سب وہ مظاہر ہیں جہاں دینی تہذیب کی جگہ جدید جہالت نے لے لی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دین کا احیاء محض عبادات اور اخلاقیات تک محدود نہ ہو بلکہ دینی تہذیب کی بنیاد پر ایک نیا نظام زندگی تشکیل پائے۔ ایسا نظام جو روح اور مادہ کے درمیان توازن قائم کرے، فرد اور معاشرے کے درمیان تعلق کی از سرِ نو تشریح کرے، عورت کو اس کے حقیقی مقام پر فائز کرے، معیشت کو عدل و قناعت پر مبنی بنائے، تعلیم کو معرفتِ نفس اور معرفتِ رب کی طرف لے جائے اور سیاست کو ولایت اور تقویٰ کے اصولوں پر استوار کرے۔ ایسا صرف اسی وقت ممکن ہے جب دین دار افراد اس امر کو سمجھیں کہ موجودہ سسٹمز کا حصہ بننا تقیہ ہے، مگر ان سسٹمز کو دائمی حل سمجھنا غفلت ہے۔ تقیہ کا مطلب ہے مجبوری کے تحت جزوی موافقت، نہ کہ کلی اطاعت۔ اس لیے لازم ہے کہ ہم دین کے ہمہ جہتی نفوذ کے لیے مسلسل جدوجہد کریں۔ جدوجہد صرف وعظ و نصیحت سے نہیں بلکہ علمی، فکری، تعلیمی، ثقافتی، اور سیاسی میدان میں ایک عملی تحریک کے ذریعے ممکن ہے۔

دینی تہذیب کو نجات دہندہ اور فطرت کے عین مطابق صرف اس وقت ثابت کیا جا سکتا ہے جب وہ انسان کے اندر سکون، خاندان میں محبت، معیشت میں عدل، سیاست میں دیانت، اور تعلیم میں روحانیت کا احیاء کرے۔ تبھی یہ تہذیب صرف ایک ماضی کی یادگار

نہیں بلکہ مستقبل کا روشن راستہ بن سکتی ہے۔ اور یہی وہ لمحہ ہو گا جب جدید تہذیب کے فریب، جبر، اور استحصال پر مبنی نظام اپنی موت آپ مر جائے گا اور انسان اپنی فطرت کی طرف واپس لوٹے گا—دینِ فطرت کی طرف۔

اسلامی تعلیمات میں انسان کو کسی بھی نظامِ باطل یا طاغوتی تمدن میں گھلنے، رچنے یا اس سے فکری یا عملی طور پر ہم آہنگ ہونے کی اجازت نہیں دی گئی، خصوصاً جب اس نظام کی بنیاد ظلم، استحصال، الحاد یا غیر الٰہی اقتدار پر ہو۔ تاہم اگر وہ نظام غالب ہو اور اس سے کنارہ کشی ممکن نہ ہو اور انسان کو زندہ رہنے، اپنے اہل و عیال کو پالنے یا کسی حد تک تحفظ فراہم کرنے کیلئے اس کے کچھ وسائل سے فائدہ اٹھانا ناگزیر ہو جائے تو اسلام اس حالت کو تقیہ، اضطرار، مجبوری، یا کفار کی سرزمین میں اقامت کے باب میں موضوع بحث لاتا ہے اور رہنمائی بھی فراہم کرتا ہے۔

قرآن مجید ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ سناتا ہے جو کہ مصر کے ایک غیر اسلامی نظام میں منصبِ اقتدار پر فائز ہوئے، لیکن انہوں نے اس موقع کو طاغوتی نظام کو تقویت دینے کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے اختیار کو استعمال کر کے عدل، انصاف اور فلاحِ عوام کا انتظام کیا اور فاسد نظام کو اصلاح کی طرف موڑنے کی جدوجہد کی۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یوسفؑ نے حکومت اس شرط پر قبول کی کہ انہیں مکمل اختیار حاصل ہو تاکہ وہ فاسد ادارے کو عدل پر قائم کریں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر فاسد نظام کے اندر داخل ہو کر اس میں اصلاح کی حقیقی، نیت کے ساتھ گنجائش ہو تو یہ امر مباح بلکہ

بعض اوقات مستحب اور واجب بھی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے محل میں پرورش پائی، لیکن دل سے کبھی فرعونیت کو تسلیم نہ کیا بلکہ پورے نظام کو بدلنے کیلئے اپنی نبوی تحریک کی بنیاد رکھی۔

قرآن مجید میں سورہ نحل کی آیت 106 میں تقیہ کی مشروعیت بیان کی گئی ہے کہ جو لوگ کفر پر مجبور کیے گئے لیکن ان کے دل ایمان پر قائم رہے، ان پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ آیت ان لوگوں کے لیے ہے جو استعماری یا طاغوتی نظام میں وقتی طور پر مجبوری یا تحفظ کے پیش نظر شریک ہوتے ہیں لیکن ان کی باطنی وابستگی دین اور انقلاب سے جڑی رہتی ہے اور وہ اس نظام کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آئمہ معصومین علیہم السلام کی حیات بھی تقیہ، اصلاح اور جدوجہد کا امتزاج ہے۔ امام علی علیہ السلام نے ظاہری طور پر تین خلفاء کے ساتھ بظاہر "سازگار" رویہ اختیار کیا مگر ان کے دل، فکر، دعوت اور موقف ان کے نظام سے جدا اور مزاحم تھے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بنی عباس کی ظاہری اجازت کے باوجود اپنی تمام علمی و معاشرتی کوششوں کا رخ عوامی شعور بیدار کرنے اور اسلامی تہذیب کی بنیادیں قائم کرنے پر مرکوز رکھا۔ فقہائے کرام بالخصوص شہید آیت اللہ باقر الصدر نے اپنے مشہور بیانات میں اس بات کو واضح کیا کہ استعمار کے مسلط کردہ تمدنی نظامات میں مسلمان اس وقت تک مجبورا زندگی گزار سکتے ہیں جب تک وہ نظامِ اسلامی کی تشکیل کے لیے فکری، تہذیبی اور عملی جدوجہد ترک نہ کریں۔ ان کے نزدیک موجودہ مغربی ریاستی ڈھانچے محض ظاہری

انتظامات نہیں بلکہ ایک فکری اور فلسفیانہ نظام کے حامل ادارے ہیں جن کا تعلق انسان، کائنات اور الٰہیات کے خاص تصورات سے ہے، اور جب تک ان تصورات کو اسلامی فہم سے متصادم مانا جاتا ہے، اس وقت تک ان اداروں کا بلا چون وچرا تسلیم اسلام سے انحراف ہو گا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اصل ہدف ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینا ہے جس میں ثقافت، معیشت، سیاست، قانون، تعلیم، صحت، تفریح، اور خواتین و مردوں کے کردار سب فطرتِ سلیم، عقلِ سلیم، اور وحیِ الٰہی کے مطابق ڈھلے ہوں۔ استعماری اصطلاحات و اداروں کا جتنا تعلق صرف انتظامی سہولت سے ہو، ان میں اسلام بوقتِ مجبوری نرمی دیتا ہے بشرطیکہ ان کو مستقل بنیادوں پر اختیار نہ کیا جائے اور نہ ہی ان کو اسلامی سمجھا جائے۔ لیکن ان اداروں کے جو پہلو فکری اور تہذیبی استعمار کے نمائندہ ہوں، جیسے نیو لبرل اکانومی، سیکولر تعلیم، سرمایہ دارانہ انصاف، یا جنس زدہ تفریحی صنعت، ان کو جزوی طور پر بھی قبول کرنا نہ صرف اسلام کی روح سے انحراف ہے بلکہ ایک خاموش الحاد کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ اسلامی ریاست کو جب بھی حقیقی طور پر استعماری نظام سے آزادی حاصل ہو تو اس کا فرض ہے کہ تدریجاً مگر واضح طور پر ان اداروں کی جگہ اپنے اصولوں پر مبنی فطری اور الٰہی نظلات قائم کرے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد تعلیم میں ہے، عدل میں ہے، اخلاق میں ہے، خواتین و مردوں کے فطری کرداروں میں ہے، صحت اور معیشت کے فطری اصولوں میں ہے، اور سب سے بڑھ کر وحی اور عقلِ سلیم کے اشتراک پر قائم شعور میں ہے۔ لہٰذا ایسے دور میں کہ جب پوری دنیا میں استعماری نظامات اپنی گرفت مضبوط کر چکے ہوں،

مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ان نظامات سے بقدرِ ضرورت استفادہ کریں، لیکن ان سے فکری آزادی حاصل کریں، ان میں جذب نہ ہوں، بلکہ مسلسل اس بات کی سعی کریں کہ وہ معاشرتی، فکری اور اخلاقی سطح پر الٰہی اصولوں پر مبنی سماج کی طرف واپسی کریں، تاکہ انسان کو انسان ہونے کا مقام دوبارہ نصیب ہو، اور وہ ایک استعماری مشین کا پرزہ بن کر نہ جیے بلکہ ایک بیدار، آزاد اور باوقار خلیفۃ اللہ فی الارض کے طور پر زندہ رہے۔

حسیات پر مبنی علم اور مابعد الطبیعات

علمِ انسانی کی تاریخ میں ہمیشہ ایک بنیادی کشمکش رہی ہے: محسوسات پر مبنی علم (empirical knowledge) اور غیر محسوس، ماورائی یا غیبی علم (metaphysical or revealed knowledge) کے درمیان تعلق۔ مغربی جدیدیت اور سائنسی انقلاب کے بعد empirical evidence-based research کو علم کا سب سے معتبر ذریعہ تسلیم کیا گیا۔ اس طرزِ فکر میں مشاہدہ، تجربہ، ناپ تول، اور تکرار پذیری کو علمی صداقت کا معیار مانا گیا، اور اس کے نتیجے میں سائنس، طب، ٹیکنالوجی اور دیگر شعبہ جات میں بے پناہ ترقی ہوئی۔ تاہم اس فریم ورک نے صرف اسی علم کو "حقیقی" قرار دیا جو اس کے دائرے میں آتا ہے، اور اس کے باہر کی تمام حقیقتوں کو یا تو "غیر علمی" یا "تشکیکی" قرار دیا۔ یہ رویہ انسان کو حسیات کا اسیر اور ماورائیت سے منقطع بنا دیتا ہے۔

دوسری جانب علم الغیب اور ماورائی حقائق کا تصور انسانی تاریخ، مذاہب، وحی، اور روحانی تجربات میں نہایت مرکزی مقام رکھتا ہے۔ اسلام کے نزدیک علم محض حسیات سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ عقلِ سلیم، فطرتِ صحیح، اور وحیِ الٰہی بھی اس کے اہم ذرائع ہیں۔ قرآن بار بار انسان کو تدبر، تفکر، اور تذکر کی دعوت دیتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کرتا ہے کہ انسان کی علم کی رسائی محدود ہے: وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ اس کا مطلب ہے کہ

حسیاتی علم اپنی جگہ درست مگر ناکافی ہے۔ ماورائی حقائق جیسے وجودِ خدا، ملائکہ، قیامت، وحی، جنت و جہنم، اور امامِ غائبؑ — ان سب کا تعلق اس "عالم الغیب" سے ہے جسے empirical research کبھی بھی مکمل طور پر دریافت نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہے۔

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا empirical research اور علم الغیب میں کوئی تعلق یا ہم آہنگی ممکن ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگر empirical research کی حدود کو پہچانا جائے اور اس کے دعووں کو وحی کے تابع رکھا جائے تو دونوں علم کے دائرے ایک دوسرے کو تقویت دے سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر طب، نفسیات، یا cosmology جیسے شعبوں میں بعض حقائق ایسے ہیں جو وحی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہیں، لیکن اگر empirical research کسی غیر محسوس حقیقت (جیسے روح یا دعا کے اثر) کا انکار کرے صرف اس بنا پر کہ وہ محسوس نہیں ہو رہی تو یہ اس کی فکری تنگ نظری ہے، علمی دیانت نہیں۔ کیونکہ تاریخ میں خود سائنس نے کئی بار اپنی پرانی "حتمی" باتوں کو ترک کیا اور نئے تجربات کی روشنی میں خود کو بدلا۔

اسلامی ورلڈ ویو میں علم کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو سمجھے، اپنے رب کی معرفت حاصل کرے، اور اپنے عمل کو تزکیہ و قربِ الٰہی کے لیے وقف کرے۔ اس کے لیے صرف empirical methods کافی نہیں، بلکہ وحی کی روشنی، عقلِ نیک، اور دل کی

صفائی بھی ضروری ہے۔ قرآن بارہا "آیاتِ آفاق" اور "آیاتِ انفس" دونوں پر غور کا حکم دیتا ہے، جو ظاہر کرتا ہے کہ مشاہدہ اور درون بینی دونوں علم کے معتبر ذرائع ہیں۔

آج کا انسان جو سائنس کے نام پر صرف مادہ اور مشاہدہ کو معیار مانتا ہے، وہ دراصل ایک غیر متوازن فکری نظام میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ ماورائی دنیا کو فسانہ یا عقیدہ مان کر چھوڑ دیتا ہے، حالانکہ یہی ماورائی شعور اس کی اخلاقی و روحانی سلامتی کا ضامن ہے۔ انسان اگر صرف محسوسات پر تکیہ کرے تو وہ ظاہری ترقی تو کر سکتا ہے، مگر باطنی زوال سے دوچار ہو جاتا ہے۔ وہ چیزوں کو جاننے لگتا ہے مگر ان کے معنی سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے صرف empirical research کو علم کا واحد معیار ماننا ایک محدود، غیر متوازن اور خطرناک علمی رجحان ہے۔

سائنس کو عام طور پر ایک ایسا شعبہ تصور کیا جاتا ہے جو صرف مشاہدے، تجربے اور پیمائش پر مبنی ہوتا ہے، اور جس میں صرف وہی چیزیں معتبر ہوتی ہیں جو حواسِ خمسہ یا سائنسی آلات کے ذریعے دیکھی یا ناپی جا سکیں۔ لیکن اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو سائنس کی بنیاد خود کئی ایسے تصورات، مفروضات اور اصولوں پر قائم ہے جو سراسر ماورائی یا میٹا فزیکل نوعیت رکھتے ہیں۔ سائنس اپنے تمام تر ظاہر شدہ empirical frame کے باوجود ان دیکھے، غیر مادی، اور فلسفیانہ مفروضوں پر کھڑی ہے، جنہیں وہ خود ثابت نہیں کر سکتی بلکہ صرف تسلیم کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس کی شروعات بھی ایمان (belief) سے ہوتی ہے، محض تجربہ (experiment) سے نہیں۔

مثال کے طور پر سائنس یہ مفروضہ مان کر تحقیق کرتی ہے کہ کائنات منظم (ordered) ہے، قوانین پر مبنی ہے، اور یہ کہ یہ قوانین ہر جگہ یکساں انداز میں کام کرتے ہیں۔ اب یہ تصور — کہ کائنات میں قوانین ہیں اور وہ قابلِ اعتبار ہیں — خود کوئی empirical حقیقت نہیں بلکہ ایک میٹافزیکل مفروضہ ہے۔ کوئی سائنسدان یہ تجربہ کرکے یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ کائنات منظم ہے یا قوانین پر مبنی ہے، بلکہ وہ صرف مشاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے، اور پھر اُسی مفروضے کی بنیاد پر نظریہ (theory) تشکیل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فزکس میں 'laws of nature' کو universal مانا جاتا ہے، مگر ان کی ultimate origin کی وضاحت سائنس کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سائنس کے اندر بھی فلسفہ زندہ ہے، چاہے وہ اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے۔

اسی طرح نظریہ 'بگ بینگ لیں۔ یہ تصور کہ پوری کائنات ایک نقطے سے پھوٹی اور وقت و مکان اس کے ساتھ وجود میں آئے، empirical observation سے تو جزوی طور پر تصدیق شدہ ہے، لیکن اس کا بنیادی ڈھانچہ ایک مفروضہ ہی ہے۔ سائنسدان کائنات کی موجودہ حالت دیکھ کر اس کا ماضی تخمیناً کھوجتے ہیں، مگر "آغاز" کو کوئی بھی براہِ راست مشاہدہ یا تجربہ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح dark matter اور dark energy جیسے مظاہر — جنہیں موجودہ سائنسی کائناتی نظریات میں تسلیم کیا گیا ہے — اپنی اصل میں غیر محسوس (non-empirical) ہیں۔ ان کا کوئی براہِ راست مشاہدہ یا پیمائش ممکن نہیں، بلکہ ان کے اثرات (مثلاً کششِ ثقل کے انداز، کہکشاؤں کی گردش وغیرہ) کی بنیاد پر ان کا وجود فرض کیا

گیا ہے۔ یعنی سائنس نے ان مظاہر کو تسلیم کیا ہے، مگر ان کا ادراک مکمل طور پر عقلی تخمینے یا بالواسطہ مشاہدے پر مبنی ہے۔

نفسیات کے میدان میں بھی ایسے کئی مظاہر موجود ہیں جنہیں empirical طریقے سے پرکھنا مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے، جیسے شعور(consciousness) ، لاشعور (subconscious)، نیت(intention) ، ارادہ (will) یا خواب (dream) کی نوعیت۔ یہ مظاہر انسان کے اندر موجود ضرور ہیں، ان کے اثرات بھی ظاہر ہوتے ہیں، مگر ان کی اصل حالت، نوعیت اور حدود کو کسی لیبارٹری میں مکمل طور پر ناپا نہیں جا سکتا۔ اس کے باوجود ان پر علمی گفتگو ہوتی ہے، نظریات بنائے جاتے ہیں، اور بعض اوقات سائنس ان کو تسلیم بھی کر لیتی ہے—کیونکہ ان کے اثرات مشاہدے میں آتے ہیں۔

ایک اور قابلِ ذکر مثال 'causality' یعنی علت و معلول کا اصول ہے۔ سائنس یہ مفروضہ مانتی ہے کہ ہر واقعہ کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ لیکن "سبب" خود کوئی قابلِ مشاہدہ وجود نہیں رکھتا؛ ہم صرف واقعات کا تعاقب کرتے ہیں اور ان کے درمیان تعلق قائم کرتے ہیں۔ فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے اس اصول پر سخت تنقید کی تھی کہ ہم کبھی بھی "سببیت" کو براہِ راست نہیں دیکھتے؛ ہم صرف ایک چیز کے بعد دوسری چیز ہوتے دیکھتے ہیں اور تعلق فرض کر لیتے ہیں۔ اس لیے علت و معلول بھی ایک میٹا فزیکل بنیاد ہے جو سائنس کے تمام نظریات کو سہارا دیتی ہے۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ سائنسی تحقیق میں نظریے کی تشکیل (theorizing) خود ایک تخلیقی، ماورائی عمل ہے۔ ایک سائنسدان جب نئی تھ مذری تشکیل دیتا ہے تو وہ صرف observation کا غلام نہیں ہوتا بلکہ وہ تخیل، الہام، اور وجدان سے کام لیتا ہے۔ آئن اسٹائن کی "Theory of Relativity" یا ہائزن برگ کا "Uncertainty Principle" محض تجربات سے نہیں بنے بلکہ ان کے پیچھے تصور، وجدان اور فکری پرواز تھی۔ گویا سائنسی دریافت خود ایک غیبی لمحہ ہو سکتا ہے جو دل و دماغ پر وارد ہوتا ہے۔

اسلامی علمیات کے مطابق، حقیقت صرف وہ نہیں جو حواس سے محسوس ہو، بلکہ اس کے علاوہ بھی ایک "عالم الغیب" ہے جو مشاہدے سے بالاتر ہے مگر وجود رکھتا ہے۔ قرآن بارہا "غیب" پر ایمان کی بات کرتا ہے کیونکہ اللہ جانتا ہے کہ علم کی حقیقی وسعت اس سے کہیں زیادہ ہے جو انسان کی آنکھ دیکھ سکتی ہے یا مائکروسکوپ دکھا سکتا ہے۔ ایک مومن انسان کے لیے ایمان بالغیب کوئی نفیِ علم نہیں بلکہ ایک اعلیٰ درجے کا ادراک ہے جو حسی دنیا کی محدودیت کو پہچان کر آگے بڑھتا ہے۔

لہٰذا اگرچہ سائنس کی بنیاد empirical research پر رکھی گئی ہے، مگر اس کا ڈھانچہ، اصول اور ابتدائی مفروضے سب کسی نہ کسی درجے میں metaphysical ہیں۔ سائنس جب اپنے حدود کو پہچانتی ہے تو وہ علمِ غیب سے متصادم نہیں بلکہ ہم آہنگ بن سکتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے محدود طریقِ کار کو علم کی واحد شکل بنا لیتی ہے تو وہ حقیقت کا انکار کرنے لگتی ہے — اور یہی رویہ انسان کو علمی تکبر اور روحانی فقر میں مبتلا کرتا ہے۔ علم کی تکمیل

تبھی ممکن ہے جب حواس کی مدد سے مشاہدہ کیا جائے، عقل سے ترتیب دی جائے، اور وحی سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ یہ توازن ہی حقیقی علم کی بنیاد ہے۔

اسلام ہمیں دعوت دیتا ہے کہ علم کی تکثیریت (multiplicity) کو قبول کریں، حسیات کو عقل سے، عقل کو وحی سے، اور وحی کو عمل سے جوڑیں۔ جب تک یہ سلسلہ مکمل نہ ہو، علم انسان کو رشد نہیں دے سکتا، اور نہ ہی معاشرہ عدل و توازن کی منزل پا سکتا ہے۔ غیب پر ایمان اور تجربے پر تحقیق — دونوں کا امتزاج ہی اصل علم ہے۔ یہی علم انسان کو علم کی اس بلندی تک لے جاتا ہے جہاں وہ نہ صرف کائنات کو سمجھتا ہے بلکہ اپنے رب کو پہچانتا ہے۔

عالمی برادری اور خدائی نظام امامت

دنیا میں آج جو سائنسی ترقی، تکنیکی ایجادات اور بلند و بانگ تحقیقی منصوبے چل رہے ہیں، ان کی چمک دمک کے پیچھے ایک بہت بڑی ناانصافی چھپی ہوئی ہے۔ جبکہ ایک طرف ٹیکنالوجی، خلائی تحقیق، آرٹیفیشل انٹیلیجنس، اور بایو انجینئرنگ جیسے میدانوں میں کھربوں ڈالرز خرچ کیے جا رہے ہیں، وہیں دوسری طرف زمین کی 70 فیصد آبادی ایسی ہے جسے بنیادی ضروریاتِ زندگی، جیسے کھانا، لباس، پانی، دوا، اور پناہ، بھی میسر نہیں۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جدید دنیا کا علمی اور تکنیکی نظام اس طرح سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس کا اصل فائدہ چند عالمی طاقتوں، ملٹی نیشنل کمپنیوں، عسکری صنعتی نظام، اور سرمایہ دار ایلیٹ تک محدود ہو جاتا ہے، جبکہ باقی انسانیت غربت، بھوک، اور محرومی کے جہنم میں جھلس رہی ہے۔

یہ سب کچھ کسی حادثاتی یا غیر شعوری عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک طے شدہ استعماری منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ جدید تحقیق اور ٹیکنالوجی کو انسانی خدمت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اسے استحصال، کنٹرول، اور نسلوں کی تباہی کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ سامراجی طاقتیں اپنی خواہشات کے تحفظ اور دنیا پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے ایسے منصوبے بنارہی ہیں جو نہ صرف غریب اقوام کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں بلکہ ان کی آبادی گھٹانے، ثقافتیں مٹانے، معیشتیں کمزور کرنے، اور نسلوں کو روحانی و اخلاقی گمراہی کی طرف دھکیلنے

کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ویکسین، خوراک، پانی، دواؤں، حتیٰ کہ تعلیمی نصاب تک میں وہ زہر چھپایا جارہا ہے جو انسان کی فطرت، روح، اور عزت کو مسخ کر دیتا ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ آج کا عالمی نظام مہربان خدا کے الٰہی نظام سے منہ موڑ چکا ہے۔ خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہادیوں، انبیاء، اور اوصیاء کی تعلیمات کو نظر انداز کر کے دنیا نے اپنے معاملات ان لوگوں کے ہاتھ دے دیے ہیں جو خود خدا کے منکر، انسانیت کے دشمن، اور صرف ذاتی مفادات کے غلام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج زمین پر نہ عدل ہے، نہ امن، نہ رحم، نہ شرافت، نہ حیا، نہ روحانیت۔ جو نظام معصوم بچوں کے لیے خوراک اور دوا میسر نہیں کرتا، مگر اربوں ڈالرز کا اسلحہ بنا کر انسانوں کا قتلِ عام کرتا ہے، وہ کبھی بھی انسانی ہمدردی کا دعویدار نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ پوری انسانیت کو مصنوعی ذہانت کے ذریعے کنٹرول کرنا چاہتے ہیں، وہ دراصل انسانوں کو غلام بنانے کے پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔

خدائی نظام، جو اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات، انبیاء علیہم السلام کی سیرت، اور فطرتِ انسانی کے مطابق ترتیب پاتا ہے، صرف وہی ایسا نظام ہے جو انسان کو اس کے مقام، عزت، اور فطری حقوق تک پہنچا سکتا ہے۔ خدا کی طرف سے منتخب کیے گئے رہنما، وہی حقیقی رحمت اور عدل کے علمبردار ہوتے ہیں جو اپنی خواہش، نسل، قوم، مفاد سے بالاتر ہو کر پوری انسانیت کے لیے خیر و فلاح کا پیغام لاتے ہیں۔

خدائی نظام کی حقانیت اور افضلیت پر تاریخ میں بے شمار روشن مثالیں موجود ہیں، جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ صرف وہی نظام جو اہل بیت علیہم السلام کی امامت اور انبیاء علیہم السلام کی سیرت پر مبنی ہو، انسانیت کو نجات اور عدل و رحمت کا حقیقی راستہ دکھا سکتا ہے۔

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینے میں اسلامی حکومت قائم کی تو یہ حکومت قبیلوں، نسلوں یا علاقائی مفادات پر نہیں بلکہ وحی، عدل، اور اخلاق پر مبنی تھی۔ رسول اللہؐ نے مہاجرین و انصار کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا اور ریاستی قانون کو ذاتی رشتوں پر مقدم رکھا۔ جب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے حق میں بھی عدالتی و حکومتی انصاف قائم نہ رہ سکا تو اہل بیتؑ نے خاموشی سے یہ بتایا کہ خلافت کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اس کا حقیقی عدل پر مبنی ہونا ضروری ہے۔

امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی خلافت بھی خدائی نظام کی عملی مثال تھی۔ جب ایک غیر مسلم عورت کی کلائی سے زبردستی زیور اتار لیا گیا تو امامؑ کے نزدیک یہ اتنا بڑا ظلم تھا کہ فرمایا: "اگر کوئی اس خبر پر مر جائے تو بجا ہے۔" اور جب اپنے بھائی عقیل نے بیت المال سے زائد حصہ مانگا تو آپ نے جلتی ہوئی لوہا ان کی طرف بڑھا دیا اور فرمایا کہ اگر دنیا کا مال چاہتے ہو تو یہ آگ برداشت کرو۔ یہاں امامؑ نے یہ ثابت کیا کہ خدا کا نظام اقربا پروری یا سیاسی مفادات پر نہیں بلکہ عدل مطلق پر قائم ہوتا ہے۔

واقعہ کربلا بھی اسی خدائی نظام کی ایک نمایاں مثال ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے ایک ظاہری فاسق اور جابر حکومت کو یہ کہہ کر چیلنج کیا کہ "مثلی لایبایع مثلہ" یعنی "میرے جیسا شخص، اس جیسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا۔" امامؑ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا مگر ظالم کے ہاتھ پر بیعت نہ کی، کیونکہ یزید کا نظام انسانی فطرت، قرآن، اور نبوی سنت کے بر خلاف تھا۔ کربلا میں دین کو اقتدار کے بجائے قربانی، سچائی، اور اخلاق سے بچایا گیا۔

ایک اور مثال امام سجادؑ کی دعاؤں میں دکھائی دیتی ہے۔ جب ظاہری حکومت ظالموں کے ہاتھ میں تھی، امامؑ نے صحیفہ سجادیہ کے ذریعے اندرونی اصلاح، بندگی، اور خدا کی طرف رجوع کا ایسا نظام پیش کیا جو فطرتِ انسانی اور انبیائی حکمتوں سے مکمل ہم آہنگ ہے۔ اسی طرح امام جعفر صادقؑ کے دور میں، جب بنو امیہ اور بنو عباس کی ظالم حکومتیں فقہ اور شریعت کو سیاست کا آلہ بنائے ہوئے تھیں، امامؑ نے ایک ایسا تعلیمی و فکری نظام قائم کیا جس نے ہزاروں شاگردوں کی تربیت کی، جن میں ابو حنیفہ و مالک بھی شامل تھے۔ امام صادقؑ کا یہ علمی انقلاب بھی بتاتا ہے کہ خدائی نظام ظلم کے رد اور انسان کے فطری ارتقاء کے لیے کیسے کام کرتا ہے۔

لہٰذا اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ جب تک دنیا کے مظلوم، مفکر، متقی، مخلص اور بیدار انسان ایک آواز ہو کر دنیاوی، قومی، لسانی، مسلکی، اور گروہی اختلافات کو پسِ پشت ڈال کر خدا کے منتخب کردہ رہبر کے جھنڈے تلے جمع نہیں ہوں گے، تب تک ظلم کا یہ عالمی نیٹ ورک مسلسل طاقت پکڑتا رہے گا اور انسانیت کو فنا کی طرف لے جاتا رہے گا۔ خدا کا عدل، اس کا نور، اس کی رحمت تب ہی ظاہر ہو گی جب زمین پر اس کا نمائندہ نظام قائم ہو گا۔ اور یہ نمائندہ نظام صرف وہی لائے گا جو خود خدا کی طرف سے منتخب، معصوم، اور خالصتاً انسانیت کا خیر خواہ ہو گا۔

لہٰذا جو لوگ واقعی انسانیت کے ہمدرد ہیں، ان کے لیے لازمی ہے کہ وہ صرف وقتی و سطحی اصلاحات پر قناعت نہ کریں بلکہ اس عالمی فکری و تہذیبی نظام کو چیلنج کریں جو خدا کے خلاف بغاوت پر کھڑا ہے۔ اسی فکری بغاوت کو زیر کرنے کے لیے ہمیں الٰہی نظام، روحانی تربیت، اخلاقی قیادت، اور فطری معاشرت کی طرف لوٹنا ہو گا۔ کیونکہ اگر انسان نے وقت

پر اپنے اصل کو نہ پہچانا تو وہ مشینوں، سرمایہ داروں، اور دھوکہ باز حکمرانوں کا دائمی غلام بن جائے گا۔ اور یہی وہ زنجیر ہے جسے توڑنا، ہر بیدار انسان کی ذمہ داری ہے۔

نفاق کے اسباب اور علاج

نفاق یعنی دورخی، قول و فعل میں تضاد، ظاہر و باطن کے درمیان فاصلہ اور دل میں کفر چھپا کر ایمان کا اظہار کرنا، ایک ایسا مرض ہے جو فرد کے باطن کو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے اور معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ نفاق محض ایک اعتقادی یا اخلاقی خرابی نہیں بلکہ ایک اجتماعی ناسور ہے جو اگر تعلیم و تربیت کی روشنی سے دور رہے تو پورے سماج کو بے اعتمادی، فریب، دوغلے پن اور باطنی انتشار میں مبتلا کر دیتا ہے۔ تعلیم و تربیت نفاق کے اس گہرے مرض کا علاج اس طرح کر سکتی ہے کہ وہ انسان کی شناخت، نیت، عمل، اور تعلقات کو سچائی، اخلاص، اور شعور کی بنیاد پر استوار کرے۔ اس مقصد کے لیے تعلیم کو صرف معلومات کی ترسیل اور ڈگری کے حصول کا ذریعہ نہیں بلکہ تزکیہ نفس، تشکیل شخصیت اور تعمیر معاشرہ کا آلہ بنایا جائے۔

سب سے پہلا قدم عقیدے کی درستگی ہے۔ نفاق کی جڑیں اس وقت گہری ہوتی ہیں جب انسان کا ایمان سطحی اور موروثی ہوتا ہے، محض ظاہری عبادات و رسومات پر قائم ہوتا ہے، اور دل میں یقین، معرفت اور خوفِ خدا کی جگہ خود غرضی، مصلحت اور دنیا پرستی ہوتی ہے۔ اگر تعلیم اس بات پر زور دے کہ ایمان محض زبانی دعویٰ نہیں بلکہ ایک زندہ شعور ہے جو انسان کے پورے طرزِ فکر اور عمل پر اثر انداز ہوتا ہے، تو نفاق کا پہلا مورچہ ٹوٹ سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیمات اور سیرتِ معصومینؑ کو جب تعلیمی نصاب کا مرکزی حصہ بنایا جائے، اور

ان کے ذریعے طہارتِ باطن، تقویٰ، خدا کی رضا اور اخلاص جیسے مفاہیم کو دل نشین کیا جائے، تو نوجوان نسل نفاق کے داخلی اسباب کو پہچان کر ان کا تدارک سیکھ سکتی ہے۔

دوسرا مرحلہ تربیت کا ہے، جو تعلیم سے کہیں زیادہ حساس اور موثر پہلو رکھتی ہے۔ تربیت کا مطلب صرف آداب سکھانا یا نظم و ضبط پیدا کرنا نہیں بلکہ ایک ایسا اخلاقی ماحول فراہم کرنا ہے جس میں فرد سچ بولنے، وعدہ نبھانے، ذمہ داری اٹھانے اور اپنے ظاہر و باطن کو ہم آہنگ رکھنے کی عملی مشق کرے۔ نفاق اکثر اس وقت جنم لیتا ہے جب انسان کسی دباؤ، خوف، یا لالچ کے تحت اپنے اصل خیالات اور جذبات کو چھپاتا ہے۔ تربیت کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ افراد میں وہ اخلاقی جرات پیدا کی جائے جو انہیں حق گوئی، صداقت اور باطن کی اصلاح پر آمادہ کرے۔ یہ اساتذہ، والدین اور رہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ خود اپنے طرزِ عمل سے اخلاص، صدق، وعدہ وفا، اعتماد اور دیانت کی مثال بنیں، تاکہ سیکھنے والے محض الفاظ نہیں بلکہ زندہ نمونے دیکھ کر سیکھیں۔

نفاق کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ تعلیم اکثر طبقاتی امتیاز، مادہ پرستی، نمود و نمائش، اور دنیاوی کامیابیوں کو اصل ہدف بنا دیتی ہے، جبکہ سچائی، قربانی، صبر، عاجزی، اور خدا ترسی جیسے اوصاف کو کم تر دکھاتی ہے۔ ایسی تعلیم نفاق کو نہ صرف نظر انداز کرتی ہے بلکہ بعض اوقات اسے تقویت دیتی ہے، کیونکہ فرد سچ چھپا کر، دکھاوا کر کے، اور دورخی سے فائدہ حاصل کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اس لیے تعلیم کو صرف عقل اور معلومات کی نہیں بلکہ ضمیر، دل، اور نیت کی تطہیر کا ذریعہ بنانا ہو گا۔ ایسے دروس اور سرگرمیاں شامل کی جانی چاہئیں جن میں طلبہ کو اپنے باطن کا محاسبہ کرنے، اپنے اندرونی تضادات کو پہچاننے، اور اپنے اعمال کی نیت کو پرکھنے کی عادت ڈالی جائے۔

معاشرتی سطح پر بھی تعلیم و تربیت کو اس طرح ڈھالا جائے کہ معاشرہ نفاق کو برا جانے، اس کی علامات پہچانے، اور نفاق سے محفوظ رہنے والے افراد کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھے۔ اگر ایک بچہ یہ دیکھتا ہے کہ سچ بولنے والے کو سزا اور دوغلا بننے والے کو انعام ملتا ہے، تو وہ نفاق کی راہ اپنائے گا۔ لیکن اگر وہ دیکھے کہ دیانت دار، سادہ، اور با اخلاق افراد کو عزت و اعتماد دیا جاتا ہے، تو وہ بھی انہی اوصاف کو اپنانے کی کوشش کرے گا۔ تعلیم کو اس فکری، اخلاقی، اور عملی سطح پر نفاق کی مذمت، اور اخلاص و صداقت کی ترویج کے لیے استعمال کیا جائے۔

نفاق کا علاج صرف فرد کی سطح پر نہیں بلکہ ایک پوری تہذیبی، فکری، اور روحانی جدوجہد سے ممکن ہے۔ تعلیم و تربیت کا اصل ہدف ایک ایسا انسان پیدا کرنا ہے جو اپنے ضمیر، ایمان، اور کردار میں یکرنگ ہو۔ ایسا انسان جو زبان سے وہی بولے جو دل میں ہو، جو نیت میں خدا کے سوا کسی کا لحاظ نہ رکھے، اور جس کی تعلیم اس کے عمل، اور اس کا ظاہر اس کے باطن کا آئینہ ہو۔ جب تک تعلیم و تربیت کا مقصد یہ نہ بنے، نفاق معاشروں میں پلتا رہے گا۔ لیکن جب تعلیم سچائی کو رواج دے اور تربیت اخلاص کو فروغ دے، تب نفاق دم توڑ دے گا اور سچ، خیر اور عدل کا نور معاشرے کو روشن کر دے گا۔

سختی، درشت رویہ، اور بے لچک مزاج نفاق کی پائیداری کے لیے نہایت سازگار ماحول فراہم کرتے ہیں، کیونکہ یہ افراد کو سچ بولنے، اندرونی کیفیت ظاہر کرنے، اور اپنے دل کی بات بیان کرنے سے روکتے ہیں۔ جب کوئی فرد محسوس کرتا ہے کہ سچ کہنے یا اختلاف ظاہر کرنے پر اسے تنقید، تذلیل، یا سزا کا سامنا کرنا پڑے گا، تو وہ اپنے باطن کو چھپانا سیکھتا ہے اور ظاہری موافقت کی ایک نقاب اوڑھ لیتا ہے۔ یہی رویہ نفاق کی پہلی سیڑھی بن جاتا ہے۔

جب کوئی رہنما، استاد، والد، یا سماجی نظام سخت گیر ہو، اور برداشت، شفقت اور گفت و شنید کی گنجائش نہ ہو، تو لوگ ظاہری طور پر اطاعت، تعریف، اور وفاداری کا مظاہرہ کرتے ہیں، مگر دل میں نفرت، اختلاف، یا بداعتمادی رکھتے ہیں۔ یہ باطنی و ظاہری دوگانگی نفاق کو گہرا کرتی ہے۔ سختی انسان کو منافق اس لیے بناتی ہے کیونکہ وہ بظاہر وہی بات کہتا ہے جو سننے والا پسند کرتا ہے، لیکن حقیقتاً وہ اس سے متفق نہیں ہوتا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے، چاپلوسی کرتا ہے، اپنی اصل شناخت چھپاتا ہے، اور یہ سب اس لیے کہ اسے رد کیے جانے یا سزا دیے جانے کا خوف ہوتا ہے۔

نبی کریمؐ اور آئمہ معصومینؑ کا طرزِ تربیت اس کے برعکس تھا۔ انہوں نے نرمی، حلم، تحمل، اور گفتگو کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے تاکہ لوگ بلاخوفِ ملامت اپنی غلطیاں تسلیم کریں، اپنے دل کے حال بیان کریں، اور اصلاح کی راہ اختیار کریں۔ درشت مزاجی صرف ظاہری نظم پیدا کرتی ہے، جبکہ نرمی انسان کے باطن تک رسائی دیتی ہے۔ جب انسان کو سنا جاتا ہے، سمجھا جاتا ہے، اور شفقت سے اس کی اصلاح کی جاتی ہے، تو وہ نفاق کی بجائے اخلاص کی راہ پر آتا ہے۔

اسی طرح اجتماعی و تعلیمی نظام میں بھی جب سختی اور جبر غالب ہو جائے تو طلبہ، کارکنان، یا شہری اندرونی خیالات چھپاتے ہیں، نظام سے دلی طور پر جدا ہو جاتے ہیں، اور محض دکھاوے کے طور پر ساتھ نبھاتے ہیں۔ اس ماحول میں ریاکاری، چالاکی، اور جھوٹ فروغ پاتا ہے، اور سچائی، دیانت، اور نیت کی پاکیزگی ناپید ہونے لگتی ہے۔

پس، درشتی اور سختی نفاق کے بیج بوتی ہے، اور نرمی، محبت اور خلوص اس کے علاج کا پہلا زینہ ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ سچائی دلوں سے زبانوں تک پہنچے اور معاشرے اخلاص سے

معمور ہوں، تو ہمیں اپنے رویے نرم، فضا شفاف، اور سچ برداشت کرنے والا ماحول پیدا کرنا ہو گا۔

نفاق کا علاج محض نصیحت سے نہیں بلکہ ایسی تعلیم و تربیت سے ممکن ہے جو فرد کے ظاہر و باطن کو یکساں بنائے، سچ بولنے کا حوصلہ دے، اور سماج کو ایسا اخلاقی ماحول فراہم کرے جہاں نرمی، برداشت اور اخلاص کو فروغ ملے۔ جب تعلیم تزکیہ نفس کا ذریعہ بنے اور تربیت میں شفقت غالب ہو، تبھی معاشرہ نفاق سے نجات پا کر سچائی، اعتماد اور روحانی یکجہتی کی طرف گامزن ہو سکتا ہے۔

تیسری دنیا میں استعماری سیاست اور اسلامی حکومت کے فوائد

تیسری دنیا کی سیاست کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ایک الگ تہذیبی، تاریخی اور عالمی سیاق میں پرکھا جائے۔ یہ سیاست نہ صرف داخلی طور پر پیچیدہ ہے بلکہ بیرونی طاقتوں کے دیرینہ عزائم کا شکار بھی ہے۔ تیسری دنیا کی ریاستیں محض کمزور معیشت یا ناپختہ جمہوریت کی وجہ سے بحرانوں میں مبتلا نہیں، بلکہ ان کے وجود کی بنیاد ہی ایک ایسے نظام پر رکھی گئی ہے جو ان کی خودمختاری، خوداعتمادی اور داخلی استحکام کو مسلسل چیلنج کرتا رہا ہے۔ استعماری طاقتوں نے صدیوں پر محیط قبضے کے دوران ان خطوں کو محض معاشی لوٹ مار کا شکار نہیں بنایا، بلکہ ان کی تہذیبی شناخت، مقامی ادارے اور سیاسی وحدت بھی مسخ کر دی۔ اس بگاڑ کا اثر صرف ماضی تک محدود نہیں رہا، بلکہ آزادی کے بعد بھی نئی ریاستیں انہی استعماری ساختوں کی وارث بن کر میدان میں آئیں، جو عوام سے کٹی ہوئی، مقامی روایت سے بیگانہ اور طاقت کے عالمی مراکز سے بندھی ہوئی تھیں۔

یہ ریاستیں اکثر ایسی سرحدوں میں مقید ہوئیں جو قدرتی، لسانی یا ثقافتی وحدت پر مبنی نہ تھیں بلکہ بڑی طاقتوں کے نقشے پر کھینچی ہوئی تھیں۔ نتیجتاً ان کے اندرونی ڈھانچے ہم آہنگی کی بجائے ٹکراؤ، عدم اعتماد اور نسلی و لسانی تعصبات سے بھر گئے۔ ان ریاستوں کے لیے سب سے بڑا چیلنج صرف عوام کی بھلائی یا فلاحی نظام کا قیام نہ تھا، بلکہ اپنی بقا، جائز سیاسی حیثیت اور داخلی اتحاد کو قائم رکھنا تھا۔ ان کے ادارے، جنہیں آزادی کے بعد خودمختاری کا ہتھیار ہونا

تھا، استعماری دور کے انتظامی آلات کے طور پر باقی رہے، جو طاقت کے ذریعے حکومت کرتے تھے نہ کہ عوامی شرکت کے ذریعے۔

ان ریاستوں میں سیاست محض عوامی خدمت یا قومی ترقی کا منصوبہ نہیں رہی، بلکہ اقتدار کا مطلب ریاستی وسائل پر قبضہ، عالمی اداروں سے رعایت حاصل کرنے کی صلاحیت، اور اندرونی دھڑوں کو مطمئن رکھنے کی فنکاری بن گئی۔ اسی پس منظر میں فوجی آمریتیں، قبائلی وفاداریاں، خاندانی سیاست اور شخصیت پرستی ابھریں۔ جمہوریت جب بھی متعارف کروائی گئی، تو وہ اس انداز سے کی گئی کہ عالمی طاقتیں اپنی گرفت برقرار رکھ سکیں۔ انتخابی نظام، آئین سازی اور حکومتی ڈھانچے اس طرح تشکیل دیے گئے کہ وہ مغربی اصولوں کی مشابہت رکھتے ہوں، لیکن مقامی معاشرتی ڈھانچوں سے ہم آہنگ نہ ہوں۔

استعماری عزائم نے صرف ماضی میں زمینوں اور وسائل پر قبضہ نہیں کیا بلکہ آج کے دور میں انہوں نے عالمی معیشت، مالیاتی ادارے، قرضے، تکنیکی مدد، اور سیکیورٹی معاہدات کے ذریعے تیسری دنیا کی ریاستوں کو ایک نئی غلامی کے قالب میں جکڑ رکھا ہے۔ یہ ریاستیں اکثر اس مقام پر کھڑی ہوتی ہیں جہاں انہیں اپنی بقا کے لیے انہی طاقتوں سے مدد لینا پڑتی ہے جنہوں نے ان کے وجود کو غیر فطری، غیر مستحکم اور غیر خود مختار بنایا تھا۔ یہی وہ عالمی جبر ہے جو تیسری دنیا کی سیاست کو اندرونی طور پر شکستہ اور بیرونی طور پر وابستہ رکھتا ہے۔

تیسری دنیا کی سیاست میں اکثر جو بدعنوانی، بیوروکریسی کا جبر، انسانی حقوق کی پامالی، اور عوامی محرومی دیکھی جاتی ہے، وہ محض مقامی حکمرانوں کی ناکامی نہیں بلکہ اس عالمی نظام کا شاخسانہ ہے جو ان ریاستوں کو کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے ہی نہیں دیتا۔ جب ریاستوں کی داخلی پالیسیاں بین الاقوامی اداروں کے قرضوں، امدادی پیکجوں، اور سفارتی دباؤ سے طے ہونے

لگیں تو ان میں خود مختار سیاست کیسے پنپ سکتی ہے؟ اسی نظام میں طاقتور اقوام کمزور ریاستوں کو ترقی کے خواب دکھا کر ان کے وسائل، محنت اور خودداری کو مزید مقروض کر دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تیسری دنیا کی سیاست کو محض جمہوریت کے ناپختہ تجربے یا کرپشن کے تناظر میں دیکھنا ایک سطحی تجزیہ ہوگا۔ درحقیقت یہ سیاست ایک مسلسل مزاحمت ہے — ایسی مزاحمت جو عالمی طاقتوں کے تسلط، معاشی جبر، اور سیاسی عدم مساوات کے خلاف لڑی جا رہی ہے۔ اس مزاحمت میں کامیابی صرف اس وقت ممکن ہے جب یہ ریاستیں اپنی سیاسی خودی کو دوبارہ دریافت کریں، استعماری ساختوں کو رد کریں، مقامی روایات سے جڑیں، اور اپنی داخلی خودمختاری کو کسی بھی عالمی دباؤ سے بالاتر سمجھیں۔ بصورت دیگر، تیسری دنیا کی سیاست ایک ایسا دائمی بحران بنی رہے گی، جس میں ہر تبدیلی دراصل اسی جبر کی نئی شکل ہوگی۔

تیسری دنیا کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی بحرانوں کا حل صرف ظاہری اصلاحات یا بیرونی ماڈلز کی نقالی میں نہیں بلکہ ایک ایسے جامع اور فطری نظام کی طرف واپسی میں ہے جو انسانی فطرت، عدل، روحانی اخلاق اور اجتماعی خیر کو یکجا کر سکے۔ دنیا نے مختلف ماڈلز آزما لیے ہیں: لبرل جمہوریت، سرمایہ داری، سوشلسٹ ریاست، قومی قومیت، آمریت، حتیٰ کہ اقوام متحدہ جیسے عالمی اداروں پر بھی انحصار کیا، لیکن نتیجہ آج بھی تیسری دنیا کے لیے استحصال، عدم استحکام، بداعتمادی، غربت، اور مسلسل محتاجی کی صورت میں سامنے ہے۔ اب وقت آ چکا ہے کہ تیسری دنیا کے مسائل کو اُن اصولوں کی بنیاد پر حل کیا جائے جو نہ صرف خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ انسانی عقل و فطرت کو رہنمائی کا مقام دیتے ہوئے ایک

منظم، باوقار اور عدل پر مبنی حکومت کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ ماڈل ہے جو اسلامی نظامِ ولایت فقیہ کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

ولایت فقیہ محض ایک مذہبی حکومت نہیں بلکہ ایک جامع نظریہ حاکمیت ہے جس کی بنیاد توحید، عدل، عقل، وحی اور انسان کی فطری کرامت پر رکھی گئی ہے۔ اس نظام میں نہ تو اقتدار محض اکثریت کی خواہش کا تابع ہوتا ہے، اور نہ طاقت کا سرچشمہ کسی مخصوص طبقے، نسل یا جماعت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ یہاں حاکمیت اللہ کی ہے، اور انسانی معاشرہ اس حاکمیت کو ایک فقیہِ عادل، عالم، مجتہد، بصیر اور ولی کی قیادت میں نافذ کرتا ہے، جو نہ صرف دینی احکام کا ماہر ہوتا ہے بلکہ اپنے زمانے کے سیاسی، معاشی، تہذیبی، اور سماجی تقاضوں کا بھی شعور رکھتا ہے۔ اس کا کردار محض شرعی فتوے دینا نہیں بلکہ پورے معاشرے کو عدل، امن، خودانحصاری، اور ایمانی بیداری کی بنیاد پر قائم رکھنا ہوتا ہے۔

تیسری دنیا میں آج جو بنیادی مسئلہ درپیش ہے وہ قیادت کا بحران ہے: قیادت جو نہ تو خود باکردار ہے، نہ عوام سے جڑی ہوئی، اور نہ ہی عالمی استعمار سے آزاد۔ ولایت فقیہ کا ماڈل اس قیادت کے بحران کو براہِ راست چیلنج کرتا ہے کیونکہ یہ ایسی قیادت پیش کرتا ہے جو عوام کی حقیقی نمائندہ ہو، ان کی زندگی کی مادی و معنوی دونوں ضروریات کی ضامن ہو، اور عالمی جبر کے مقابلے میں امت کی عزت و خودی کا تحفظ کر سکے۔ اس نظام میں حکومت کی غایت صرف قانون سازی یا نظام چلانا نہیں بلکہ انسانی معاشرے کو الٰہی اہداف کی طرف تربیت دینا بھی ہے۔

اس نظام کے اندر امت کا شعور بیدار ہوتا ہے، کیونکہ وہ کسی بیرونی استعمار کے نظام کو نافذ نہیں دیکھتے بلکہ ایک ایسا نظام دیکھتے ہیں جو ان کی دینی روح، تہذیبی شناخت اور اخلاقی اقدار

سے مکمل ہم آہنگ ہے۔ جب انسان اپنی تہذیبی خودی کے اندر سے اُٹھنے والے نظام کو قبول کرتا ہے تو پھر وہ صرف پیروکار نہیں رہتا بلکہ صاحبِ اختیار اور فعال شہری بن جاتا ہے۔ یہی تبدیلی وہ ہے جو تیسری دنیا کو محض ترقی کے اعداد و شمار سے نکال کر ایک معنوی انقلاب کی طرف لے جاسکتی ہے۔

ولایت فقیہ کا نظام تیسری دنیا کے لیے ایک نجات دہندہ ماڈل بن سکتا ہے کیونکہ یہ عالمی طاقتوں کی چالوں سے آزاد، اپنی عوام پر اعتماد کرنے والا، اندرونی خود انحصاری کو فروغ دینے والا، اور ظلم کے خلاف قیام کی ہمت رکھنے والا نظام ہے۔ اس میں طاقت کا توازن صرف دنیاوی معیاروں پر نہیں بلکہ الٰہی تقویٰ، علمی اجتہاد اور اجتماعی عدل پر استوار ہوتا ہے۔ یہ نظام استعمار کے خلاف مزاحمت کو صرف نعرہ نہیں بلکہ عملی حکمتِ عملی بناتا ہے، اور اپنے پیروکاروں کو نظریاتی، عسکری، سماجی اور ثقافتی میدانوں میں خودکفیل بنانے کی راہ دکھاتا ہے۔

یہ ماڈل صرف ایران میں نہیں بلکہ ہر اس قوم کے لیے قابل تطبیق ہے جو استعماری جبر سے نجات چاہتی ہو، اپنے وسائل پر اختیار چاہتی ہو، اور اپنے تہذیبی نظام کو زندہ کرنا چاہتی ہو۔ یہ ماڈل عوام کی شرکت کو مسترد نہیں کرتا بلکہ اس میں عوام ایک باشعور امت کے طور پر ابھرتے ہیں جو محض ووٹر نہیں بلکہ امتِ واحدہ کے کارکن بنتے ہیں، جو الٰہی نظام کے قیام کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

اس وقت جب تیسری دنیا عالمی نظام کی غلامی، ثقافتی انحطاط، اور داخلی شکست وریخت کا شکار ہے، ولایت فقیہ ایک ایسی روشنی ہے جو نہ صرف اسلامی معاشروں کو نئی زندگی دے سکتی ہے بلکہ عالمی استعمار کو چیلنج کرنے والا ایک نظریاتی و عملی نظام بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس

کی کامیابی کا راز اس کی خدا پرستی، عوام دوستی، علمی بنیاد، اور ایمانی قیادت میں پوشیدہ ہے۔
یہی وہ اوصاف ہیں جو تیسری دنیا کی ملتوں کو درکار ہیں تاکہ وہ دوبارہ باعزت، بااختیار اور باکردار امت بن سکیں۔

وسیلہ وہدف کا فرق

انسان کی زندگی ایک مسلسل سفر ہے، جو مختلف منزلوں اور مرحلوں پر مشتمل ہے۔ اس سفر میں انسان نہ صرف ظاہر میں فاصلہ طے کرتا ہے بلکہ اس کے باطن میں بھی ایک ارتقائی کیفیت جاری رہتی ہے۔ یہ ارتقاء، اگرچہ بسا اوقات محسوس نہیں ہوتا، مگر انسان کی نیت، فکر، عقیدہ، عمل اور رجحان میں اس کا اظہار مسلسل ہوتا رہتا ہے۔ اس سیاق میں "وسیلہ" اور "ہدف" کا فرق محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ ایک بنیادی فکری و معنوی تمایز ہے، جس کی صحیح شناخت انسانی شخصیت کی گہرائی، اس کی دنیا و آخرت کی کامیابی، اور حتیٰ کہ اس کے عمل کی شرعی و اخلاقی حیثیت کا تعین کرتی ہے۔

وسیلہ ایک ذریعہ ہوتا ہے، ایک پل، ایک راستہ جس کے ذریعے انسان کسی بڑے مقصد یا ہدف تک پہنچنا چاہتا ہے۔ جبکہ ہدف وہ اعلیٰ غایت یا مطلوبہ منزل ہوتی ہے جس تک پہنچنا مقصود ہوتا ہے۔ اگر انسان وسیلے کو ہدف سمجھ لے، تو وہ راستے میں ہی رک جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض اوقات گمراہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان کسی باطل چیز کو ہدف سمجھ لے، تو وہ نہ صرف اپنی قوت کو ضائع کرتا ہے بلکہ اپنی فطرت، دین اور عقل سے بھی دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ تمیز کہ کیا چیز وسیلہ ہے اور کیا چیز ہدف، ہر باشعور انسان کے لیے ضروری ہے، خصوصاً اس انسان کے لیے جو دینی فہم، اخلاقی بیداری اور روحانی تکامل کا خواہاں ہو۔

مال، دولت، شہرت، طاقت، علم، وقت، صلاحیت، حتیٰ کہ خود عبادات — ان میں سے اکثر اپنی اصل میں وسیلہ ہیں، نہ کہ ہدف۔ مگر انسان کا نفس، دنیا کی چمک دمک، اور شیطان کی لطیف چالیں انسان کو وسیلے کو ہدف سمجھنے پر اکسا دیتی ہیں۔ نتیجتاً انسان مال کو جمع کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیتا ہے، شہرت کی طلب میں اپنا سکون و کردار تباہ کر دیتا ہے، یا بعض اوقات علم و عبادت کو ہی اپنی برتری اور فخر کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ حالانکہ ان تمام اشیاء کا مقام صرف اتنا ہے کہ یہ انسان کو حقیقی ہدف — یعنی اللہ کی رضا، قربِ الٰہی، اور انسانِ کامل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی فطری کمال کی طرف بڑھنے — کا ذریعہ بنیں۔

قرآن مجید اور احادیث اہل بیتؑ میں متعدد مواقع پر اسی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً قرآن کہتا ہے: وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ" — اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو" (سورۃ المائدہ 35)، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی رضا اور قربت اصل ہدف ہے، اور اس کے حصول کے لیے ذریعہ اختیار کرنا لازم ہے۔ یہی وسیلہ عبادت ہو سکتی ہے، نیک اعمال ہو سکتے ہیں، اہل بیتؑ کی محبت و پیروی ہو سکتی ہے، یا کوئی بھی جائز شرعی و اخلاقی راستہ جو انسان کو اس منزل کی طرف لے جائے۔

اہل بیتؑ کی سیرت ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ خود دین بھی انسان کی ہدایت کا ذریعہ ہے، نہ کہ کسی گروہی یا نسلی فخر کا ہدف۔ امام حسینؑ نے کربلا میں دین کو وسیلہ بنایا تاکہ حق کو زندہ اور باطل کو رسوا کریں۔ اگر دین کو طاقت کے حصول کا ہدف بنا لیا جاتا، تو وہ عمل کربلا نہ بنتا بلکہ یزیدیت کا نمونہ ہوتا۔

اسی طرح آج کے دور میں جدید دنیا کی اقتدار، تعلقات، سہولیات، ترقی، ٹیکنالوجی اور تعلیمی نظامات کو دیکھیں تو ہمیں احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ سب چیزیں جب تک وسیلہ رہیں گی،

یعنی انسان کی فلاح، عدل، ہدایت، علم، خدمت اور قربِ الٰہی کے لیے استعمال ہوں گی، تب تک یہ نعمت ہیں۔ مگر جب یہی چیزیں مقصد بن جائیں، تو انسان اپنی حقیقت سے کٹ جاتا ہے۔ وہ تعلیم جو انسان کو خدا سے قریب کرنے کے بجائے مادیت پرست بنادے، وہ علم نہیں بلکہ محض معلومات ہے۔ وہ ترقی جو انسان کو اپنی ذات کا پجاری بنادے، وہ تنزلی ہے نہ کہ فلاح۔

وسیلہ و ہدف کے اس فرق کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں کئی معاشرتی، دینی، سیاسی، اور انفرادی مسائل جنم لیتے ہیں۔ انسان دکھائی دینے والے عوامل کی پرستش کرنے لگتا ہے، دل سے اللہ کی بندگی کمزور ہو جاتی ہے، نیت میں اخلاص باقی نہیں رہتا، اور نتیجتاً عمل اپنی روح کھو بیٹھتا ہے۔ وہ نماز جو اللہ کے قرب کا ذریعہ تھی، ریاکاری کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وہ علم جو تزکیہ نفس کا ذریعہ تھا، تکبر و برتری کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اور وہ سیاست جو عدل کے قیام کے لیے تھی، مفادات کا ہدف بن جاتی ہے۔

لہٰذا اس فرق کو سمجھنا اور اپنی زندگی میں اس کی بنیاد پر ہر شے کا جائزہ لینا نہایت ضروری ہے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے اعمال، نیتوں، ترجیحات اور رجحانات پر نظر ڈالے کہ کیا وہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ کسی اعلیٰ ہدف کے حصول کا ذریعہ ہے یا اس نے محض ایک وسیلے کو اپنا مقصود بنالیا ہے۔ یہ محاسبہ ہی اصل تزکیہ ہے، اور یہی شعور انسان کو اس کے رب، اس کی فطرت، اور اس کے مقصدِ تخلیق سے جوڑتا ہے۔

اگر ہم دنیا و دین، فرد و معاشرہ، عقل و وحی، سب کو اس نظر سے دیکھیں کہ اصل ہدف کیا ہے اور کیا چیز صرف راستہ ہے، تو نہ صرف ہماری فکری دنیا میں انقلاب آئے گا بلکہ ہماری عملی زندگی بھی توازن، بصیرت اور روحانی رشد سے مزین ہو جائے گی۔ اور یہی وہ راہ ہے جو

انسان کو عبدیت کے اعلیٰ مقام تک لے جاتی ہے، جہاں نہ وسیلے کی پرستش رہتی ہے، نہ ہدف سے غفلت، بلکہ سب کچھ اللہ کے لیے، اللہ کے حکم سے، اور اللہ تک پہنچنے کے لیے ہوتا ہے۔

جب اسلامی نظامِ ولایت فقیہ کو جدید عالمی مسائل میں ایک ممکنہ حل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے تو اکثر سوالات، اعتراضات اور فکری اشکالات جنم لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر ولایت فقیہ کے تحت قائم حکومتیں بھی طاقت کے استعمال میں وہی طرزِ عمل اپناتی ہیں جو مغربی استعماری طاقتیں اپناتی ہیں، تو پھر ان میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ کیا دشمن جیسی جنگی حکمتِ عملی، منظم نیٹ ورکس، اور عالمی سطح پر اثرورسوخ کے لیے پروکسیز قائم کرنا کسی اسلامی نظام کو بھی اسی صف میں لا کھڑا نہیں کرتا جس میں مغربی سامراجی طاقتیں کھڑی ہیں؟ یہ اعتراض بظاہر گہری فکری بنیاد رکھتا ہے، لیکن درحقیقت یہ طاقت، سیاست، اور اخلاقیات کے باہمی تعلق کو سطحی نظر سے دیکھنے کا نتیجہ ہے۔

طاقت بذاتِ خود نہ اچھی ہوتی ہے نہ بری؛ وہ ایک وسیلہ ہے، ایک ذریعہ ہے، ایک امکان ہے جس کی نوعیت اور سمت کا تعین اس کے پیچھے موجود نظریے، اخلاقیات، نیت اور ہدف سے ہوتا ہے۔ ایک تلوار سے معصوموں کا قتل بھی کیا جا سکتا ہے اور اسی تلوار سے مظلوموں کا دفاع بھی کیا جا سکتا ہے۔ ایک منظم نظام، ایک مضبوط قیادت، اور ایک منضبط ادارہ جاتی ڈھانچہ اگر استعمار کے ہاتھ میں ہو تو وہ انسانیت کا خون بہاتا ہے، اور اگر یہی چیز کسی الٰہی، عدل پرور اور متقی قیادت کے زیرِ اثر ہو تو وہ انسانیت کو بچاتا ہے۔ فرق طرزِ عمل میں نہیں، روحِ عمل میں ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے معترضین اکثر اس فرق کو نظر انداز کرتے

ہیں اور طاقت کے استعمال کو فی نفسہٖ ایک استعماری عمل سمجھ لیتے ہیں، خواہ وہ کسی مظلوم کی حمایت میں کیوں نہ ہو۔

اسلامی نظامِ ولایت فقیہ طاقت کو محض اقتدار کی بنیاد نہیں بناتا، بلکہ اسے امانت اور فریضہ قرار دیتا ہے۔ اس کی بنیاد نہ نسلی برتری پر ہے، نہ قومی مفادات پر، نہ سرمائے کے ارتکاز پر، بلکہ انسان کے کرامت بھری وجود، عدلِ الٰہی کی تجلی، اور مظلومین کی نصرت پر ہے۔ جب یہ نظام خطے کے مظلوم عوام کی حمایت کرتا ہے، خواہ وہ عراق کے زائر ہوں یا شام کے پناہ گزین، لبنان کے مجاہد ہوں یا یمن کے بھوکے بچے، تو وہ اس لیے نہیں کہ اس سے اس کی سیاسی طاقت بڑھے گی، بلکہ اس لیے کہ خدا نے اسے ظالم کے خلاف اور مظلوم کے ساتھ کھڑا ہونے کا فریضہ سونپا ہے۔ یہ طاقت ایک ایسی قیادت کے ہاتھ میں ہے جو خود شہادت، زہد، تقویٰ، علمی بصیرت، اور عوامی وابستگی کی مثال ہے، نہ کہ وہ قیادت جو سرمایہ داروں، اسلحہ فروشوں، یا ملٹی نیشنل کمپنیوں کی پروردہ ہو۔

یہ درست ہے کہ جنگ کے میدان میں، سیاسی معاملات میں، یا بین الاقوامی تعلقات میں کچھ ٹیکٹیکل اور انتظامی حکمتِ عملیاں ایک جیسی ہو سکتی ہیں۔ دشمن جیسی صف بندی، خندق بندی، یا اسٹریٹجک رسد کے ذرائع کا استعمال، جنگی منطق کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ مشابہت باطن کی یکسانیت پر دلالت نہیں کرتی۔ دشمن اپنے ظلم کے تحفظ کے لیے ان وسائل کو استعمال کرتا ہے، جبکہ ایک اسلامی قیادت انہیں عدل کے قیام اور ظلم کے خاتمے کے لیے بروئے کار لاتی ہے۔ یہ وہ بنیادی فرق ہے جو کربلا اور شام کی فوجی کارروائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔ اگر ہم محض تکنیکی یا منظم جنگی حکمت عملی کو دیکھ کر دونوں کو

ایک ہی صف میں کھڑا کریں تو ہم حقیقتِ عدل و ظلم، حق و باطل اور مقصد و وسیلہ کی تمیز کو مکمل طور پر ختم کر دیتے ہیں۔

طاقت کا استعمال کب نیہلزم میں بدلتا ہے؟ تب جب اس کے پیچھے کوئی اخلاقی اور مقصدی اساس باقی نہ رہے۔ جب طاقت کا استعمال صرف غلبے، دولت، لذت یا بقاء کے لیے کیا جائے تو وہ نیہلزم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مگر جب طاقت خدا کی حاکمیت کے تحت، عدل کے قیام کے لیے، اور مظلومین کی آزادی کے لیے استعمال ہو تو وہ نہ صرف نیہلزم سے دور ہوتی ہے بلکہ توحیدی تحریک کا عین حصہ بن جاتی ہے۔ اسلامی قیادت جب دشمن سے لڑتی ہے تو اس کا مقصد دشمن جیسا بننا نہیں بلکہ دشمن کے ظلم کو توڑنا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ دشمن کی ظاہری ساخت کو اگر کہیں اپناتی بھی ہے تو اس کے ساتھ وہ ایک باطنی الٰہی روح رکھتی ہے جو اسے مکمل طور پر مختلف، منفرد اور برتر بنا دیتی ہے۔

مظلوم اقوام کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اگر وہ صرف نعرے بازی، جذباتی احتجاج اور غیر منظم جدوجہد سے آگے نہ بڑھیں تو ان کا انجام استعماری چکی میں پس کر رہ جانا ہوتا ہے۔ عدل کی حفاظت کے لیے ایک منظم نظام، ایک بصیر قیادت، اور ایک طاقتور دفاعی ڈھانچہ ناگزیر ہے۔ اسلامی نظامِ ولایت فقیہ نے اس حقیقت کو نہ صرف سمجھا بلکہ عملی طور پر مجسم کر کے دکھایا کہ کیسے طاقت کو انسانیت کے نفع کے لیے، امت کے دفاع کے لیے، اور عدل کے نفاذ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام نے ثابت کیا کہ اگر قیادت صالح ہو، نظریہ توحیدی ہو، اور عوام مخلص ہوں تو طاقت کے میدان میں اُترنا صرف مجبوری نہیں بلکہ عین فریضہ اور عبادت بن جاتا ہے۔

لہٰذا جب اسلامی نظام اپنے وجود اور اپنے دائرہ اثر کو برقرار رکھنے کے لیے جنگی حکمت عملیاں اپناتا ہے تو وہ دشمن جیسا نہیں ہو جاتا، بلکہ دشمن کے ہتھیار کو اس کے خلاف استعمال کرتا ہے — مقصد، نیت، اور معیارِ حق و باطل کو الگ رکھ کر۔ یہی وہ امتیاز ہے جو ظاہری مشابہت کے باوجود حق و باطل کے درمیان حتمی فرق کو باقی رکھتا ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جسے ہر صاحبِ شعور کو سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر ہم یہ فرق مٹا دیں تو پھر ظالم اور مظلوم کی تعریف، جبر اور دفاع کی شناخت، اور حق و باطل کی بنیاد ہی تحلیل ہو جائے گی — اور یہی دراصل دشمن چاہتا ہے۔

وسیلہ اور ہدف کا فرق انسان کی فکری، روحانی اور عملی زندگی کی بنیاد ہے، جسے نظر انداز کرنا گمراہی اور ضیاعِ مقصد کا سبب بن سکتا ہے۔ جب انسان کسی شے کو اس کے اصل مقام پر رکھتا ہے، یعنی وسیلے کو راستہ اور ہدف کو منزل سمجھتا ہے، تو اس کی نیت، فکر اور عمل میں توازن اور اخلاص پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی نظامِ ولایت فقیہ اسی اصول پر قائم ہے کہ طاقت، علم، سیاست اور تنظیم سب اللہ کی رضا، عدل کے قیام، اور مظلوم کی نصرت کے لیے وسیلہ ہیں نہ کہ خود ہدف۔ اگرچہ ظاہری حکمت عملیاں دشمن سے مشابہ ہو سکتی ہیں، مگر نیت، نظریہ، اور اخلاقی بنیاد اسے دشمن سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہی شعور ہمیں حق و باطل، جبر و عدل، اور شیطانی و الٰہی قیادت میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔

خامیوں (Loopholes) کی پرکھ

زندگی کے ہر شعبے میں، چاہے وہ قانون ہو یا اخلاق، دین ہو یا دنیا، تعلیم ہو یا تجارت، ہمیں ایسے مقامات ضرور ملتے ہیں جہاں اصول تو موجود ہوتے ہیں، مگر ان کے اطلاق میں ایسی خامیاں رہ جاتی ہیں جنہیں لوگ اپنے فائدے کے لیے استعمال کر لیتے ہیں۔ انہی خامیوں کو عمومی زبان میں "خامیاں (Loopholes)" کہا جاتا ہے۔

خامیاں (Loopholes) دراصل کسی نظام، قانون یا اصول میں وہ رخنہ یا خلا ہوتا ہے جو بظاہر ضوابط کی خلاف ورزی کیے بغیر کسی کو اس کے مقصد سے منحرف ہونے کا موقع دے دیتا ہے۔ گویا قانون کا لباس پہن کر قانون کو چکمہ دیا جاتا ہے۔

خامیاں (Loopholes) کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے ہم فرض کریں کہ کسی کالج میں یہ اصول ہے کہ "ہر وہ طالبعلم جو 75 فیصد حاضری مکمل کرے گا، وہ امتحان میں بیٹھنے کا اہل ہو گا"۔ اب ایک طالبعلم ہے جو ہر دن صرف پہلے پانچ منٹ آکر دستخط کرتا ہے اور پھر کلاس سے چلا جاتا ہے۔ قانونی طور پر وہ حاضر شمار ہوتا ہے، مگر حقیقت میں اس نے کلاس کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس نے اصول کی روح کو پامال کر کے محض ظاہری خانہ پوری کی۔ یہ ایک تعلیمی خامیاں (Loopholes) ہے، جس کا فائدہ چالاکی یا چال سے اٹھایا گیا ہے۔

اسی طرح ٹیکس کے نظام کو لے لیجیے۔ ایک تاجر بظاہر اپنی آمدنی کو کم ظاہر کرتا ہے، یا مختلف کمپنیوں کے درمیان مالیاتی لین دین کو اس طرح دکھاتا ہے کہ ٹیکس کی اصل مقدار سے بچ

جائے۔ وہ قانون توڑتا نہیں، بلکہ اس کے اندر چھپی ایسی شقوں سے فائدہ اٹھاتا ہے جن کا مقصد ٹیکس چوری نہیں تھا، مگر جنہیں تفصیل سے نہ لکھنے یا عام مفہوم پر چھوڑنے کی وجہ سے گریز گاہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ مالیاتی خامیاں (Loopholes) ہے جو اکثر کرپشن، منی لانڈرنگ، اور بدعنوانی کو قانونی پردہ فراہم کرتا ہے۔
دینی معاملات میں بھی خامیاں (Loopholes) کی شکلیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی شخص سودی بینک سے قرض لیتا ہے اور پھر اسے کسی فریب یا فتوے کے ذریعے "قرضِ حسنہ" کا نام دے کر شرعی جواز فراہم کرتا ہے۔ بظاہر اسے لگتا ہے کہ اس نے حرام سے بچنے کا راستہ نکال لیا، مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے دین کے مقصدِ شریعت کو پامال کیا اور ظاہری شکل سے دھوکہ دیا۔ یہی خامیاں (Loopholes) فکری انحرافات کو جنم دیتا ہے، اور شریعت کو محض الفاظ اور اصطلاحات کا کھیل بنا دیتا ہے۔
اخلاقی زندگی میں بھی یہی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ کوئی ملازم اپنے دفتر کے اوقاتِ کار کے دوران دفتر میں موجود تو ہوتا ہے، مگر سستی، موبائل، چائے، اور غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کرتا ہے۔ وہ حاضری کے اصول کی خلاف ورزی نہیں کرتا، مگر ذمہ داری اور دیانت کی روح سے کوسوں دور ہے۔ اس نے نظام کی کمزوری کو اپنی بے عملی کے لیے استعمال کیا۔ یہ بھی ایک اخلاقی خامیاں (Loopholes) ہے۔
خامیاں (Loopholes) کو پرکھنے کا اصل پیمانہ وہی ہوتا ہے جو انسان کے اندر ضمیر، بصیرت، اور مقصد شناسی کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ محض قانون کے الفاظ پر تکیہ کرنا کافی نہیں ہوتا، بلکہ نیت، نتیجہ، اور روحِ قانون کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ جو شخص کسی اصول کے الفاظ کو بنیاد بنا کر اس کے مقصد سے منحرف ہوتا ہے، وہ بظاہر قانون کی خلاف

ورزی نہیں کرتا، مگر باطن میں خیانت اور فریب کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے دین اسلام نے محض عمل کے ظاہری پہلو کو نہیں بلکہ نیت اور اخلاص کو بھی بنیادی درجہ دیا ہے۔

پرکھنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ کسی اصول کو اس کے مقصد کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے۔ اگر کسی کا عمل اس مقصد کو نقصان پہنچا رہا ہے، تو سمجھ لیجیے کہ وہ شخص خامیاں (Loopholes) کا استعمال کر رہا ہے۔ مثلاً اگر کسی تعلیمی ادارے کا مقصد علم دینا ہے، اور کوئی طالبعلم محض نمبر لینے کے لیے کتابوں کو رٹ کر امتحان میں پاس ہو جاتا ہے، تو اس نے علم حاصل کرنے کے مقصد کو فوت کر کے نظام کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح اگر کوئی سیاسی لیڈر جمہوریت کے نام پر اقتدار میں آکر آمریت قائم کرتا ہے، تو وہ سیاسی نظام کے خامیاں (Loopholes) سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر نظام کو مسلسل نظرِ ثانی اور فکری تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ اس کے اندر پائے جانے والے خامیاں (Loopholes) کی نشاندہی ہو، اور انہیں بند کرنے کے لیے اصلاحات، بیداری، اور اخلاقی تربیت کو ترجیح دی جائے۔ صرف قانونی شقیں کافی نہیں، اگر افراد میں ایمانداری، امانت، اور مقصد کی سچائی نہ ہو۔ اسلامی فقہ میں اس پہلو پر خاص توجہ دی گئی ہے، جہاں نہ صرف الفاظ بلکہ نیت، مصلحت، اور مقاصدِ شریعت کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک عادل نظام وہی ہے جو صرف قانونی جواز پر نہیں بلکہ اخلاقی و معنوی درستگی پر قائم ہو۔

لہٰذا خامیاں (Loopholes) صرف قانونی اصطلاح نہیں بلکہ انسانی رویوں، نیتوں، اور طرزِ فکر میں چھپے اس خلا کا نام ہے جو اصولوں کی کمزوریوں کو ڈھونڈ کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے تنقیدی شعور، مقصد شناسی، اخلاقی تربیت، اور دینی و فکری بیداری

ضروری ہے۔ ورنہ بظاہر قانون، عبادت، تعلیم، یا ترقی کا لبادہ اوڑھ کر بھی انسان گمراہی اور خیانت کے گڑھے میں گر سکتا ہے۔ اور یہی وہ خطرہ ہے جس سے صرف سمجھدار نہیں بلکہ با اخلاق انسان ہی بچ سکتا ہے۔

شیعہ مدارس کی خامیاں

شیعہ مدارس اور تعلیمات، اپنی اصل اور روح کے اعتبار سے ایک مکمل، جامع، اور عارفانہ نظامِ تربیت وہدایت ہیں۔ ان کی بنیاد قرآن، سیرتِ رسولؐ، اور اہل بیتؑ کی نورانی تعلیمات پر استوار ہے، جن کا مقصد محض علم دینا نہیں بلکہ انسان کو عبدِ صالح، مبلغِ حق، اور ولیِ خدا کی راہ میں فانی بنانے کے لیے تیار کرنا ہے۔ مگر افسوس کہ جیسے ہر بلند وبالا نظریہ یا نظامِ فکر جب عملی میدان میں آتا ہے، تو اس کے اندر کچھ خامیاں یا "loopholes" پیدا ہو جاتی ہیں، ویسے ہی شیعہ مدارس کے نظام میں بھی کچھ ایسے رخنے موجود ہیں جن سے گزر کر بعض افراد بظاہر عالم، فاضل، اور مولوی تو بن جاتے ہیں، مگر روحِ دین، تقویٰ، صداقت اور زہد و اخلاص سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے جہاں دین ایک پیشہ بن جاتا ہے، منبر ایک ذریعہ معاش، اور علم ایک سماجی مقام کا ہتھیار۔ ان کمزوریوں کی شناخت اور تجزیہ نہایت اہم ہے تاکہ اصل مقصد —یعنی امت کی ہدایت اور امامِ وقتؑ کی نصرت — کہیں حاشیے میں نہ چلا جائے۔

سب سے پہلا لوف ہول نیت اور مقصدیت کی کمزوری ہے۔ جب طالب علم حوزہ میں آتا ہے تو اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ کیا وہ دین کا خادم بننے آیا ہے، یا خاندان، سوسائٹی، یا ثقافتی دباؤ کے تحت ایک "مولوی" بننے؟ اگر آغاز ہی میں مقصد خالص نہ ہو، تو جتنی بھی دینی تعلیم حاصل ہو، وہ فقط الفاظ کی حد تک رہ جاتی ہے، دل پر اثر نہیں ڈالتی۔ علم نور ہے،

مگر جب اس کے پیچھے نیت دنیاوی ہو، تو یہی نور انسان کے دل کو اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معصومؑ نے فرمایا کہ جس نے دین کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنایا، اس کی آخرت برباد ہے۔

دوسری بڑی خامی نظامِ تعلیم کی فکری و عملی ترتیب میں پائی جاتی ہے۔ اگرچہ درسی کتابیں اعلیٰ علمی سرمایہ رکھتی ہیں، مگر ان کی تدریس، تربیت، اور تطبیق میں وہ جامعیت، روحانیت، اور عصرِ حاضر کی تنقیدی شعور کی تربیت بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ بہت سے مدارس میں نصاب محض فقہ و اصول تک محدود ہے، اور وہ بھی ایسی شکل میں کہ اس کا مقصد مجتہد سازی نہیں بلکہ محض متون کی تکرار ہو جاتا ہے۔ نہ کربلا کی روح سکھائی جاتی ہے، نہ امام زمانہؑ کے ظہور کی تیاری، نہ عرفانِ نفس کی تربیت، نہ سماجی جدوجہد کی بصیرت۔ نتیجتاً طالب علم ایک مخصوص دائرے میں محدود ہو جاتا ہے، جو اسے نہ عصر سے جوڑتا ہے نہ امت کے دکھ درد سے۔ وہ فتوے تو دے سکتا ہے، مگر امت کے زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکتا۔

ایک اور بڑا الوف ہول یہ ہے کہ حوزہ کا ماحول بعض اوقات روحانی کے بجائے رسمی بن جاتا ہے۔ لباسِ روحانیت، عمامہ، ٹوپی، عمامہ بندی کی تقریبات، درس کے درجات، القاب، اور علمی القاب — یہ سب اپنی جگہ اہم ہیں، مگر جب ان علامات کو مقصد بنا دیا جائے، تو پھر ظاہر کی پوجا شروع ہو جاتی ہے اور باطن بھلا دیا جاتا ہے۔ طالب علم جب یہ دیکھتا ہے کہ جو جتنا مشہور، فصیح، خطیب، یا مقبول ہے، وہی معاشرتی مقام رکھتا ہے، تو وہ علم و تقویٰ کے بجائے شہرت و پذیرائی کے پیچھے بھاگنے لگتا ہے۔ اس ماحول میں ریا، خود نمائی، اور روحانیت کی کھوکھلی نمائشی شکلیں پنپتی ہیں۔

اسی طرح حوزہ میں اکثر طلبہ کو معاشی دباؤ، روزگار کی غیر یقینی کیفیت، اور شادی و گھریلو زندگی کے تقاضوں کا سامنا ہوتا ہے۔ چونکہ نظام میں ان کے لیے مکمل و متوازن تربیت، رہنمائی یا سہارا موجود نہیں، اس لیے وہ یا تو فرار اختیار کرتے ہیں، یا پھر علم کو ذریعۂ معاش بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب دین کمانے کا ذریعہ بن جائے، تو پھر منبر پر وہ بات کہی جاتی ہے جو سننے والے کو خوش کرے، وہ مداحی کی جاتی ہے جو مالی فائدہ دے، اور وہ جلسے پسند کیے جاتے ہیں جن میں زیادہ نذرانہ ہو۔ یوں دین کی تبلیغ ایک "مارکیٹ" کا روپ دھار لیتی ہے، اور مولوی اس مارکیٹ کا "برانڈ" بننے لگتا ہے۔

مزید یہ کہ بعض مدارس میں استاد اور شاگرد کے درمیان تعلق محض درس و کتاب کی حد تک محدود ہو گیا ہے۔ جب استاد خود روحانی نہ ہو، مجاہد نہ ہو، زمانے شناس نہ ہو، تو وہ شاگرد کو صرف الفاظ اور حفظیات سکھاتا ہے، وہ باطنی تربیت، محاسبۂ نفس، جہادِ اکبر، اور امامِ وقتؑ کے لیے عملی تیاری کا تصور نہیں دے سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم عالم بن کر بھی فقط مقلد رہ جاتا ہے، قائد نہیں بنتا، سامع بن جاتا ہے، مبلغ نہیں۔

یہ سب لوف ہولز — مقصدیت کی کمی، نصاب کی سطحیت، ماحول کی نمائشی شکل، معاشی دباؤ، تربیت کی کمی — مل کر اس سانچے کو تشکیل دیتے ہیں جس میں مولوی تو پیدا ہوتا ہے، مگر ہادی، راہبر، اور نائبِ امام نہیں نکلتا۔ وہ کبھی مسجد کے خطیب کی حد تک محدود رہتا ہے، کبھی کسی منبر پر مداح کی صورت میں، اور کبھی کسی جلسے یا تنظیم کے نمائندے کی حیثیت سے۔ مگر کربلائی بصیرت، مہدیؑ کے انتظار کا شعور، باطنی جہاد، اور ملت کی قیادت جیسے عظیم اہداف اس کی زندگی سے غائب رہتے ہیں۔

دینِ شیعہ ایک زندہ، مجاہد، اور ولایتِ علوی کا علمبردار دین ہے، مگر اگر اس کے مدارس فقط القاب اور درجات کے نظام تک محدود ہو جائیں، اور مولوی بننے کا مطلب فقط منبر پر بولنا یا مساجد کی امامت رہ جائے، تو ہم نے حقیقت میں دین کے قالب کو باقی رکھا ہے مگر اس کی روح کو دفن کر دیا ہے۔ یہی وہ بنیادی خطرہ ہے جو اس وقت شیعہ مدارس کو درپیش ہے۔ اس خطرے سے بچاؤ تبھی ممکن ہے جب حوزہ علمیہ دوبارہ تربیتِ ولیِ خدا، نصرتِ امامؑ، تقویٰ، جہاد، اور سماجی تبدیلی کے شعور کو اپنا بنیادی مشن بنائے، ورنہ لوگ مولوی تو بنتے رہیں گے، مگر وہ دین جو زہرا سلام اللہ علیہا کے اشکوں اور حسینؑ کے خون سے زندہ ہوا، وہ فقط کتابوں تک محدود ہو کر رہ جائے گا۔

انسان کی باطنی کمزوریاں اور ممکنہ علاج

انسان کی فطرت میں ایک طرف کمال تک پہنچنے کی صلاحیت رکھی گئی ہے، تو دوسری طرف اس میں ایسے رخنے، کمزوریاں اور خامیاں بھی موجود ہیں جو اگر بروقت نہ پہچانی جائیں، نہ سنواری جائیں تو یہی انسان اپنے وجود اور اپنی اجتماعی دنیا کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ قرآن مجید اور تعلیماتِ اہل بیت علیہم السلام جب "انسانِ کامل" کی بات کرتے ہیں تو وہ کسی افسانوی، مافوق الفطرت شخصیت کی تصویر کشی نہیں کرتے بلکہ اس فطری انسانی ساخت کو سامنے رکھتے ہیں جسے تربیت، مجاہدہ اور علم و حکمت کے ذریعے اپنے کمال کی طرف بڑھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ "انسانِ کامل" کا تصور بذاتِ خود ان تمام loopholes کے ادراک، اصلاح اور تہذیب پر مبنی ہے جو ایک ناقص انسان کو خطرہ بنا دیتے ہیں، چاہے وہ خود کے لیے ہو یا معاشرے کے لیے۔

سب سے پہلا رخنہ جس سے قرآن نے بار بار خبردار کیا ہے، وہ "نفس کا دھوکہ" ہے۔ ﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَـٰهَهُ هَوَاهُ﴾ (جاثیہ: 23)۔ یہ آیت اس فرد کی تصویر پیش کرتی ہے جو اپنی خواہشات کا غلام بن چکا ہے، حتیٰ کہ اس نے اپنی "ہوا" کو ہی معبود بنا لیا ہے۔ نفس پرستی وہ بنیادی رخنہ ہے جس سے بدقماش افراد فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب انسان اپنی خواہشات کو بغیر تزکیہ اور بغیر عقلِ سلیم کے مان لیتا ہے تو وہ ان طاقتوں کے لیے آسان شکار

بن جاتا ہے جو اسی خواہش پرستی کو بھڑکانے کے لیے دنیاوی لالچ، شہرت، طاقت یا خواہشِ اقتدار جیسے حربے استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا بڑا رخنہ "جہالت" ہے، جس کا ذکر قرآن اور روایات میں صرف علم نہ ہونے کے معنی میں نہیں بلکہ بصیرت نہ ہونے، حق و باطل میں فرق نہ کر پانے اور رُخِ ہدایت کو پہچاننے میں ناکامی کے طور پر کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾۔ امام علیؑ کا فرمان ہے کہ "جہالت موت سے بدتر ہے، کیونکہ جہالت انسان کو زندہ لاش بنا دیتی ہے۔" بدقماش گروہ عموماً انسان کی اسی نادانی کا فائدہ اٹھا کر اسے گمراہ کن افکار، نظریات اور تحریکات کا حصہ بنالیتے ہیں۔ آج سوشل میڈیا سے لے کر عالمی بیانیے تک، اس جہالت کو استعمال کر کے انسانوں کی رائے، ایمان اور رویوں کو تبدیل کیا جا رہا ہے۔

تیسرا رخنہ "احساسِ کمتری" اور "تشخص کی محرومی" ہے۔ جو انسان اپنے مقام و مرتبے، فطری کرامت، اور اصل شناخت کو نہ پہچان سکے، وہ کسی بھی فریب میں آسکتا ہے۔ قرآن نے انسان کی عزت کو "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" کے ذریعے بیان کیا ہے، مگر جب انسان اس کرامت کو بھلا دیتا ہے تو وہ دوسروں کی چمک دمک، ٹیکنالوجی، ثقافت یا طاقت کے سامنے جھکنے لگتا ہے۔ یہ جھکاؤ کبھی "ثقافتی غلامی" کی صورت میں ہوتا ہے، کبھی "سیاسی مرعوبیت" اور کبھی "اخلاقی زوال" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب انسان کا ذہن دوسروں کے لیے ایک فارغ میدان بن جاتا ہے جس میں وہ اپنی مرضی کے افکار بو دیتے ہیں۔

چوتھا خطرناک رخنہ "معاشرتی تنہائی" یا "روحانی خلا" ہے۔ انسان ایک سماجی اور روحانی وجود ہے۔ اگر اس کے گرد مضبوط خاندانی نظام، دینی رشتہ داری، معنوی رفاقت اور فکری تحفظ نہ ہو تو وہ شدید تنہائی، اضطراب اور مقصدیت کے بحران میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں وہ افراد، گروہ یا تنظیمیں جو اسے مصنوعی تعلقات، جعلی مقصد یا وقتی راحت فراہم کرتے ہیں، اس کے وجود پر قبضہ جما لیتے ہیں۔ اہل بیتؑ نے بارہا فرمایا کہ انسان کو ایسی مجلسوں، تعلقات اور فکری دائرے میں رہنا چاہیے جہاں روحانی رشد، فکری تنویر اور دینی شعور موجود ہو۔ اگر یہ فضا نہ ہو تو انسان اپنی روح کو کسی بھی ٹیکنالوجیکل سراب، ورچوئل گروہ یا آئیڈیل میں کھو بیٹھتا ہے۔

پانچواں رخنہ "ری ایکٹیو شخصیت" ہے، یعنی وہ انسان جو سوچنے، سمجھنے اور تحمل سے فیصلہ کرنے کی بجائے محض ردعمل کی بنیاد پر چلتا ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ جذبات کی رو میں بہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہی وہ رخنہ ہے جہاں پروپیگنڈہ، سنسنی خیزی، افواہیں اور فکری دہشتگردی کام آتی ہے۔ قرآن اور اہل بیتؑ کی تعلیمات نے ہمیشہ صبر، تدبر، حلم، تفکر، اور تسلیم ورضا کی تلقین کی ہے تاکہ انسان جذبات کی رو میں نہ بہے بلکہ فہم و حکمت کی روشنی میں خود کو سنبھال سکے۔

چھٹا رخنہ شہرت کی اشتہا انسان کے باطن میں ایسا رخنہ ہے جو اُسے ظاہر پرستی، خودنمائی اور نفس کی تسکین کے فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ اشتہا دراصل انسان کے اندر موجود اس کمی کا اظہار ہے جسے وہ دوسروں کی توجہ، داد اور پہچان سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی شہرت طلبی اُسے اپنی اصل شناخت یعنی عبدیتِ خالص اور خلیفۃ اللہ کے مقام سے دور کر کے مخلوق کی نظر میں معتبر بننے کی دوڑ میں لگا دیتی ہے۔ قرآن اور اہل بیتؑ کی تعلیمات

ہمیں اس باطنی خطرے سے خبردار کرتی ہیں، کیونکہ شہرت جب نفس کے ہاتھوں میں آ جائے تو وہ انسان کو ریا، فریب، تکبر اور حق پوشی کی جانب کھینچتی ہے، حتیٰ کہ وہ اپنے وجود کی تمام معنویت کو دوسروں کے تاثر سے وابستہ کر دیتا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں انسان دوسروں کی تالیوں کا اسیر بن کر اپنی حقیقت سے کٹ جاتا ہے۔

ان تمام رخنوں کے مقابلے میں تعلیماتِ قرآن و اہل بیتؑ کا کامل انسان ایک ایسا وجود ہے جو تزکیہ نفس سے گزر چکا ہوتا ہے، جس کی عقل تربیت یافتہ، روح بیدار، شعور زندہ، تعلقات متوازن، اور افکار منظم ہوتے ہیں۔ وہ نہ خواہش کا غلام ہوتا ہے، نہ جہالت کا شکار، نہ مرعوبیت میں مبتلا، نہ تنہائی میں گم اور نہ جذبات کی رو میں بہنے والا۔ بلکہ وہ ایک فاعل، باوقار، باہوش، خداشناس اور خودشناس انسان ہوتا ہے۔ وہ خود کو بیچتا نہیں، بلکہ اپنے ہونے کی قیمت خدا سے لیتا ہے۔ یہی انسان بدقماش افراد کے لیے قابلِ استعمال نہیں بنتا بلکہ ان کے چالوں کو پہچان کر مزاحمت کی قوت بن جاتا ہے۔

لہٰذا، انسان میں موجود یہ نفسیاتی و اخلاقی رخنے نہ صرف فرد کی اپنی تباہی کا سبب بن سکتے ہیں بلکہ وہ سماج، ثقافت، اور حتیٰ کہ دین کے اجتماعی نظام پر بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں، اگر بروقت تعلیم، تربیت، تہذیب اور بصیرت کے ذریعے ان کی اصلاح نہ کی جائے۔ انسانِ کامل کا تصور ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کمال صرف فرد کی نجات کا راستہ نہیں بلکہ سماجی تحفظ اور تہذیبی بقاء کی بھی ضمانت ہے۔

ورچوئل رئیلٹی میں خودی کی گمشدگی کا علاج

جدید ٹیکنالوجی کی فطرت، انسان کی نفسیاتی ساخت، اور معاشرتی شعور کے درمیان تعلق ایک ایسا گہرا مسئلہ ہے جسے نظر انداز کرنا ہماری تہذیبی اور فکری خودکشی کے مترادف ہو سکتا ہے۔ آج انسان جن آلات کا استعمال کر رہا ہے، وہ محض مددگار ذرائع یا سہولیات فراہم کرنے والے اوزار نہیں رہے بلکہ خود ایک ایسی وجودی حقیقت بن چکے ہیں جنہوں نے انسانی "فاعل" کی حیثیت کو متزلزل کر کے رکھ دیا ہے۔ ماضی میں انسان آلات پر حاکم تھا، ان کے ذریعے فطرت سے ہم آہنگی کے ساتھ اپنی ضروریات پوری کرتا تھا، لیکن آج کا انسان آلات کے تابع بن چکا ہے۔ وہ ان کے ذریعے نہیں بلکہ ان کے زیر اثر سوچتا، محسوس کرتا اور تعلقات قائم کرتا ہے۔

جدید نفسیات اور سماجی نفسیات یہ تسلیم کرتی ہے کہ انسان کا شعور، اس کا خودی کا احساس، اور اس کی تعلقات سازی کی صلاحیت اس کے ماحول اور استعمال شدہ آلات سے شدید طور پر متاثر ہوتی ہے۔ جب بچے پیدائش سے ہی ڈیجیٹل اسکرینز کے ساتھ جڑ جاتے ہیں، جب رشتے مجازی رابطوں اور آڈیو ویژوئل تاثرات پر منحصر ہو جاتے ہیں، جب کھیل حقیقی میدان سے نکل کر ڈیجیٹل کرداروں کی بقاء کی جنگ میں تبدیل ہو جائے، تو انسان کا "میں" اپنی جسمانی اور روحانی مرکزیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس صورتحال میں انسانی نفسیات میں "Displacement of self" پیدا ہوتا ہے، جہاں ایک فرد اپنا آپ، اپنی شناخت، اور

اپنے جذبات کو کسی بیرونی، غیر حقیقی، لیکن جذباتی طور پر وابستہ "اوتار" میں دیکھنے لگتا ہے۔ یہ اوتار صرف ویڈیو گیمز، سوشل میڈیا پروفائلز یا ورچوئل ریئلٹی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ آہستہ آہستہ روزمرہ کے فیصلوں، تعلقات اور احساسات کو بھی قابو میں لینے لگتا ہے۔
سماجی نفسیات کے مطابق، فرد کی شناخت اور اس کی سماجی فاعلیت کا زیادہ تر انحصار اس کے سوشل کنٹیکسٹ اور میڈیم آف ریلیشن پر ہوتا ہے۔ جب ان میڈیمز کو جدید سرمایہ دارانہ، انسان مرکز نظام نے قبضے میں لے لیا ہو، جہاں ہر تعلق، ہر جذبہ، ہر رویہ کسی نہ کسی ڈیجیٹل اور مصنوعی ساخت سے مشروط ہو، تو انسان نہ صرف اپنے ار دگرد کی دنیا کو مصنوعی طریقے سے دیکھنے لگتا ہے بلکہ وہ خود بھی اپنے اندر ایک مجازی حقیقت قائم کرلیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر خطرناک حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھی اس مصنوعی معیارات پر جانچنے لگتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ خود اپنے شعور سے اجنبی ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے، محسوس کرتا ہے اور فیصلے کرتا ہے، لیکن وہ یہ سب ایک ایسے شعور کے ذریعے کرتا ہے جو اس کا اپنا نہیں، بلکہ ٹیکنالوجی کے متعین کردہ سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے۔
اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا جدید ٹیکنالوجی محض آلات کا مجموعہ ہے یا یہ ایک تہذیبی ایجنڈے کی تجسیم ہے؟ نفسیاتی تحقیق بتاتی ہے کہ ہر آلہ جس کے ساتھ انسان کا طویل اور گہرا تعامل ہو، انسان کی شخصیت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ آلہ کسی خاص تصورِ انسان، تصورِ فطرت، اور تصورِ کائنات کے زیر اثر تخلیق ہوا ہو، تو وہ خود بھی ان تصورات کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا بنیادی سانچہ anthropocentric یعنی انسان مرکز اور utilitarian یعنی نفع بخش استعمال پر مبنی ہے۔ اس میں فطرت کو مردہ، خام اور بے جان مادہ سمجھ کر انسان کی خواہشات کے تابع کر دیا گیا ہے۔ اس تصور میں

روحانیت، تعلق، اور فطرت کی معنویت کا کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ ایسے آلات نہ صرف انسان کی دنیا کو بلکہ اس کی داخلی دنیا کو بھی ایک ایسے ورچوئل اور ہائپر-ریئل ماحول میں لے جاتے ہیں، جہاں حقائق، احساسات اور معانی سب کچھ ضم ہو جاتا ہے۔

اس پس منظر میں یہ کہنا کہ ٹیکنالوجی نیوٹرل ہے، محض ایک سادہ لوحی ہے۔ جو ٹیکنالوجی انسانی احساس کو simulate کرتی ہے، جو رشتے create کرتی ہے، جو کرداروں میں خودی کا انعکاس پیدا کرتی ہے، وہ نیوٹرل نہیں رہتی۔ وہ ایک تہذیبی مظہر بن جاتی ہے، اور انسان کو ایک نئی شناخت دیتی ہے۔ انسان جو کبھی زمین، آسمان، ہوا، پانی، خاندانی بندھن، محنت، دعا، اور سجدے سے جڑا ہوا تھا، آج وہ گرافکس، نوٹیفکیشن، اور لائکس کے جال میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا شعور، اس کی جمالیات، اور اس کی اخلاقیات تک virtual اور functional بن چکی ہے۔

اب اگر اس تبدیلی کو صرف خارجی سطح پر تنقید کر کے چھوڑ دیا جائے، تو یہ محض جذباتی ردعمل ہو گا۔ ہمیں اس ٹیکنالوجی کی ontological یعنی وجودی سطح کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ ہم واجب الوجود اور ممکن الوجود کے درمیان رشتہ طے کرتے ہیں، ہمیں ورچوئل وجود کی نوعیت، اس کی حیثیت اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کا فلسفیانہ و عرفانی تعین بھی کرنا ہو گا۔ یہ طے کرنا ہو گا کہ یہ نئی دنیا ہماری روح، ہمارے دل، اور ہماری اجتماعی عقل کو کس طرح متاثر کر رہی ہے، اور اس کا حل کیا ہمارے مابعد الطبیعیاتی اصولوں، روحانی تربیت اور تہذیبی خودی کے احیاء کے بغیر ممکن ہے؟ اگر ہم نے ان آلات کو صرف استعمال کے اوزار سمجھ کر قبول کیا، تو یہ جلد یا بدیر ہمارے اخلاق، عقیدہ، روحانیت، اور انسانیت کو ایک ایسی نئی دنیا میں ضم کر دیں گے جہاں ہم خود اپنی پہچان کھو بیٹھیں گے۔

وقت آچکا ہے کہ ہم نہ صرف جدید ٹیکنالوجی کے فاعلی کردار پر سوال اٹھائیں بلکہ ایک ایسے متبادل فکری و تہذیبی ماڈل کی تلاش کریں جو انسان کو دوبارہ اپنے باطن، اپنی فطرت، اور اپنے رب سے جوڑ سکے۔ ورنہ ہم سب ایک ایسے سانچے میں ڈھل چکے ہوں گے جس کے خالق ہم نہیں بلکہ وہ مشینیں ہوں گی جنہیں ہم نے بظاہر خود ایجاد کیا تھا۔

اس مسئلے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھیں تا کہ ہم اس مسئلے کو صرف فکری انقباض یا خوف کی صورت نہ سمجھیں بلکہ ایک فعال و تعمیری طریقے سے اس کا سامنا کر سکیں۔

سب سے پہلے اس تصور کی بنیاد پر غور کیا جائے کہ آیا ٹیکنالوجی بذاتِ خود کوئی ایسی قوت ہے جو انسان کو مغلوب اور غیر فاعل بنا دیتی ہے؟ اس کا جواب جدید نفسیات، خاص طور پر سماجی نفسیات اور انسانی فاعلیت (agency) کے نظریات کی روشنی میں تھوڑا مختلف نکلتا ہے۔ انسان کسی بھی شے یا نظام سے اپنی نسبت خود طے کرتا ہے، چاہے وہ عبادت ہو، علم ہو، یا تکنیکی وسائل۔ اگر انسان اپنی فاعلیت کھو رہا ہے تو اس کی وجہ محض ٹیکنالوجی نہیں بلکہ اس کے ساتھ جڑی ہوئی تربیتی، فکری اور تہذیبی کمزوریاں ہیں۔ اگر انسان اپنے فکری زاویے کو بدل کر ٹیکنالوجی کو اپنی خدمت میں لے آئے، جیسا کہ بعض دینی معاشروں میں ہوا، تو یہی ٹیکنالوجی انسان کی معنوی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس لیے اسے محض مغربی تہذیب کی جبری پیداوار سمجھ کر رد کر دینا یا اس پر وجودی اضطراب میں مبتلا ہو جانا ایک یک رُخی تنقید ہو گی۔

یہ دلچسپ نکتہ ہے کہ گھڑے کے پانی پر خدا کا شکر ادا کرنا اور واٹر ڈسپنسر پر انسانی حیرت کا اظہار دراصل اس بات کی غمازی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی نے شکر گزاری کے الوہی رشتے کو انسان کی فنی مہارت سے بدل دیا ہے۔ یہ نکتہ بظاہر درست محسوس ہوتا ہے لیکن اس پر مزید

غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مسئلہ ٹیکنالوجی کا نہیں بلکہ انسان کے شعور، تربیت اور تصورِ نعمت کا ہے۔ اگر انسان کو صحیح تربیت دی جائے کہ وہ ہر وسیلے کو اللہ کی طرف سے نازل کردہ "تسخیر کائنات" کا نتیجہ سمجھے تو واٹر ڈسپنسر بھی اسی طرح توحید کی نشانی بن سکتا ہے جیسے گھڑا تھا۔ یہاں ضرورت فکری تربیت کی ہے، نہ کہ ٹیکنالوجی سے فرار کی۔

اسی طرح، مجازی دنیاؤں (Hyper-reality, Simulated reality) پر جو اعتراض کیا گیا ہے، وہ بھی ایک خاص قسم کی فکری پریشانی کی نمائندگی کرتا ہے جس کا تعلق Baudrillard جیسے فلسفیوں کے نظریات سے ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ویڈیو گیمز، سوشل میڈیا اور مجازی رشتے انسانی شعور کو ایک نئی جہت میں داخل کر چکے ہیں، جہاں حقیقت اور مجاز کے درمیان فرق مدہم ہو چکا ہے۔ لیکن انسانی نفسیات میں ایک اہم صلاحیت self-reflection بھی پائی جاتی ہے جو اسے ان حدود کو پہچاننے اور ان سے آزاد ہونے کی راہ دکھا سکتی ہے۔ اگر بچوں اور نوجوانوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ حقیقی 'میں' اور مجازی کردار میں فرق کیا ہے، تو وہ اپنی فاعلیت برقرار رکھ سکتے ہیں۔

مابعد الطبیعیاتی سطح پر Virtual existence کو واجب، ممکن اور ممتنع جیسے روایتی فلسفیانہ طبقات سے ماورا تسلیم کرنا ایک جراتمندانہ دعویٰ ہے، مگر اسے فلسفیانہ طور پر مضبوط کرنے کے لیے لازم ہے کہ ہم وجود کی تعریف اور اس کے مراتب پر از سرنو غور کریں۔ کلاسیکی اسلامی فلسفہ میں وجود کی تشکیک اور مراتب کا تصور ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم ان نئی "وجودی سطحوں" کو بھی سمجھ سکیں اور ان کے ساتھ اپنا تعلق طے کر سکیں، بشرطیکہ ہم خود کو اس فکر پر آمادہ کریں۔ اگر ہم Virtual یا simulated realities کو واجب یا ممکن کے معیاری خانوں میں فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو شاید ہم ان کی

معنوی پیچیدگی اور اثرات کو نظر انداز کر دیں، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان کے ساتھ ایک غیر مقدس یا غیر متجاوز تعلق قائم کریں تاکہ ان کی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی خود پر ان کا غلبہ نہ آنے دیں۔

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسان کو محض ایک مظلوم فاعل کے طور پر پیش کرنا جو ٹیکنالوجی کے آگے بے بس ہو گیا ہو، نہ تو نفسیاتی لحاظ سے درست ہے اور نہ ہی تاریخی طور پر۔ انسانی تمدن، مذہب، اخلاق، فلسفہ اور عرفان کی طویل روایت نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے ماحول کو معنویت دے سکتا ہے، بشرطیکہ وہ خود اپنے وجود اور مقصدِ حیات سے واقف ہو۔ لہٰذا، جدید ٹیکنالوجی کے بارے میں ایک متوازن، باشعور اور تنقیدی رویہ ہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے ہم اس کے خطرات کو کم کر کے اس کے امکانات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فکری بے چینی کو اصلاحِ فکر اور تربیتِ فاعلیت کی طرف موڑنے کی ضرورت ہے، نہ کہ اسے تقدیری مظلومیت کا عنوان دے کر جمود کا شکار ہونے کی۔

About Author: S. Jahanzaib Abidi is a distinguished author known for his extensive collection of articles covering a wide range of subjects, including philosophy, religion, education, politics, economics, media, and society. His prolific writings showcase a deep understanding and insightful analysis across diverse topics, making him a notable figure in the realm of article series.

With a keen intellect and a penchant for thorough exploration, Abidi's contributions offer readers a nuanced perspective on various issues, establishing him as a respected writer whose work resonates across different spheres of thought and discourse. His thought-provoking articles contribute significantly to the intellectual landscape, fostering a deeper understanding of complex subjects.